کانچ کا مسیحا
محمد فیاض ماہی

پیش لفظ

قارئین کی محبتوں اور چاہتوں کی زنجیر یقیناً طاقتور اور فولادی ہے کہ مجھ جیسے ناتواں اور بے بس کو بار بار آپ کی ادبی عدالت کے علم اور تجربے کے کٹہرے میں کھینچ لاتی ہے۔

''گھنگھرو اور کشکول'' اور ''گیلے پتھر'' کی پذیرائی کے بعد آپ کی پُرخلوص چاہتوں کا جواب دینے کے لیے ''کانچ کا مسیحا'' حاضر خدمت ہے۔

تحریر میں کتنی جان ہے؟ کتنی خوبیاں اور خامیاں ہیں؟ ان کو پرکھنے کے لیے آپ کے پاس جو علم اور تجربے کی کسوٹی ہے۔ اس کی بنیاد پر تحریر کی پرکھ جانچی جا سکتی ہے۔

''گیلے پتھر'' کو آپ کی محبت اور ذوقِ مطالعہ نے جو پذیرائی اور مقام بخشا ہے۔ میرے لیے یقیناً اعزاز ہے۔ ان شاء اللہ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آپ کے ہاتھوں کی زینت بننے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ جو کہ آپ کی حوصلہ افزائی کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔ کیونکہ آپ کے تعریفی اور تنقیدی خطوط نے میرے قلم کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ بکھیرنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔

''کانچ کا مسیحا'' کے متعلق کچھ کہوں گا تو اس کلاسیکل نام کی اہمیت اور افادیت کم ہو جائے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے کتب کے مصنف فلمی مصنف حضرات کی طرح نہیں سوچتے۔ ورنہ یہ بھی نام برادری، ذات اور غنڈوں بدمعاشوں کی ذاتی زندگی کے متعلق ناول لکھ رہے ہوتے اور آج کتب کا وہی ''حشر'' ہوتا جو ہماری فلم انڈسٹری کا ہو رہا ہے۔

یہ ناول محبت کی لازوال داستان پر مبنی ہے۔ امیری اور غریبی دو ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں توازن قائم ہے۔ اللہ کی ذات نے ہر چیز کے جوڑے بنا کر اس توازن کو تا قیامت دائم رہنے کی مہر ثبت کر دی ہے۔ اس کو ختم کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اعتراض کرنا، گلہ کرنا یا پھر اس نظامِ قدرت کو بدلنے کی سوچ رکھنا' قانونِ الٰہی سے ٹکر لینے کے مترادف ہے مگر سرکشی اور غرور تکبر بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کی

ذات کا حصہ بنایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''وہ جسے لمبی عمر دیتا ہے۔ اسے خلقت میں اوندھا کر دیتا ہے''۔ بالکل اسی طرح اپنے فرمان کے مطابق جسے بے انتہا دولت اور جاگیر عطا کرتا ہے اسے غرور و تکبر بھی دے دیتا ہے۔ اس غرور اور تکبر کے مالک جاگیردار اور دولت مند کو ایک دن غریب اور مفلس کے دَر پر جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

''کانچ کا مسیحا'' اس نوجوان کی داستان بھی ہے۔ جو عشقِ الٰہی میں اپنا گھر بار چھوڑ کر پاؤں میں گھنگرو باندھ کر رضائے رب حاصل کرنے کے لئے سڑکوں اور گلیوں میں ناچتا پھرتا ہے۔

''رانی'' ایک ایسا کردار ہے جو ہندو گھرانے سے تعلق کے باوجود اذان کی مقدس و معطر آواز پر اپنا مذہب اور ماں باپ قربان کر دیتی ہے۔ نماز میں سجدۂ عشق کے لیے ظلم و ستم ہنس کر سہہ لیتی ہے۔ مگر یہ اٹل اور انمٹ حقیقت ہے کہ عشق ہی بازی جیتتا آیا ہے اور یہاں بھی فتح و نصرت عشق کا مقدر بنتی ہے۔

اپنوں سے بچھڑنا اور مدتوں بعد ملنا۔ اس کہانی کا خلاصہ ہے۔ مگر مدتوں کے درمیان جو فاصلے زہریلے کانٹوں پر طے کرنے پڑتے ہیں۔ ان کا ازالہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ عشق و محبت کو اس کی معراج تک پہنچانے کے لیے اپنے آپ کو تیاگ کر معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو تماشہ بنانے والوں کا قصہ بھی آپ کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دے گا۔ محبت اک نظر چاہت کی طلب گار ہوتی ہے۔ یہ کب دلوں میں اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ اس کے طریقۂ واردات کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ ایک طرح کا ''گھن'' ہوتا ہے جو اندر ہی اندر سے دل اور جگر کو کھا جاتا ہے۔

''کانچ کا مسیحا'' ایک ایسا محبت بھرا کردار ہے۔ میں جتنی دیر جتنا بھی عرصہ کہانی لکھتا رہا ہوں۔ میں اس کردار کے سحر میں کھویا رہا ہوں۔ ایک جاندار اور قربانی دینے والا مسیحا خود کتنے عذاب اور تکالیف کو جھیل کر مسیحا بنا تھا۔ مگر بے رحم اور تکلیف دہ بیماری...... جیتی یا ہار گئی؟

زندہ مُردوں کی قبروں پر چراغاں کرنے والوں کی غلط فہمیوں کی داستان بھی ایک چونکا دینے والا اور حیرت انگیز قصہ ہے جو کہ اس ناول کا حصہ ہے۔ اس ناول کے سحر میں گم ہو کر اس کا مطالعہ ہی آپ کو لطف اور تحریر کا مزہ دے سکتا ہے۔

میری غلطیوں، خامیوں، جھول اور لچک پر پردہ ڈال کر محترم جناب عبدالغفار صاحب نے جس اعلیٰ ظرفی اور برادرانہ شفقت سے میری بے جان اور بے ضرر تحریر کی نوک پلک سنوار کر اسے ''کانچ کا مسیحا'' بنایا ہے۔ اس کے لیے میں ان کی بے پایاں محبت اور پُر خلوص تعاون کا قرض دار ہوں۔ انہوں نے اپنے علم اور ذاتی تجربے کی بنا پر میری دوسری تحریر اپنے ادارہ کے زیر اہتمام شائع کر کے یقیناً میری عزت اور مان بڑھایا ہے۔ اپنے تجربے اور علم کا پانی دے دے کر میرے علم اور ادبی پودے کو محبت اور خلوص سے پروان چڑھانے میں اس ادارہ کا بہت بڑا کردار ہے۔

میں اپنے حلقہ احباب سے میاں محمد اشرف، شیخ احمد ندیم، شیخ محمد یٰسین اور میاں محمد اعجاز کا مشکور و ممنون ہوں۔ ان کی بے پایاں محبتوں اور چاہتوں کا قرض دار ہوں کیونکہ وہ میری تحاریر کے ساتھ ساتھ مجھے بھی برداشت کر رہے ہیں۔

آپ کی محبتوں بھری تنقیدی آراء کا منتظر رہوں گا۔ امید ہے کہ خط و کتابت کے ذریعے میری اصلاح فرماتے رہیں گے۔

والسلام
مخلص
محمد فیاض ماہی

اچانک کسی گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز سن کر سڑک کے گھنگرو بیچوں بیچ جانے والے فیض نے شدتِ خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خود کو وہیں کھڑا کر لیا جیسا کہ کوئی بت ہو۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی بھی گاڑی اس کو روندتے ہوئے نہیں گزری تو اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور آس پاس سے گزرنے والے لوگوں کو اپنی طرف طنزیہ انداز میں مسکراتا دیکھ کر شرمندہ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سڑک کراس کرتا، غصے بھری سُریلی آواز سنائی دی۔

''جاہل...... دیہاتی...... اگر مرنا ہی ہے تو کسی ٹرین کے آگے کود دو۔ میری گاڑی ہی نظر آتی ہے سب کو مرنے کے لیے۔'' فیض الحسن نے گاڑی والی کی طرف دیکھا اور پھر گاڑی کی طرف دیکھا۔ گاڑی اور اس میں بیٹھی حسینہ دونوں ہی شاندار تھیں۔ جتنی وہ خود حسین تھی گاڑی بھی اتنی پیاری تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے اس کی صراحی دار گردن باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کی زلفیں ہوا سے اُڑ اُڑ کر اس کے چاند سے چہرے پر بکھر رہی تھیں۔ وہ بار بار ایک ہاتھ سے چہرے پر بکھری زلفیں ہٹا رہی تھی۔ فیض الحسن وہیں گم صم ہو کر اسے دیکھنے میں محو تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔

گاڑی کے تیز ہارن نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خفت بھرے انداز میں سر کو جھکا کر سڑک کراس کرنے لگا۔ مگر دل گاڑی کی اگلی سیٹ پر ہی رہ گیا تھا۔

وہ اس حسینہ کو دوبارہ دیکھنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک اور گاڑی کے ٹائر چرچرائے لیکن اس بار غصہ نکالنے والی کوئی حسینہ نہ تھی۔ بلکہ ایک کڑیل جوان تھا۔ جس کی زبان بھی اس کی طرح تلخ اور کڑیل تھی۔ فیض الحسن کو احساس ہوا کہ اس طرح تو وہ سارا دن

سڑک کراس کرنے میں ہی لگا دے گا۔

اس حسینہ کے تصور سے نکل کر ہی سڑک کراس کی جا سکتی تھی۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا سڑک کراس کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

وہ پہلی بار شہر آیا تھا۔ والدین کو دفنانے کے بعد زمیندار نے اس پر احسان کیا تھا کہ وہ اپنے مکان کو تالہ لگا کر چابی اس کے پاس گروی رکھ جائے۔ جب زمیندار کا قرض اتر جائے گا تب آ کر وہ اپنا مکان لے سکتا تھا۔ وہ روتا دھوتا اپنے گاؤں اور مکان کو چھوڑ کر اپنے منہ بولے بھائی منظر علی کی تلاش میں شہر آ گیا تھا۔ منظر علی بھی اس کے گاؤں کا رہنے والا تھا لیکن وہ شہر میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے یہیں شادی بھی کر لی تھی۔ اس کا ایک بارہ سالہ بیٹا بھی تھا۔ جو شہر کے بہترین سکول میں پڑھتا تھا۔ یہ سب باتیں اسے منظر علی تب بتایا کرتا تھا جب وہ کبھی کبھار گاؤں میں اپنے والدین سے ملنے آیا کرتا تھا۔ فیض الحسن کے ساتھ اس کا بچپن گزرا تھا۔ وہ اسے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ فیض الحسن بھی اس کا بڑا خیال کیا کرتا تھا۔ مگر زندگی کی گاڑی اگر ایک ہی جگہ ٹھہر جائے تو غم اور مصائب اس میں گھر کر لیتے ہیں۔ فیض الحسن اور اس کا والد زمیندار کے مقروض تھے۔ وہ تو کبھی بھی گاؤں نہ چھوڑ سکتے تھے۔ جبکہ منظر علی کو ایسی کوئی مجبوری نہ تھی۔ وہ ترقی کرنے کا خواہاں تھا۔ شہر آ کر اس نے خوب ترقی کی تھی وہ کیا دھندہ کرتا تھا۔ گاؤں میں کسی کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ جب بھی گاؤں آتا تھا۔ اس کے کپڑوں اور جوتوں سے لگتا تھا کہ وہ شہر میں کوئی رئیس ہے۔ اس نے متعدد بار فیض الحسن کو کہا تھا کہ وہ شہر میں آ کر نوکری کر لے لیکن وہ والدین کو کس کے سہارے چھوڑ کر آتا۔ اور پھر زمیندار کا قرض بھی بہت تھا۔ بس وہ گاؤں میں ہی زمیندار کی زمینوں پر ٹریکٹر چلاتا رہا۔ اپنا قرض اتارنے کی کوشش میں مصروف رہا۔

پھر زندگی نے پلٹا کھایا چھ ماہ کے وقفہ میں ہی اس کی والدہ اور والد انتقال کر گئے۔ گاؤں والوں نے اس پر ترس کھایا اور مکان کے بدلے اس کی جان کی خلاصی ہوئی تھی۔ اس نے بھی ٹھان لی تھی کہ وہ اپنے پُرکھوں کی اس نشانی کو زمیندار کے ظالمانہ تسلط سے ضرور آزاد کرائے گا۔ تبھی وہ منظر علی کا نام پتا لے کر گھر سے روانہ ہو گیا تھا۔ لیکن جب وہ شہر آ کر بس سے اترا تو اس کی کھوپڑی ہی گھوم کر رہ گئی۔ اتنے سارے لوگ، اتنی گاڑیاں، سکوٹر، سائیکلیں اور پھر شاندار لباس میں ملبوس لڑکیاں اور عورتیں، اس کے تو حقیقت میں چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

''میں بھی کہوں کہ منظر علی سیٹھ کیسے بن گیا؟'' وہ اپنی سوچوں میں غلطاں ایک طرف چل پڑا تھا۔ ''یہ شہری لوگوں کے ٹھاٹھ باٹھ، ان کا خرچہ اور رہن سہن...... یا اللہ تو ہی میری مدد فرما۔'' وہ یہ سوچتا ہوا سڑک کے بالکل درمیان میں آ گیا تھا۔ جبھی ایک بڑی سی گاڑی کے چرچراتے ہوئے ٹائروں اور حسینہ کی دلکش آواز نے اسے آنکھیں کھول کر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔

وہ جس کسی سے بھی منظر علی پتا پوچھتا۔ پہلے تو لوگ اس کی طرف دیکھتے پھر ہنستے ہوئے اسے انکار کر دیتے تھے۔ اس کا حلیہ ہی ایسا تھا۔ سبز رنگ کی لمبی سی قمیص پہنی ہوئی تھی اور گہرے گلابی رنگ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ ساتھ میں ایک کپڑوں کی گٹھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں پرچی تھی جس پر منظر علی کا مکمل پتا لکھا ہوا تھا۔

اللہ کے ایک نیک بندے نے اسے ویگن میں سوار کرایا اور کنڈیکٹر کو سمجھایا کہ اس ''پینڈو'' کو کس سٹاپ پر اتارنا ہے۔ وہ خاموشی سے بیٹھا سفر طے کرتا رہا۔ ایک سٹاپ پر کنڈیکٹر نے اسے اتار دیا اور پرچی سے پڑھ کر اسے سامنے والی گلی میں جانے کا کہہ کر ''چل استاد'' کی آواز لگائی اور ویگن ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''کیسے جاہل لوگ ہیں۔ کبھی اچھا لباس کوئی پہن لے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔'' اس نے ویگن کے جانے کے بعد مسافروں پر غصہ نکالا جو اس کی طرف دیکھ کر زیرلب میں مسکرا رہے تھے۔ خیر وہ پتا پوچھتا ہوا منظر علی کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ مگر یہ کیا؟...... تقریباً تین مرلہ کا مکان تھا، جو باہر سے دو منزلہ نظر آتا تھا۔ اس کے خوبصورت گیٹ پر بڑا سا تالہ لگا ہوا تھا۔ تالا دیکھ کر اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ اس نے صد شکر ادا کیا تھا کہ وہ صحیح ٹھکانے پر پہنچ گیا تھا۔

اس نے آتے جاتے ہوئے راہگیروں سے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ یہی منظر علی کا گھر ہے۔ اب وہ گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے سنگ مرمر کے تھڑے پر بیٹھ گیا تھا۔ ہر آنے والے کی نظر اس کے چہرے کا طواف کرتی ہوئی اس کے لباس پر جاتی تھی اور مسکرائے بنا نہ رہ سکتا تھا۔

ابھی اسے بیٹھے ہوئے پون گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ ایک الہڑ سا لڑکا جس کی عمر تقریباً گیارہ بارہ سال ہوگی وہاں آیا۔ اس کے گلے میں لٹکا ہوا بستہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ سکول سے واپس آیا ہے۔ اس نے حیرت واستعجاب کی ملی جلی کیفیت سے اپنے گھر کے باہر بیٹھے ہوئے ''پینڈو'' کو

دیکھا اور بغیر کسی تاثر کے بستہ سے چابی نکالی اور تالہ کھولنے لگا۔ اس نے سمجھا کہ کوئی راہگیر ہے۔ ستانے کے لیے بیٹھا ہوگا۔ فیض الحسن جان گیا تھا کہ یہ منظر علی کا بیٹا ہے۔ مگر وہ اسے نہ جانتا تھا کیونکہ وہ کبھی بھی منظر علی کے ساتھ گاؤں نہ گیا تھا۔ لڑکا خاموشی سے تالہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ فیض الحسن کو اس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ وہ اسی خفگی کے عالم میں اٹھا اور گیٹ کو اپنے ہاتھ سے بجانے لگا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ وہی لڑکا اندر کی طرف کھڑا تھا۔

''ہاں جی!'' اس نے اب بغور فیض الحسن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''انکل!...... آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''مجھے منظر علی سے ملنا ہے۔'' فیض الحسن نے ڈرتے ڈرتے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

''لیکن ابا کا تو کوئی دوست ایسا نہیں ہے۔'' اس نے نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''کیسا......؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟'' فیض الحسن سٹپٹا گیا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ کوئی بھی پینڈو ابا کا دوست نہیں ہے۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔''

وہ دس بارہ سالہ لڑکا گیٹ بند کرنے لگا تو فیض الحسن نے اپنا پاؤں اندر داخل کر دیا۔ تب تک گیٹ اس کے پاؤں پر زور سے لگ چکا تھا۔ وہ درد سے کراہتا ہوا وہیں بیٹھ گیا۔ جبکہ لڑکے کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

فیض الحسن اپنا پاؤں پکڑ کر دہائی دینے لگا تھا۔ لڑکا مزید پریشان ہو گیا تھا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا کرے؟

''پانی...... ہائے میں مر گیا، میرا پاؤں...... ہائے پانی...... پانی۔'' اسے درد سے کراہتا ہوا دیکھ کر لڑکا اندر کی طرف بھاگ گیا۔ وہ شاید پانی لینے گیا تھا۔ فیض الحسن کے لیے یہ موقع سنہری تھا۔ وہ بھاگم بھاگ گھر کے صحن میں بچھی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکا پانی کا گلاس لے کر گیٹ کی جانب مڑا لیکن فیض الحسن کو وہاں نہ پا کر حیرانگی سے وہ واپس مڑا تو مزید حیران رہ گیا۔

''آپ یہاں کیسے آئے؟'' اب وہ فیض الحسن کے سامنے کھڑا تھا۔ شکل وصورت سے بالکل معصوم نظر آنے والا یہ لڑکا فیض الحسن کو بڑا ہوشیار لگا تھا۔

''گیٹ سے!''

''آپ اس گھر میں دیوار پھلانگ کر تو نہیں آ سکتے تھے۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ

اپنی کمر پر رکھ لیے تھے۔ ''آپ شکل سے تو چور نہیں لگتے۔ پھر یہ انداز کیوں اپنایا؟''

''دیکھو!......'' اب فیض الحسن بھی اٹھ کر چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ ''میں جب سے تمہارے گھر آیا ہوں۔ تم میری بے عزتی خراب کر رہے ہو اور فیضو یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''پھر کیوں برداشت کر رہے ہو؟'' ایک اور چبھتا ہوا سوال تھا۔

''بس...... میں جان گیا ہوں کہ تم میرے بھتیجے ہو۔ میرے جگری یار منظر علی کے بیٹے ہو۔''

''ابا نے تو کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔'' لڑکے نے جرح کی۔

''وہ تو ہے ہی ڈنگر......''

''یہ ڈنگر کیا ہوتا ہے؟''

''جانور! احمق کو ڈنگر کہتے ہیں۔'' فیض الحسن اب پانی پینے لگا تھا۔

''میرے ابا جیسا کوئی بھی سمجھدار نہیں ہے۔''

''وہ میرا لنگوٹیا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں'' وہ ایک بار پھر چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

''جاؤ کوئی لسی، کوئی روٹی سالن کا بندوبست کرو۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

یہ سن کر لڑکے کو غصہ آ گیا۔ وہ ہاتھ نچاتے ہوئے عورتوں کی طرح بولا۔

''نہ جان نہ پہچان بن بلایا مہمان۔ چلو اٹھو اور بھاگ جاؤ۔'' وہ فیضو کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔

''اچھا...... اچھا۔ نہ روٹی دے، مگر دھکے تو نہ دے۔ میرا یار جب آ جائے گا تب تجھے میری قدر کا پتا چلے گا۔ ڈنگرا!'' فیض الحسن اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

اب فیض الحسن کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموش ہو جائے اور اپنی عزت برقرار رکھے۔ اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ لڑکا اندر والے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

وہ منظر علی کے اس گھر کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ کتنا شاندار گھر تھا، سکون اور امن کا گہوارہ۔ وہ منظر علی کی بیوی کے متعلق سوچنے لگا۔ ایک بار منظر علی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی بیوی کینسر جیسے موذی مرض کی نذر ہو گئی ہے۔ تب وہ دونوں یار بڑا روئے تھے۔ تب یہ لڑکا دو سال کا تھا۔ اس بچے کی خاطر منظر علی نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ وہ اسے پڑھا لکھا کر اس معاشرے کا اچھا شہری بنانا چاہتا تھا۔ وہ دن رات محنت کر رہا تھا۔ پتا نہیں کون سا کام تھا۔ بس

گھر کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو بھی دھندہ کرتا ہے۔ اچھا ہی نفع ہو گا۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ منظر علی خود نہ جانے کہاں تھا؟

''یہ لو......'' لڑکے کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ ''کھانا کھا لو'' لڑکے نے روٹیوں والی چھابی اور گرم گرم سالن اس کے سامنے رکھا تو اس کی بھوک مزید جاگ گئی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' فیض الحسن نے جگہ سے گلاس میں پانی بھر کر ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔

''صفدر حسین۔'' لڑکے نے مختصر جواب دیا اور پوچھا۔ ''سچ سچ بتائیں، آپ واقعی ابا کے یار ہو؟'' اس کی بھیگی ہوئی آواز سن کر فیض الحسن تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے روٹی وہیں چھوڑ دی اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ ننھے صفدر حسین کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ فیض الحسن نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس کیا اور سینے سے چمٹاتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارے ابا کا پکا یار ہوں۔ ایسا یار کہ بھائی بھی بھائی کا بھائی نہیں ہو گا۔''

اب فیض الحسن کی آنکھیں بھی چھلکنے لگی تھیں۔

''آپ ہمارے پاس رہیں گے نا'' صفدر حسین نے اپنا چہرہ اوپر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''نہ ہی ماں کا پیار ملا ہے۔ نہ ہی کوئی رشتہ دار چاچا، تایا، ماموں یا پھر کوئی بہن بھائی مجھے پتا ہی نہیں کہ یہ رشتوں کی زنجیر کیسی ہوتی ہے......؟'' اس کی برداشت جواب دے گئی تھی اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں تو فیض الحسن بھی مغموم ہو گیا تھا۔ اس کا بھی کوئی نہ تھا۔

''میں تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ میں تمہاری ماں، چاچا، بہن، بھائی اور تمام رشتوں میں ڈھل کر ان رشتوں کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ بس اب رونا نہیں۔ ہم دوست ہیں اور ایک دوست دوسرے کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔'' فیض الحسن نے اس کے آنسو پونچھے تو صفدر حسین مسکرانے لگا۔

''ڈنگرا...... مجھے بھی اداس کر دیا، اب میری بھوک ہی مر گئی ہے۔'' وہ دونوں مسکرانے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتے گیٹ سے ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے کالے رنگ کی ساڑھی زیب تن کی ہوئی تھی۔ قد کاٹھ بھی ٹھیک تھا۔ گورا چٹا کھلتا ہوا رنگ، بالوں کو سلیقے سے سنوارا گیا تھا، وہ جتنی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی، اتنی ہی تیزی سے رک

گئی تھی۔ صحن میں کھڑے فیض الحسن کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے فیض الحسن بھی سٹپٹا گیا تھا جبکہ ننھا صفدر حسین پُرسکون انداز میں کھڑا اس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اوئے ڈنگرا......!'' اس نے جھک کر صفدر حسین کے کان میں کہا۔ ''یہ کون ہے؟''

اس نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔ ''میں تو سمجھا کہ آپ کے ساتھ گاؤں سے آئی ہیں۔'' صفدر حسین کی آواز سن کر فیض الحسن خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ جب کہ وہ خوبصورت عورت وہیں کھڑی ان دونوں کے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔

''میرے ساتھ گاؤں سے آتی تو اتنی دیر باہر کھڑی رہتی۔'' فیض الحسن نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر بولا۔ ''بی بی...... کس سے ملنا ہے آپ کو۔ اس گھر میں کوئی عورت نہیں رہتی۔''

''مجھے تم سے ہی ملنا ہے فیض الحسن!'' اس کی مترنم آواز نے فیض الحسن کا خون خشک کر دیا تھا۔

ایک اجنبی عورت کے منہ سے اپنا نام سن کر اسے دھچکا لگا تھا۔ اب وہ آگے بڑھی۔ مگر فیض الحسن چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا انداز ڈرا ڈرا اور سہما ہوا تھا۔

''مجھ سے دور کیوں بھاگ رہے ہو، فیض الحسن۔ اُف اللہ مجھے اور کتنا ستاؤ گے۔'' اب وہ آگے بڑھی اور بھاگ کر فیض الحسن کو پکڑ لیا۔ اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے مردانہ آواز میں بولی۔

''ابے ڈنگر! مجھے نہیں پہچانتا، اپنے جگری یار منظر علی کو!''

اتنا سننا تھا کہ فیض الحسن کی سانسیں ہموار ہونا شروع ہو گئیں۔ وہ منظر علی کی جاندار اداکاری اور پھر بھرپور گیٹ اَپ کا قائل ہو گیا تھا۔

اس نے زور سے بھینچ کر منظر علی کو سینے سے لگایا۔ دونوں یار ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھنڈک پہنچا رہے تھے جب کہ صفدر حسین کھڑا مسکرا رہا تھا۔

فیض الحسن کو حیران و پریشان چھوڑ کر منظر علی کپڑے بدلنے کا کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کھانے کی میز پر اکٹھے تھے اب منظر علی پہلے والا منظر علی لگ رہا تھا۔

''یار......! مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کیسے تجھ سے افسوس کروں۔ بابا اور اماں کی وفات کا۔'' منظر علی سوگوار ہو گیا تھا۔

''اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ بھلا کوئی لڑائی کر سکتا ہے۔ اس کی امانتیں تھیں وہ لے گیا۔''

فیض الحسن نے مغموم لہجے میں مشیتِ ایزدی کی تائید کی۔

''اچھا اب بتا، تمہارا کیا ارادہ ہے۔'' وہ ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔

''کوئی کام دھندہ مل جائے تو زمیندار کا قرض ادا کر کے اپنا مکان حاصل کروں گا۔'' وہ دور خلا دیس میں گھورتا ہوا بولا۔

''کیا کام کر سکتے ہو؟''

''کوئی بھی!'' وہ پُرجوش لہجے میں بولا تھا۔ ''تمہیں تو پتا ہے کہ میں محنت سے جی نہیں چراتا۔ کہیں ٹریکٹر وغیرہ بھی چلا لوں گا۔'' اس نے کہا تو صفدر حسین کا قہقہہ بلند ہو گیا۔

''چاچا جی......شہروں میں ٹریکٹر نہیں چلتے۔ یہ سب کچھ گاؤں میں ہوتا ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی شاندار گاڑیاں ہوتی ہیں۔''

''شاندار گاڑیاں؟'' فیض الحسن کو وہ شاندار گاڑی اور پھر گاڑی والی یاد آ گئی۔ اس کے سامنے وہی منظر گھوم گیا۔ وہ صراحی دار گردن گاڑی سے نکال کر خوبصورت ہونٹوں سے پھول اور پتیاں فیض الحسن پر نچھاور کر رہی تھی۔

''کہاں کھو گئے ہو فیض الحسن؟'' منظر علی کی آواز سن کر وہ واپس اسی جگہ آ گیا تھا۔

''مگر......!'' وہ تذبذب کی کیفیت سے بولا۔ ''گاڑی تو مجھے نہیں چلانا آتی۔''

''آج کل تو نوجوان ہوائی جہاز چلانا سیکھ رہے ہیں۔ آپ کو بھی گاڑی چلانا آ ہی جائے گی، آپ ہمت تو کریں چاچا!'' صفدر حسین چہک رہا تھا۔ اس کی خوشیاں دوگنا ہو گئی تھیں۔ جب سے اس نے سنا تھا کہ اب فیض الحسن یہیں ان کے ساتھ ہی رہے گا۔

''میں تمہیں گاڑی چلانا سکھا دوں گا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بہت آسان ہے۔''

''تم یہ عورت بن کر اس گھر میں کیوں آئے تھے؟'' فیض الحسن نے بڑی دیر سے روکا ہوا سوال منظر علی سے کر دیا۔

''زندگی کی حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں فیضو!'' منظر علی یک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''اللہ مہربان نے انسان کو پیٹ لگایا ہے اور ساتھ ہی وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ کسی کو بھوکا نہیں سلائے گا۔ مگر یہ بھی کہتا ہے کہ حیلہ کر وسیلہ میں بنوں گا۔ اس دنیا داری کو قائم رکھنے کے لیے رب تعالیٰ کے اپنے قانون ہیں۔ میں ایک اسٹیج کمپنی میں ملازم ہوں۔ آج کل ہم جو ڈرامہ کر رہے ہیں اس میں میرا کردار ایک ناچنے والی عورت کا ہے۔ میں اپنا گیٹ اَپ اور میک اپ خود ہی بدلتا ہوں۔ اس بیٹے کو پالنے کے لیے اور اپنے پیٹ کو بھرنے کے لیے دن رات اسٹیج پر ناچتا

ہوں۔ بس حق حلال کی تمنا دل میں لے کر گھر سے نکلتا ہوں۔ میرا پروردگار مجھے عطا کر دیتا ہے۔ پیسہ کمانے کی خاطر مرد سے عورت بن کر اداکاری کرتا ہوں مگر میں نے ایسے بھی دیکھے ہیں جو پیسہ کمانے کے لیے نیکی اور بدی کی پروا کیے بغیر دن رات دونوں ہاتھوں سے اس ملک کو نوچ کھسوٹ رہے ہیں۔ بس اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اس ملک کے خزانے کا پیٹ خالی کر دیتے ہیں۔'' منظر علی خاموش ہوا تو فیض الحسن کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

وہ اب سمجھا تھا کہ منظر علی امیر کیسے ہو گیا تھا۔ وہ عورت بن کر ناچتا تھا۔ صرف اور صرف حلال کمانے کے لیے۔

''صفدر حسین!'' وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا۔ ''فیض الحسن میرا جگری یار ہے۔ اب اس دنیا میں اس کا ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔ رب واحد کی ذات نے اسے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ اس کی تہہ دل سے خدمت کرنا، یہ تمہارا چاچا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں ابا! میری اور چاچا کی دوستی پکی ہو گئی ہے۔'' صفدر حسین اپنی جگہ سے اٹھ کر فیض الحسن کی گود میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں اور صفدر حسین اب پکے یار ہیں۔'' فیض الحسن کو بھی سہارا مل گیا تھا۔

''تم دو تین دن آرام کرو۔ میں تمہاری نوکری کا بندوبست کر دوں گا۔ یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ کی بڑی رحمت ہے، بڑے تعلقات ہیں تمہارے بھائی کے...... ڈنگرا......'' منظر علی نے آخری لفظ فیض الحسن کے لہجہ میں کہا تو تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''ابا! میں چاچا کو شہر کی سیر کراؤں گا اور گھر تک آنے جانے کا راستہ بھی سمجھا دوں گا۔''

صفدر حسین واقعی اس کا دوست بن گیا تھا۔ اس نے ابتدا اپنے گھر سے کی تھی۔ فیض الحسن نے تمام گھر دیکھ لیا تھا۔ ایک کمرہ ایسا بھی تھا جو عورتوں کے قیمتی ملبوسات اور میک اَپ کی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ منظر علی اپنے فنکشن یا ڈرامہ کی تیاری کے لیے اس کمرہ کو استعمال کرتا ہوگا۔

صفدر حسین نے اسے کرسی پر بٹھا کر اس کے جسم کے گرد کپڑا باندھ دیا۔ فیض الحسن حیرانگی سے دیکھ رہا تھا ''چاچا!'' وہ قینچی اور کنگھی پکڑ کر فیض الحسن سے مخاطب ہوا۔ ''اب میں آپ کی کٹنگ کروں گا۔ آپ کے بال اور مونچھیں شہروں میں رہنے والے لوگوں کی طرح ہونی چاہئیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ منظر علی رات بھر کا جاگا تھا۔ اب آرام کر رہا تھا اور پھر رات کو اس نے کام پر جانا تھا۔ صفدر حسین نے فیض الحسن کی قدرے بہتر کٹنگ کر دی

تھی۔ بلکہ اب وہ خود کو آئینہ میں دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ واقعی پہلے والا فیض الحسن بدل گیا تھا۔

"اب آپ یہ لباس بھی تبدیل کر لیں کیونکہ شہر میں ایسے لباس نہیں پہنے جاتے۔" صفدر حسین کے حکم کی تعمیل فیض الحسن کی مجبوری تھی اب وہ شہر آ گیا تھا اور شہری بننے کے لیے اسے جس سہارے کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے وہ سب بہم پہنچا دیا تھا۔

☆=====☆=====☆

حوریہ یونیورسٹی سے ہی فیصلہ کر کے نکلی تھی کہ کچھ کتابوں کی خریداری کی جائے گی۔ اس کی گاڑی اب شہر کے معروف بازار میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ گذشتہ سات سال سے "بکس سپاٹ" کی ریگولر کسٹمر تھی۔ اب بھی اس نے اس دکان کے سامنے گاڑی پارک کی اور اپنے قدم کتابوں کی دکان کی طرف بڑھا دیے۔ دکان کا نوجوان مالک عدنان اس کی بہت عزت کرتا تھا کیوں کہ وہ اس کی اچھی گاہک تھی۔ اس کے آنے سے اس دکان کی اچھی سیل ہو جاتی تھی۔

جیسے ہی وہ دکان میں داخل ہوئی اس کی نظر نوٹس بورڈ پر لگے ہوئے بڑے سے اشتہار پر پڑی جو کہ کسی نئی کتاب کی پبلسٹی کے لیے لگایا گیا تھا۔ حوریہ کو اس میں دلچسپی نظر آئی وہ اشتہار غور سے پڑھنے لگی۔ کوئی نیا شاعر تھا جس کی پہلی کتاب ہی مارکیٹ میں آئی تھی اور بمطابق اشتہار چند ہی کتب باقی بچی تھیں جو سیل ہونے سے رہ گئی تھیں۔

"اونہہ" یہ کہہ کر حوریہ دکان کے ایک حصے کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں شاعری اور نئے ماہ کے میگزین رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت دکان میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کی نگاہیں شاعری کی نئی کتاب کو تلاش کرنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ واقعی ایک کتاب رہ گئی تھی کیوں کہ شاعری کی باقی کتب تقریباً پندرہ پندرہ یا دس بیس کی تعداد میں لگی ہوئی تھیں مگر اس کتاب کی جگہ پر ایک ہی کتاب پڑی ہوئی تھی۔ اس نے جونہی کتاب اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے ہی کسی نے وہ کتاب اٹھا لی اس کا بڑھا ہوا ہاتھ وہیں رہ گیا۔ اس نے اسی انداز سے کتاب اٹھانے والے کی طرف دیکھا جس کے لبوں پر شریر مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

وہ سیاہ رنگ کی پینٹ اور گرین کلر کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ قد کوئی چھ فٹ ہو گا۔ گورا رنگ اور سلیقے سے کی ہوئی تازہ کلین شیو اور طریقے سے سجے ہوئے بال اس کی خوبصورتی میں

مزید اضافہ کر رہے تھے۔

"آئی۔ ایم سوری!" وہ کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ لے لیجیے۔"

"جی نہیں۔" وہ اب اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑی تھی۔ اجنبی نوجوان اس کے سراپا حسن کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "میں کسی کا حق نہیں لیتی۔"

"اس پر آپ کا ہی حق ہے کیوں کہ آپ پہلے اٹھانے کے لیے بڑھی تھیں۔" اس نے کتاب حوریہ کی طرف بڑھا دی جو اس نے لے لی۔

"شکریہ!"

"It's my pleaures" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہوا بولا تو حوریہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ویسے اس کتاب میں ایسی کون سی بات ہے کہ ہر کوئی مطالعہ کا ذوق رکھنے والا اسے خرید رہا ہے؟"

"یہ تو پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔" وہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "بائی داوے آپ کیوں خرید رہے تھے؟"

"میں خرید نہیں رہا تھا، بلکہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں شاعر نے ایسا کیا لکھ دیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں اس کی دیوانی ہو رہی ہیں۔" وہ دلفریب مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

"اس کتاب کی یا شاعر کی۔" وہ بھی مسکرانے لگی۔ "شاعری میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔"

"مشغلہ؟" وہ حیرانگی سے بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ پسندیدہ لٹریچر۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"معاملہ تو آپ کی ذاتی پسند کا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو شاعری کیوں پسند ہے؟"

"میں آپ کو بتانے کی پابند تو نہیں لیکن لگتا ہے کہ آپ بھی شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے بتا رہی ہوں۔" اس نے کتاب اپنے بیگ میں ڈال لی تھی۔

"شاعری سے آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاعر آپ کو کیا کہنا چاہتا ہے؟ شاعر الفاظ کے ذریعے آپ کے سامنے وہ سب کچھ رکھ دیتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے، شاعر بہت حساس دل کے مالک ہوتے ہیں۔ اپنا دکھ سکھ کاغذ پر بکھیرنے کے لیے کتنے ہی جان لیوا لمحات سے گزرتے ہیں۔ ایک غزل لکھنے کے لیے اذیت ناک سفر کرنا پڑتا ہے۔ بے

چارے شاعر کو۔'' وہ خاموش ہوئی تو اجنبی مسکرا کر رہ گیا جبکہ وہ دکان کے دوسرے حصے کی طرف چل پڑی۔

اس نے کچھ دوسری کتب اور میگزین خریدے اور کاؤنٹر کی طرف چل پڑی مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ کاؤنٹر کے دوسری طرف کرسی پر وہی اجنبی بیٹھا ہوا تھا اس کی نظریں دکان کا طواف کر کے دکان کے مالک عدنان کو ڈھونڈنے لگیں۔

''عدنان صاحب ابھی آ جاتے ہیں، ذرا کام سے گئے ہوئے ہیں۔'' اس کی سماعت سے اجنبی کی آواز ٹکرائی تو وہ دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی قائل ہوگئی۔ اس نے تمام کتب اور میگزین کاؤنٹر پر رکھ دیے تو اجنبی انہیں اٹھا اٹھا کر لکھی قیمتیں دیکھ کر بل بنانے لگا۔ حوریہ نے ایک بار پھر اس کے وجود کا طواف کیا تو اسے اجنبی کی خوش لباسی اور گریس فل شخصیت کا قائل ہونا پڑا۔

''بارہ سو ستر روپے۔'' اس نے تمام کتب اور میگزین شاپنگ بیگ میں ڈال کر بل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

دل کو موہ لینے والی آواز سن کر چونکنا لازمی امر تھا۔ کیوں کہ حوریہ تو اس کے سراپے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی عدنان دکان میں داخل ہوا۔ وہ حوریہ کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اسی کی طرف چلا آیا۔

''السلام علیکم حوریہ آپی!'' وہ قریب آ کر بولا۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو؟ آج کل کم ہی دکھائی دیتے ہو؟'' حوریہ نے بل ادا کر دیا تھا، اب وہ اپنا سامان سمیٹ کر جانے والی تھی۔

''دراصل آج کل بہت سی مصروفیت ہے۔ ایم بی اے کر رہا ہوں، بس ادھر ہی مصروف ہوتا ہوں۔''

''اور یہاں کا کیا ہوگا؟''

''یہ تو نہیں چھوڑیں گے، کوئی لڑکا وغیرہ رکھ لیں گے۔ فی الحال تو ''جاذب'' بھائی ہی ساتھ نبھا رہے ہیں۔'' عدنان نے آخری الفاظ کرسی پر بیٹھے ہوئے اجنبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے تو حوریہ کو اس کی شخصیت پر یہ نام بالکل فٹ لگا تھا۔ وہ نام سمیت مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔

''ان کا مکمل تعارف تو ہوا ہی نہیں۔'' وہ ہمت کر کے پوچھ بیٹھی۔

''ان کا نام جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، جاذب ہے۔ ان کی سامنے ہی ''ویڈیو اینڈ موویز'' کی دکان ہے، شہر کے بہت مشہور ویڈیو گرافر ہیں، اور......'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہوا اور جاذب کی طرف دیکھنے لگا، جس نے آنکھیں نکال کر مزید کچھ بتانے سے منع کر دیا تھا۔

''اور کیا......؟'' حوریہ نے تجسس سے پوچھا۔

''اور یہ کہ یہ ہمارے بھائی نما دوست ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے۔'' عدنان نے جاذب کا تعارف کروایا اور حوریہ ''نائس ٹو میٹ یو'' کہہ کر باہر کی جانب چل پڑی۔

''یہ تُو کیا بکواس کرنے والا تھا؟'' جاذب نے حوریہ کے جاتے ہی عدنان سے پوچھنا شروع کر دیا۔

''باس! میں تو بتانے والا تھا کہ یہ شاعر بھی ہیں اور......'' اس سے پہلے کہ عدنان مزید کچھ کہتا جاذب اسے مارنے کے لیے کاؤنٹر پھلانگ چکا تھا۔ مگر وہ اس کے ہاتھ کہاں آتا۔

حوریہ ایک ہاتھ میں شاپر بیگ پکڑے دوسرے ہاتھ میں گاڑی کی چابی پکڑے سڑک کراس کر رہی تھی کہ اچانک کسی نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کتابوں والا شاپر بیگ چھینا اور بازار کے ایک طرف دوڑ لگا دی پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے، پھر اچانک اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''چور...... چور چور چور...... چور۔ پکڑو، پکڑو۔'' وہ یہ کہتی ہوئی تیز تیز چلتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی مگر اس کی حیرت کی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی دکاندار اس کی مدد کرنے نہ آیا۔ اس کی بجائے اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ جاذب تیزی سے بکس سپاٹ سے نکلا اور اس چور کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اس نے چند قدم پر ہی چور کو پکڑ لیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چور کا سانس پھول گیا تھا وہ نڈھال ہو کر گر گیا تھا۔ کتابوں والا بیگ اس نے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔

حوریہ بھی تیز تیز چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا کہ کوئی پچاس پچپن سالہ بوڑھا تھا۔ جس کی کنپٹی کے بال سفید تھے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور جاذب اسے مارنے کی بجائے اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ حوریہ کے لیے یہ منظر بھی حیران کن تھا کیوں کہ وہ خود چاہتی تھی کہ جاذب اس چور کو مارے۔ اس سے پہلے کہ حوریہ کچھ کہتی۔ جاذب نے آہستگی سے کتب والا بیگ اس بوڑھے سے پکڑ کر اسے پکڑا دیا اس نے دیکھا کہ اب بوڑھا ہنس رہا تھا مگر حوریہ سے نظر ملتے ہی وہ ہنسنا بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھیں وحشت اور خوف سے پھٹنے

کے قریب ہوئی تھیں، وہ حوریہ کی طرف انگلی کا شارہ کر کے بولا۔

''تم......تم زندہ ہو؟''''

''بابا......؟ جاذب نے اسے بابا کہہ کر پکارا تو حوریہ کو ایک اور جھٹکا لگا اس نے حیرانگی سے جاذب کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا تو اس نے سر جھکاتے ہوئے بابا کو اٹھایا۔

''ہاں! مس حوریہ یہ میرے بابا ہیں۔'' اس کی آواز میں ہزار صدیوں کا تاسف تھا۔ جسے حوریہ نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

''کیا یہ......'' حوریہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''ہاں! مس حوریہ یہ ابنارمل ہیں۔'' وہ بابا کو سہارا دے کر کھڑا تھا'' آئی ایم سوری آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔ ان کی دوڑ یہیں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے کوئی بھی بازار والا ان کے پیچھے نہیں بھاگتا۔

''اِٹس او کے۔ میں آپ کے درد کو سمجھ سکتی ہوں۔'' وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ بابا ایک بار پھر بول پڑے۔

''مانو......مانو......میری مانو بلی......'' جاذب اسے لے کر دکان کی طرف چل پڑا جب کہ حوریہ دکھ اور غم کی تصویر بنی ان دونوں کو جاتا دیکھ رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ...... لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ۔ اس نورانی کلمہ کی آواز کا شور بلند ہوتا جا رہا تھا۔ حاجیوں کی قطاریں طواف کرنے میں مگن تھیں۔ سفید رنگ کے احرام باندھے حاجی صاحبان خانہ خدا کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ مرد عورتیں، بچے بوڑھے، جوان سبھی محبت اور لگن سے عبادت میں مگن تھے۔ ان سب میں سے اپنا آپ تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کی نظریں ارد گرد گھوم تھیں مگر وہ خود کو کہیں بھی نہ پا کر افسردہ ہو گیا تھا۔ اس بار بھی اس کی باری نہ آئی تھی، اس کی حاضری اس سال بھی منظور نہ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے دریا بہانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کتنے سالوں سے اس آس پر اسی ارمان کو دل میں لیے زندہ چلا آ رہا تھا کہ اس سال حج ضرور کرے گا مگر حج تو عملوں کا ہوتا ہے وہ تو کم ذات گندہ اور میلا انسان تھا، وہاں تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ اس مقدس سرزمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے اپنے دل کو باوضو کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر کو دھونا پڑتا ہے۔

ابھی تک اس کی باری کیوں نہیں آئی۔ اسی لیے کہ اس کا دل ابھی دھلا نہ تھا۔ وہ ابھی

اچھے اور معتبر انسانوں میں شامل نہ ہوا تھا۔ اس کا رونا دھونا سب بے کار تھا۔'' پہلے اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ اپنا من صاف کرنا ہوگا۔ دل کو دھونا ہوگا، آنکھوں کو حیا اور شرم سکھانی ہوگی۔ تمیز اور عقل کا پیرہن اوڑھنا پڑے گا، ابھی اور ناچنا ہوگا، ابھی اور ناچنا ہوگا، ابھی اور ناچنا ہوگا، اٹھو اور گھنگرو باندھو، اس سے پہلے کہ ''یار'' مزید ناراض ہو جائے'' اس سے پہلے کہ قیامت آ جائے، اس سے پہلے کہ مرشد کی ناراضی تمہاری جان لے لے، اٹھو، اٹھو گھنگرو باندھو اور ننگے پاؤں ناچو، ناچو، ناچو، ناچو......''

ان آوازوں نے اسے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والی حیرانی اور چہرے سے برسنے والی سراسیمگی اس کے ساتھی نے محسوس کر لی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور اس کے منہ سے پانی کا گلاس لگا دیا۔ وہ غٹا غٹ پینے لگا مگر جتنی پیاس تھی، جتنی تشنگی تھی، گلاس کا وجود ریگستان میں ایک ننھے منے قطرے کی مانند لگ رہا تھا پھر وہ کئی گلاس پانی پی گیا۔ اس کی بے ترتیب سانسیں اب اعتدال پر آ گئی تھیں۔ اس کی پیشانی پر چمکنے والے پسینے کے شبنمی قطرے اب صاف ہو گئے تھے۔

اپنی بدبختی پر زار و زار رونے کو دل کرتا تھا۔ مگر آنسو بہہ بہہ کر گالوں پر لکیریں بنا گئے تھے۔ آنکھوں سے باہر گرنے کی بجائے اب دل پر گرنے لگے تھے۔ اس نے اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھا۔ وہی منظر تھے، جو روزانہ اس کی نگاہوں کی زینت بنتے تھے۔ کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ نیم کا درخت بھی اسی کی طرح اداس کھڑا ہوگا، سڑک پر ٹریفک کا بہاؤ معمول کے مطابق ہوگا، چاند تارے ایک دوسرے کی تنہائی دور کرنے کے لیے چمک چمک کر ایک دوسرے کا دل بہلانے کی کوشش میں رات بتا رہے تھے۔ سردیوں کی یہ سرد رات اسے اماوس کی رات لگتی تھی۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جو بظاہر کمبل اوڑھ کر سو رہا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ نہیں سوئے گا اس کا ساتھی بھی نہیں سو سکے گا وہ اس کی طبیعت اور فطرت سے واقف ہو گیا تھا۔

پھر اس نے کونے میں پڑی ہوئی ڈھولک کی طرف دیکھا، دکھ اور تاسف سے سوچنے لگا۔

دن چڑھنے کے بعد اس ڈھولک کی تھاپ پر اسے رقص کرنا تھا، گھنگرو باندھ کر گلیوں اور بازاروں میں ناچنا تھا کیوں کہ وہ ہیجڑا تھا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی درد کی تیز لہر نے اسے

سوچوں سے نکلنے پر مجبور کر دیا

☆=====☆=====☆

صفدر حسین نے تھوڑے ہی دنوں میں فیض الحسن کو مکمل شہری بنا دیا تھا۔ اب اس کی نوکری کا مسئلہ تھا۔ منظر علی نے اپنے ڈائریکٹر سے بات کر کے اس کے ہاتھ گاڑی پر سیدھے کروا دیے تھے۔ ڈائریکٹر نے اپنی گاڑی منظر علی کو چند دنوں کے لیے دے چھوڑی تھی جو فیض الحسن کے کام آ گئی۔ اب وہ بہترین ڈرائیور تھا، منظر علی نے اسے بتایا تھا کہ آج شام کو ایک جگہ پر اس کی نوکری کے لیے جانا ہے، اگر بات بن گئی تو ''وارے نیارے'' ہو جائیں گے۔

اب صفدر حسین اور فیض الحسن دونوں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ فیض الحسن بے چینی سے ٹہل رہا تھا اس نے پورا مہینہ صفدر حسین کا حکم مان مان کر گزارا تھا۔ وہ اسے مختلف پارکوں اور تفریحی مقامات پر لے جاتا رہا۔ کبھی کبھار فیض الحسن کو تنہا بھی چھوڑ دیتا اور شرط لگاتے کہ پہلے گھر کون پہنچا ہے اور حیرت انگیز طور پر فیض الحسن شرط جیت جاتا تھا۔

صفدر حسین نے فیض الحسن کی ایک اور خوبی سے بہت فائدہ اٹھایا تھا وہ یہ کہ فیض الحسن قرآن کریم کی قرأت بہت اچھی کرتا تھا۔ گاؤں کے سکول میں پانچویں فیل ہونے والا یہ بچہ مدرسہ میں قرآنی تعلیم حاصل کرنے میں ٹاپ کر گیا تھا۔ اس نے اپنی پیاری آواز سے مدرسہ کے تمام اساتذہ کو حیران کر دیا تھا مگر غربت آڑے آ گئی۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی مگر وہ ہر روز صبح صبح معمول کے مطابق قرآن کریم کی قرأت دل کی گہرائیوں سے کرتا تھا۔ وہ دوران قرأت اتنا محو ہو جاتا تھا کہ آس پاس کا ہوش گنوا بیٹھتا۔ اس کی آنکھیں ساون برسانے لگتی تھیں، بس صفدر حسین بھی اس کا شاگرد بن گیا تھا، اب وہ چچا کی بجائے فیض الحسن کو استاد کہتا تھا۔

''استاد!...... ایک بات تو بتاؤ۔'' صفدر حسین نے اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہونے کے لیے اسے باتوں میں الجھانا شروع کیا۔

''پچھ ڈنگرا!'' وہ مسلسل ٹہل رہا تھا۔

''اگر سیٹھ صاحب نے کہا کہ تم ہمارے بنگلے پر ہی رہو گے تو......؟''

''تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہماری دوستی ختم۔'' وہ اداسی سے بولا تو فیض الحسن چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ ٹہلتا ٹہلتا رک گیا تھا۔

''دوستیاں اتنی جلدی ختم نہیں ہوتیں۔'' وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''اب یہ دوستی میری موت پر ہی ختم ہو گی۔''

''تجھ میں ایک خرابی ہے استاد!'' وہ اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے غصے سے بولا۔

''وہ کیا......؟''

''بہت جلد سنجیدہ ہو جاتے ہو، زندگی اور موت کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔''

''نہیں کریں گے۔'' وہ فوراً ہی مان گیا تھا، وہ ننھے صفدر حسین کو اداس نہ دیکھ سکتا تھا۔

''اگر اس دوران کوئی شہری لڑکی پسند آ گئی تو......؟''

''تو......تو......'' وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ گاڑی والی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''سنا ہے یہ عورت فساد کی جڑ ہے۔ بھائیوں کو بھائیوں سے جدا کروا دیتی ہے۔'' فیض الحسن کو اس کی آواز واپس وہیں لے آئی۔

''مگر تم میرے بھائی تو نہیں ہو۔''

''بھائی نہیں ہوں مگر بھائی کا بیٹا تو ہوں۔'' وہ اب اپنے دونوں ہاتھ پسلیوں پر رکھ کر فیض الحسن کو گھور رہا تھا۔ اس کی اس ادا پر فیض الحسن قربان ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر صفدر حسین کو گود میں اٹھا لیا اور منہ چومتے ہوئے بولا۔

''میں نے ٹھیک کہا ہے، تم میرے بھائی نہیں ہو، میرے جگر کا ٹکڑا ہو، میری جان ہو تم۔''

''مگر تم تو کہتے تھے کہ تمہارا جگر خراب ہے۔'' صفدر حسین ایک بار پھر مذاق کے موڈ میں تھا۔

''میں ٹھیک کہتا تھا کہ میرا جگر خراب ہے کیوں کہ میرا جگر تو تم ہو اور تم ٹھیک نہیں ہو۔'' اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تو صفدر حسین مسکرا کر رہ گیا۔

''تمہیں بھی شہر کی ہوا لگتی جا رہی ہے۔ اچھا ایک نصیحت کرنے لگا ہوں ذرا غور سے سنو۔'' وہ بڑے بزرگوں کا انداز اپناتے ہوئے بولا تو فیض الحسن فرمانبردار بچوں کی طرح اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''جی فرمایئے دادا جی!''

''اس شہر میں بھرپور زندگی گزارنی ہو تو لڑکیوں سے بچ کر رہنا، یہ میری نصیحت ہے۔''

"ٹھیک ہے ۔۔۔ داجی!" فیض الحسن عاجزی سے بولا تو صفدر حسین کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

اتنی دیر میں گیٹ کھلنے کی آواز سن کر دونوں چونک پڑے۔ منظر علی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو رہا تھا۔ "چلو بھئی فیض الحسن! بوریا بستر اسنبھالو اور چلنے کی تیاری کرو۔" وہ آتے ہی خوشخبری لایا تھا اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کوئی اچھی ہی آفر ہے۔

"مجھے کرنا کیا ہوگا؟" وہ عاجزی سے مسکینوں والی صورت بناتے ہوئے بولا تو صفدر حسین ہنس کر بول پڑا۔

"دیوار چین جگہ جگہ سے اکھڑ گئی ہے اس کی مرمت کرنی ہے۔"

"دیکھو منظر علی!...... یہ مجھے مذاق کرتا ہے۔ دراصل شہر کا پانی ہی ایسا ہے۔" وہ پُر شکایت انداز میں گویا ہوا تو منظر علی بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اوئے ڈنگرا!...... تیرا چاچا ہے اس کا لحاظ کیا کرو" وہ صفدر حسین کو ڈانٹنے لگا پھر کہا۔ "ملک عبدالرحمٰن صاحب میرے بہت اچھے فین ہیں۔" وہ فیض الحسن کو سمجھانے لگا۔ "یہ فین کیا ہوتا ہے......؟" فیض الحسن درمیان میں ہی بول پڑا۔

"مطلب کہ...... میری اداکاری کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی بہت بڑی کوٹھی ہے انہیں ایک عدد ڈرائیور کی ضرورت تھی میں نے تمہاری بات کر لی ہے۔ اب باقی تمام کام تمہیں وہ سمجھا دیں گے۔" فیض الحسن تمام باتیں سعادت مندی سے سن رہا تھا۔

"مگر صاحب اصول پسند آدمی ہیں ہر کام وقت پر اور پورا کرنے کے عادی ہیں اور دوسروں سے بھی یہی توقع کرتے ہیں کہ ان کے ملازم بھی تمام کام ان کی منشاء اور مرضی کے مطابق کریں۔" منظر علی نے خلاصہ بتا دیا تھا اب فیض الحسن کو ڈرائیونگ کرنا تھی۔

"اور ایک اہم بات!......" وہ دونوں منظر علی کی جانب متوجہ ہوئے۔

"تمہیں دن رات وہیں رہنا ہوگا، مہینہ میں ایک چھٹی ہوگی اور تنخواہ پورے چھ سو روپے ملے گی۔"

"چھ سو......؟" فیض الحسن کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کیوں کہ اس سے پہلے وہ زمیندار کے ہاں ماہانہ نوے روپے پر کام کرتا تھا۔ اب تو وہ بہت جلدی زمیندار کا قرض اتار کر اپنا مکان واپس لے سکتا تھا۔ وہ اپنے مکان میں اپنے گاؤں میں رہے گا۔" وہ سوچوں ہی سوچوں میں بہت دور نکل گیا تھا صفدر حسین کی آواز پر چونک گیا۔

"اب ہماری ملاقات مہینہ بعد ہوا کرے گی......؟" وہ مغموم ہو گیا تھا۔

"نہیں...... میں تمہیں کبھی کبھار ملنے آ جایا کروں گا، تم فکر نہ کرو۔ ہماری دوستی مزید پکی ہوگی۔" وہ صفدر حسین کو دلاسہ دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا، مگر خود بھی اداس ہو گیا تھا۔

"صبح گیارہ بجے تیار رہنا فیضو۔ ہم ملک صاحب کے ہاں کل چلیں گے۔" منظر علی ان کو مزید اداس نہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور وہ دونوں صحن میں ہی اداس اداس ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم اداس کیوں ہو......؟ تم ایسا کرنا کبھی کبھار مجھ سے ملنے کوٹھی آ جایا کرنا۔" فیض الحسن نے کہا تو صفدر حسین کی آنکھیں چمکنے لگیں، اسے یہ آئیڈیا بہت پسند آیا تھا۔

اگلے دن گیارہ بجے وہ ملک عبدالرحمٰن کی بنگلہ نما کوٹھی پہنچ چکے تھے۔ فیض الحسن کے ہوش اُڑ گئے تھے کیوں کہ گاؤں میں زمیندار کی حویلی دیکھی تھی جو تقریباً چار پانچ کینال پر محیط تھی مگر وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شہر میں کسی کا اتنا بڑا گھر بھی ہو سکتا ہے...... وہ بنگلہ کم از کم پچاس کینال پر تعمیر ہوا تھا۔ کیوں کہ اس کے تین داخلی دروازے تھے۔ کافی اندر جانے کے بعد عمارت شروع ہوتی تھی۔ پورچ میں شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک گاڑی فیض الحسن کو ملنے والی تھی، وہ لبوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ چوکیدار نے انہیں لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ گھاس پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ احساسِ کمتری غریب آدمی کے اندر سے جاگتا ہے اتنی دولت اور شاندار عمارت کو دیکھ کر فیض الحسن کا دل دھڑک دھڑک کرنے لگا تھا۔

"کیا وہ ان کے معیار پر پورا اترے گا......؟" وہ خود ہی سوچنے لگا۔ اتنی دیر میں سامنے سے ایک لحیم شحیم بلند قد و کاٹھ کا مرد آتا دکھائی دیا۔ جس نے کلین شیو کر رکھی تھی۔ تیل لگا کر سر کے بال پیچھے کی طرف سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے تھے۔ بے سلوٹ لباس اس کی شخصیت کو مزید نکھار رہا تھا۔ "یہی عبدالرحمٰن صاحب ہیں، کسی بھی قسم کی کوئی غلطی نہ کرنا۔" منظر علی نے اسے سمجھا دیا۔

"یہ تو بہت کرخت آدمی لگتا ہے۔"

"بس......! اپنی زبان منہ کے اندر دانتوں کے تالے میں بند کر لو" وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملک صاحب کے ساتھ ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی بھی تھا جو کہ بالکل نوجوان تھا۔ اس کے ہاتھ میں فائلوں کا انبار تھا۔ وہ یقیناً کوئی مینجر وغیرہ ہوگا۔ فیض الحسن ان دونوں کی چال ڈھال سے خاصا مرعوب ہوا تھا۔ اب وہ دونوں ان کے پاس پہنچ چکے تھے۔

پاس آنے پر منظر علی نے ملک عبدالرحمٰن کو کرسی پیش کی اور سلام کیا جب کہ فیض الحسن کو

بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ ملک کی نظر میں بے فکری، طبیعت میں غرور اور گردن کا اکڑاؤ بتا رہا تھا کہ باپ دادا کی جائیداد پر عیش کر کے اپنے آپ کو منوایا گیا ہے کیوں کہ منظر علی نے یہ نہ بتایا تھا کہ وہ کون سا ایسا کاروبار کرتے تھے جس سے ان کی یہ شان و شوکت برقرار تھی۔ منظر علی اور فیض الحسن کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اس بات کا کھوج لگاتے۔

''ہاں بھئی منظر علی!'' ملک صاحب اب کرسی پر براجمان ہو گئے تھے۔'' ہمارے کام کا کچھ بنا؟''

''جی ملک صاحب!'' منظر علی عاجزی سے سامنے آیا اور ایسی صورت بنالی کہ دنیا میں اس سے زیادہ مسکین صورت کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' فیض الحسن میرا بھائی ہے اور ان شاء اللہ آپ کو کوئی بھی شکایت نہ ہوگی۔''

''فیض الحسن!'' ملک نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا تو فیض الحسن کی روح فنا ہو گئی۔

''کتنی دیر ہو گئی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ڈرائیونگ کا کتنا تجربہ ہے؟'' یہ سوال اب براہِ راست فیض الحسن سے کیا گیا تھا اور اسے اپنی ذہانت کو مدنظر رکھتے ہوئے منظر علی کی بتائی ہوئی باتوں کے مطابق اس کا جواب دینا تھا۔ جھوٹ اور سچ کو ملا کر نوکری حاصل کرنا ہی اولین ترجیح تھی۔

''گزشتہ تین برس سے ڈرائیونگ کر رہا ہوں جناب!'' وہ عاجزی سے بولا تو ملک نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو فیض الحسن لرز کر رہ گیا۔

''تم اس کوٹھی میں محض ڈرائیور ہی نہیں ہو گے، تمہاری ذمہ داریاں زیادہ ہوں گی اور تنخواہ کی تم فکر نہ کرنا۔ ہم منظر علی کے فن کی قدر کرتے ہیں اور اس کے بھائی کی بھی قدر کریں گے اگر تم ہمارے معیار پر پورا اترو گے تو.....''

''مجھے ڈرائیونگ کے علاوہ اور کیا کرنا ہوگا جناب؟'' فیض الحسن نے ہمت کی اور بات کہہ دی۔

''ہر روز نئی ہدایت تمہیں مل جایا کرے گی اور تم جب چاہو منظر علی سے ملنے جا سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر ملک صاحب اٹھ کر جانے لگے مگر دوبارہ مڑ کر کہنے لگے۔

''صبح سات بجے تمہاری ڈیوٹی شروع ہو جائے گی۔ ڈیوٹی شروع ہونے سے پہلے ہم تمام کام اور تمام باتیں مکمل طور پر اپنی مرضی کے مطابق حل کرنے کے عادی ہیں۔ یاد رکھنا کبھی بھی کسی کام کو ہماری عادت اور مرضی کے خلاف کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارے لیے

بہتر ہوگا۔'' یہ کہہ کر ملک صاحب اور منیجر واپس چلے گئے، مگر ان کے منہ سے اطمینان کی نکلنے والی سانس نے ان کے سینے پھٹنے سے بچا لیے تھے۔

منظر علی اسے چھوڑ کر چلا گیا تو تھوڑی دیر بعد مالی بابا نے اسے اس کے کوارٹر میں پہنچا دیا۔ ایک خوبصورت سا پلنگ اور صاف ستھرا بستر دیکھ کر اس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ کمرہ گو کہ چھوٹا تھا مگر ضروریات زندگی کی سب اشیاء مثلاً پانی، باتھ، بستر، پلنگ اور دیگر ساز و سامان موجود تھا۔ ایک چیز کی کمی اس نے شدت سے محسوس کی تھی۔ وہ تھا ''قرآن کریم'' جو کہ اس کمرے میں موجود نہ تھا۔ اس نے مالی بابا سے کہا تو اس نے سر سے پاؤں تک فیض الحسن کی طرف دیکھا جیسے کہ اس نے کوئی انوکھی چیز مانگ لی ہو۔

ویسے دیکھا جائے تو چیز واقعی انوکھی ہے۔ اسی کی بدولت ہمیں زندگی گزارنے کا قرینہ آیا ہے۔ ہمارے مذہب کی بنیاد ہی قرآن کریم ہے۔ دوسری قوموں اور ہم میں فرق یہی ہے کہ ہم اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں جن پر یہ کتاب نازل کی گئی جب کہ دوسری قوموں کے انبیاء کرام پر اترنے والی الہامی کتابیں زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہی ہیں مگر قرآن کریم ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں لفظ اللہ کا اضافہ اور لفظ شیطان کا اخراج بھی ناممکن ہے۔ یہ مکمل اور جامع کتاب ہے۔

لیکن قرآن کریم کو ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ اپنا دین دھرم اور ایمان روپیہ پیسہ بنا لیا ہے جو کہ بہت دکھ اور تاسف کی بات ہے۔ فیض الحسن نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔ مالی بابا جا چکا تھا، یقیناً وہ قرآن کریم لینے گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

چلی آؤ اماوس کی رات پھر سے دوست ہو جائیں
کم ظرف چاند کے ہالے میں بھٹکا رہا ہوں میں
مفلسی نے پہنا دیا مجھے اس کی خفگی کا پیرہن
کبھی آسودگی میں جس کی رداء رہا ہوں میں

اس شعر سے وہ شاعر کے دکھ اور غم کا اندازہ کر سکتی تھی۔ ہر شعر شاعر کے دل کی صدا ہوتا ہے۔ وہ اپنا غم اور المیہ الفاظ کے ذریعے ایک لڑی میں پرو کر غزل بناتا ہے۔ پھر لوگ اسے پڑھ کر ان الفاظ کا مطلب اپنے اپنے حساب سے لیتے ہیں۔ شاعر کا ایک شعر تقریباً ہر طبقہ کے لوگوں کی اندرونی عکاسی کرتا ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی اور فطرت کے مطابق اس کا مطلب

نکالتا ہے۔تبھی تو شاعر حضرات کو اس رُوئے زمین پر کائنات کی حساس ترین قوم کا خطاب ملا ہے۔اس شعر کو پڑھ کر حوریہ کی کیفیت بھی تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ بظاہر خوش وخرم نظر آنے والے انسان اپنے اندر ایک کہانی رکھتے ہیں۔ ایک دکھ بھری دردناک کہانی، جس کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے کسی نہ کسی رائٹر یا پھر شاعر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔وہ نئی کتاب کی شاعری کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔وہ آج تک کسی بھی شاعر سے نہ مل سکی تھی اور نہ ہی ملنا چاہتی تھی لیکن اس شاعری میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ عدنان سے مل کر اس شاعر کا ایڈریس معلوم کرے گی اور اس کے گھر پر اس سے ملاقات کرے گی مگر کس حوالے سے؟

''اس حوالے سے کہ وہ اس کی بہت بڑی فین ہے۔'' اس نے خود ہی اپنی بات کا جواب دے دیا تھا۔

دروازے پر دستک سن کر وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔''آجاؤ'' اس نے کہا تو اندر داخل ہونے والی ہستی کو دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ''ماہ نور'' بوا کی دل و جان سے عزت کرتی تھی۔ایک ڈیشنگ پرسنالٹی کی مالک اس کی بوا کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔وہ ہمیشہ سوگوار رہتی تھیں۔اس بات کا اندازہ حوریہ کبھی بھی نہ لگا سکی تھی کہ بوا کو کیا دکھ ہے؟ اس نے کئی بار پوچھنے کی کوشش کی مگر ہر بار ہی بوا ٹال گئیں۔اب بھی انہوں نے سر پر سیاہ رنگ کا سکارف اوڑھ رکھا تھا، ہاتھوں میں ہینڈ بیگ تھا۔ غالباً وہ کہیں باہر جانا چاہتی تھیں۔اپنے ساتھ حوریہ کو لینے آئی تھیں۔وہ کبھی بھی اکیلی بازار نہ گئی تھیں۔حالانکہ وہ ماہر ڈرائیور تھیں۔ اپنی گاڑی کو کبھی بھی خود ڈرائیو نہ کرتی تھیں۔بقول دادی ان کی ایسی شخصیت تب سے ہو گئی تھی جب سے ان کے میاں کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔تب سے وہ بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ان کا دو سالہ بیٹا بھی اس حادثہ کی نذر ہو گیا تھا۔بوا بھی اس دن اپنے میاں کے ساتھ تھیں مگر وہ بچ گئیں جوانی میں بیوہ ہونے کا دکھ اس قدر شدید تھا کہ آئندہ انہوں نے کبھی بھی سہاگن نہ بننے کی قسم کھا لی تھی۔ بابا جان، دادی، چچا اور امی سبھی لوگ سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔انہوں نے آخری بار سب کو چپ کروا دیا تھا کہ اگر گھر میں آئندہ اس کی شادی کی بات ہوئی تو وہ زہر کھا لیں گی اور اس کے ذمہ دار مذکورہ بالا رشتہ دار ہوں گے۔ان کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔اب کوئی بھی ان سے شادی کرنے کی بات نہ کرتا تھا بلکہ ان کے چہرے پر [illegible] تھا۔ بس حوریہ ہی گھر میں واحد فرد تھی جس سے بوا

کی گاڑھی چھنتی تھی۔

اب بھی وہ کہیں جانے کے لیے حوریہ کو ساتھ لے جانے آئی تھیں۔

''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔'' انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی معتبر اور میٹھی آواز میں پوچھا تو حوریہ کے لبوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

''جلدی سے بالوں کو پونی میں باندھو۔ہم بازار جا رہے ہیں۔'' انہوں نے اپنا فیصلہ صادر کیا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ وقت بہت کم ہے۔

''بوا......'' وہ کسلمندی سے بولی۔''آپ ہو آئیں نا۔''

''تم کیا کر رہی ہو؟'' وہ اب اس کے بیڈ کے ساتھ رکھی ہوئی قیمتی کرسی پر بیٹھ گئیں۔وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ حوریہ کو لے جانے کے لیے سو پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔

''میں پڑھ رہی ہوں۔''

''اب کون سا پیپرز ہونے والے ہیں؟'' اسی انداز میں پوچھا گیا۔''اور پھر ''ماہم'' کی شادی کی تیاریاں بھی تو کرنی ہیں۔صرف پانچ منٹ میں نیچے پہنچو۔ میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ یہ حکم سنا کر نیچے یعنی باہر کی جانب چل پڑیں اور حوریہ چارو ناچار اٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے جلدی سے منہ دھویا۔ہلکی سی لپ اسٹک لگائی۔بالوں کو کنگھی کر کے پونی میں باندھا۔اپنے پاؤں تلے قیمتی قالین کو روندتی ہوئی باہر نکلی تو گھر میں ہُو کا عالم تھا۔وہ شاندار سیڑھیاں اترتی ہوئی وسیع ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی اس نے ڈرائنگ روم کی چھت سے لٹکے ہوئے لاکھوں روپوں کے فانوس کی طرف دیکھا اور اس کی بے بسی پر لرز کر رہ گئی۔امیر لوگ کتنا روپیہ ایسی چیزوں پر ضائع کر دیتے ہیں۔

وہ ایک شان سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔عظیم الشان محل کے بہت بڑے پورچ میں کئی شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ان میں سے ایک بوا کی گاڑی بھی تھی۔ وہ چلتی ہوئی گاڑی کے پاس پہنچی۔حسب توقع بوا ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھیں۔حوریہ نے مسکراتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔گاڑی ایک لمبا سا ٹرن لے کر گیٹ کی جانب بڑھی تو چوکیدار نے دور سے ہی دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔''قصرِ ماہ نور'' کی پُرشکوہ عمارت ان کے پیچھے سینکڑوں گز پر محیط وسیع لان چھوڑ کر اپنی تمام تر رعنائیوں سے چمک دمک رہی تھی۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں چند ہی بنگلے تھے۔ ہر عام آدمی کو ادھر آنے کی اجات نہ تھی۔اس روڈ کو وی آئی پی قرار دیا گیا تھا کیوں کہ بہت بڑے بڑے امراء اور رؤساء کے

بنگلے اس روڈ پر واقع تھے بس گاڑی والا ہی اس طرف آ سکتا تھا۔

حوریہ گاڑی تیزی سے بھگا رہی تھی۔ اس کی شکل اپنی بوا ماہ نور سے کچھ مشابہت رکھتی تھی اور کئی عادات بھی ان سے ملتی تھیں۔

''گاڑی آہستہ کرو۔'' بوا نے کہا تو حوریہ نے چونک کر سپیڈ کم کر دی اور استفہامیہ انداز سے ان کی طرف دیکھا۔

''زندگی حادثوں کا نام ہے مگر کچھ حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں جو رشتوں کی زنجیر کو توڑ کر ان کی ہر کڑی کو علیحدہ علیحدہ کر دیتے ہیں۔'' وہ سامنے سڑک پر گھور رہی تھیں۔ ''احتیاط لازم ہے میں اب مزید کوئی بھی حادثہ برداشت نہیں کر سکتی میری بچی۔ میں کسی اور کو کھونا نہیں چاہتی۔'' ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ حوریہ کو اپنی غلطی کا احساس شرمندہ کرنے لگا تھا۔

''آئی ایم سوری!'' اس نے گاڑی کی رفتار نارمل کر لی تھی۔

''اِٹس اوکے۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ حوریہ کے ہاتھ پر رکھ کر دلاسہ دیا۔

''آپ خود گاڑی کیوں نہیں چلاتیں؟''

''مجھے چلانی نہیں آتی۔'' مختصر سا جواب سن کر حوریہ ہنسنے لگی۔

''یہ بابا جان کا خیال ہے؟''

''نہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے۔''

''تو پھر آپ ایک ڈرائیور رکھ لیں۔'' حوریہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تو ماہ نور بوا کے چہرے پر آ کر گزرنے والے غم کے سائے کو وہ دیکھ نہ سکی۔ درد کی ایک تیز لہر نے ان کے وجود کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا وہ سرتاپا لرز کر رہ گئی تھیں۔

انہوں نے حوریہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ حوریہ نے اپنا سوال ایک بار پھر کر دیا تھا۔

''آپ کوئی اچھا سا ڈرائیور رکھ لیں نا۔''

''رکھا تھا۔'' بوا گاڑی میں موجود نہ تھیں۔ ان کا لہجہ ان کا اپنا نہ تھا۔ دل کے زخموں کو کسی نے ایک بار پھر چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔

''مگر میں نے تو آج تک گھر میں کوئی ڈرائیور نہیں دیکھا۔ بابا جان نے پابندی لگائی ہوئی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ سختی سے اس بات کی پابندی ہے کہ اپنی گاڑی خود ہی چلاؤ۔ کوئی ڈرائیور نہیں آئے گا کیوں کہ بابا جان کا خیال ہے کہ ڈرائیور گاڑیوں کی کیئر نہیں کرتے۔''

''تمام ڈرائیور کیئرلیس نہیں ہوتے۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

وہ باتوں میں مگن تھیں کہ بازار تک پہنچ گئیں۔ حوریہ نے گاڑی ایک خالی جگہ پر پارک کی۔

''آپ کیا خریدیں گی؟ میک اَپ آپ نہیں کرتیں، کڑھائی والے سوٹ آپ نہیں پہنتیں، بالوں میں کلپ اور پونیاں آپ نہیں لگاتیں، ہاتھوں پر مہندی کبھی نہیں دیکھی، پھر آپ کیا خریدنے آئی ہیں؟'' حوریہ اب ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''میری جان! میں تمہارے لیے شاپنگ کرنے آئی ہوں۔ ماہم، حنان، غزنوق اور زمان کے لیے بھی کچھ نہ کچھ خرید لو۔''

''مگر بوا! یہ سب لوگ اپنی شاپنگ خود کیوں نہیں کرتے؟'' وہ اتنے سارے نام سن کر چڑ گئی تھی۔

''ان کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔''

''تو میں اور آپ ہی فالتو ہیں۔''

''کوئی بھی فالتو نہیں ہوتا۔'' وہ چلتے چلتے گارمنٹس کی ایک دکان میں گھس گئیں۔

''کوئی اچھا سا گہرے کلر کا مردانہ شلوار قمیص دکھائیے۔'' انہوں نے کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑے سیل مین لڑکے سے کہا اور دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''آپ نے مردانہ شلوار قمیص کیا کرنا ہے بوا؟'' وہ اپنا منہ بوا کے کان کے قریب کرتی ہوئی بولی۔ ''گھر میں حنان بھائی اور زمان بھائی پینٹ شرٹس استعمال کرتے ہیں اور بابا جان اپنی خریداری خود کرتے ہیں۔''

''خاموش رہو۔'' انہوں نے آنکھیں نکالیں۔ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی مگر کب تک۔

''بوا! آپ نے سائز تو بتایا ہی نہیں۔'' اس نے یاد دلایا تو وہ سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف گھورنے لگیں جیسے کہ اس میں سے سائز نکلے گا۔

''لارج سائز کے دو تین سوٹ پیک کر دو۔'' انہوں نے دکاندار سے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ باہر نکلیں تو حوریہ کو عدنان نظر آ گیا۔ وہ بھی ان کی طرف دیکھ کر چلا آیا قریب آنے پر اس نے دونوں کو سلام کیا۔ بوا بھی اسے بک سپاٹ کے حوالے سے جانتی تھیں کیوں کہ حوریہ اکثر بوا کے ساتھ بکس کی خریداری کے لیے آتی رہتی تھیں۔

''حوریہ آپی نئی شاعری کی کتاب کیسی لگی آپ کو؟''

''ابھی تو شروع کی ہے۔ ویسے بائی دے وے اس شاعر کا اتا پتا معلوم ہو سکتا ہے یا نہیں؟''

''پبلشرز سے پوچھ کر بتا سکتا ہوں۔ آپ دو تین دنوں میں پوچھ لیجیے گا۔'' یہ کہہ کر عدنان آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھیں تو بوا نے گھر کی طرف جانے کی بجائے گاڑی مخالف سمت میں لے جانے کو کہا۔ حوریہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، حکم کی تعمیل کی۔ اب گاڑی شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ حوریہ نے دیکھا کہ بوا کے چہرے پر افسردگی بڑھتی جا رہی ہے۔ گاڑی ایک جگہ روک دی گئی، سڑک کے کنارے ایک بوڑھا کا بڑا پرانا سا درخت تھا جس کے سائے میں گاڑی کھڑی کر کے دونوں ہی اتریں۔ حوریہ نے دیکھا کہ ایک مجذوب ملنگ ان کی طرف آ رہا تھا۔

وہ پاس آ کر رک گیا۔ غور سے ان کی طرف دیکھ کر ایک طرف ہو کر درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ جیسے اس نے کہا۔ کہ وہ اندر قبرستان میں چلی جائیں۔ میں تمہاری گاڑی کا خیال رکھتا ہوں۔ حوریہ حیرت واستعجاب کے عالم میں بوا کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی جب کہ ماہ نور بوا بالکل پُرسکون انداز میں چلتی ہوئی قبرستان میں داخل ہو گئیں۔ گیٹ پر ''کاکا سائیں قبرستان'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اس جگہ پر آئی تھی۔

بوا چلتی ہوئی ایک قبر پر جا کر رک گئیں۔ وہ غور سے قبر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ حوریہ نے ان کی نظروں کے تعاقب میں قبر کی طرف دیکھا تو صاحب قبر کا نام پڑھ کر حیران رہ گئی۔ یہ نام اس کے لیے اجنبی تھا۔ گھر میں کبھی بھی اس نام کے فرد کا تذکرہ نہ کیا گیا تھا، پھر یہ کون ہے؟ کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا، پھر بوا اتنی رازداری سے یہاں کیوں آئی ہیں؟

بوا کی تقلید کرتے ہوئے اس نے بھی ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ دعا کرنے لگی مگر سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ کس حوالے سے دعا مانگے؟ جب کہ اس نے کنکھیوں سے دیکھا تو ماہ نور بوا کی آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑی لگا چکی تھیں۔ ان کا اجلا اجلا خوبصورت چہرہ مزید نکھر آیا تھا۔ حوریہ حیران تھی کہ کروڑوں روپے کی مالکن ماہ نور بوا ایک اجنبی قبر پر آ کر کیوں رو رہی ہیں۔ وہ تمام قبروں سے صاف ستھری قبر تھی۔ پھر وہ چلتی ہوئی اس قبر کے پہلو میں بنی ہوئی ایک ننھی سی قبر کے سرہانے بیٹھ گئیں۔

''مراد الحسن۔ تاریخ وفات 2 جنوری 1978ء بروز جمعرات۔ عمر دو سال''

یہ کتبہ پڑھ کر حوریہ کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں کیوں کہ دو سال کی عمر میں ہی اس خاک

تلے سو جانے والا پھول معصوم اور ان کھلا ہو گا۔ بوا اس قبر پر ہاتھ پھیر کر رونے لگیں، پتا نہیں کیوں؟

جب ان کا جی ہلکا ہوا تو وہ ڈھلے ہوئے چہرے کے ساتھ واپس مڑیں اور حوریہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے قبرستان کے بیرونی گیٹ کی جانب چل پڑیں۔ باہر آ کر انہوں نے دیکھا کہ وہ مجذوب وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہوا۔ بوا نے گاڑی کی اگلی سیٹ سے کپڑوں کا شاپر بیگ اٹھایا اور اس مجذوب کی طرف بڑھا دیا۔

''آنکھ دھوکا ہے، دل فریب کھا جاتا ہے، ذہن مان جاتا ہے۔'' وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بول رہا تھا۔ ''زندوں کو مُردہ سمجھ لیا جاتا ہے، زندوں کی قدر نہیں کی جاتی، مرنے والے کی قبر پر پھول چڑھائے جاتے ہیں، اپنے دل کو ٹٹولو، اس کی گواہی سچی ہے۔'' حوریہ نے دیکھا وہ مجذوب کپڑوں کا بیگ لے کر قبرستان کی جانب چل دیا۔

''بوا آپ کو بتانا پڑے گا کہ یہ قبریں کس کی ہیں؟'' حوریہ نے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

''تم کہتی تھیں نا کہ گھر میں تم نے کبھی کوئی ڈرائیور نہیں دیکھا۔ یہ میرے ڈرائیو کی قبر ہے۔''

وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی جیسے کہ بوا کی ذہنی رو بہک گئی ہو۔

''ہاں حوریہ عبدالرحمٰن...... فیض الحسن میرا ڈرائیور اور تمہارا انکل تھا۔'' انہوں نے کہا تو حوریہ کو یک دم بریک لگانے پڑے۔ گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔ گاڑی اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی۔ بوا کی آنکھوں میں تیرنے والی نمی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آہ بھرتی ہوئی بولیں۔

''فیض الحسن میرے شوہر تھے اور مراد الحسن میرا بیٹا۔''

☆=====☆=====☆

ڈھولک کی تھاپ پر ناچتے ناچتے اس کے پاؤں شل ہو رہے تھے۔ سردی بھی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ اس کا ساتھی بھی بڑی جان سے ڈھول پیٹ رہا تھا۔ اس کا ناچ دیکھنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ پیسے پھینک رہے تھے۔ ڈھول کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ناچتے ہوئے قدم بھی تیزی سے ٹھنڈی سڑک کو روند رہے تھے اور پھر ڈھول کی آواز یک دم رک گئی۔ شاید ساتھی سمجھ گیا تھا کہ اب وہ مزید ناچے گا تو گر جائے گا اور وہی ہوا'

ڈھول کی آواز رکتے ہی اس کے قدم بھی رک گئے تھے اور وہ نڈھال ہو کر سڑک پر بکھرے ہوئے پیسوں پر گر گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ڈھول کی آواز بند ہو گئی تھی۔ ورنہ وہ آج شاید مر جاتا مگر وہ کیسے مر سکتا تھا اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حج کر کے ہی مرے گا۔

اس کا ساتھی بکھرے ہوئے پیسے سمیٹ رہا تھا۔ اس نے اسے بھی اٹھایا اور پیسے سمیٹ کر گھر کی راہ لی۔ تماشا ختم ہو چکا تھا، لوگ اپنے اپنے گھروں کو یا اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ کسی نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی تھی کہ وہ کیوں ناچتا ہے؟ بس اپنا دل راضی کیا اس کا ناچ دیکھا اور چلتے بنے۔ وہ چلتے ہوئے گھر پہنچ گئے تھے۔ اس کے ساتھی نے ڈھول کو ایک طرف رکھا اور اس کو کندھوں سے پکڑ کر بٹھایا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا تھا۔ جیسے کہ خارج ہونے والی توانائی جمع کر رہا ہو۔

''پپو!'' وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے ایک گلاس پانی پلا دے یار۔''

پپو نے پانی کا گلاس گھڑے سے بھر کر اس کی طرف بڑھایا اور کرب سے بولا۔ ''کیوں اپنی جان کو ''وختوں'' میں ڈالا ہوا ہے؟ میں اب بھی کہتا ہوں یار واپس چلتے ہیں۔ یہ عشق یہ معرفت کی منزلیں ہم طے نہیں کر سکتے۔''

وہ تڑپ کر اٹھا اور اس کی طرف اذیت ناک نظروں سے دیکھا۔

''روزِ محشر مرشد کو شرمندہ کرا دوں؟''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے یار!'' وہ شرمندگی چھپانے لگا۔

''دیکھ پپو...... میں جس راہ پر چل رہا ہوں۔ اس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر تم دکھوں کی اس رہ گزر میں کٹھن منزل کی طرف میرے ہم سفر بننا چاہتے ہو تو خاموشی سے سفر طے کرتے رہو۔ عشقِ حقیقی کی منزلیں اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتیں۔'' وہ نم دیدہ لہجہ چھپانے کی کوشش کرنے لگا تھا مگر آنسو تو زندان سے باہر نکلنے کا بہانہ چاہتے ہیں۔ آنکھوں کے قید خانے میں رہنا ان کے بس سے باہر ہے کسی نہ کسی بہانے قید و بند کی زنجیریں توڑتے ہوئے غمی اور خوشی کے موقع پر اپنی آمد کا اعلان کر کے انسان کی بے بسی کا تماشا دیکھنے لگتے ہیں۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا، وہ اپنے جذبات پر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ برسات بن کر بہنے والے آنسوؤں کو ''قادر'' نے بہنے دیا۔ ان کے سامنے بند باندھنا فضول اور بے معنی تھا۔ کافی دیر بعد جی ہلکا ہوا تو پپو پھر بول پڑا۔

''مگر...... مرشد نے ایک اور بھی بات بتائی تھی کیا تو بھول گیا ہے قادرا۔''

''مرشد کی بتائی ہوئی تمام باتیں مجھے ازبر ہیں۔ میں ان کا دیا ہوا سبق کبھی بھی بھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر وہ وقت کب آئے گا جب ہم شہید ہوں گے۔'' پپو بے صبرا ہو رہا تھا۔

''مصائب و آلام کا نام ہی امتحان ہوتا ہے۔ پریشانیوں اور دکھوں کا نام ہی دنیا ہے۔ بس مرشد نے فرمایا ہے تو سچ اور حق فرمایا ہے۔ وہ وقت کب آئے گا یہ تو اللہ سوہنا ہی جانتا ہے۔ دیکھ...... اِدھر...... میری طرف اچھا بھلا کھاتا پیتا گھرانہ چھوڑ کر اس راہ میں کیوں نکل کھڑا ہوا؟ بس اس دنیا کی منافقت اور نام نہاد بھائی چارے سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اک اللہ والے کے سنگ یاری لگائی۔ اسی کو نبھانے کی تگ و دو میں جو لطف اور مزہ محسوس کیا ہے وہ دنیاداری میں نہیں ہے۔ لوگ مجھے آج ہیجڑا سمجھتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ایم اے اردو یہ نوجوان بھرپور مردانہ وجاہت کا نمونہ ہے، بس عشق نہ پچھے ذات اور نہ دیکھے دن رات۔ اب ڈیوٹی لگی ہے تو نبھانے کی کوشش مرتے دم تک کروں گا، ان شاء اللہ۔''

پورے ہجویری محلہ میں لوگ اسے ہیجڑا سمجھتے تھے۔ ان کو مذاق اور ٹھٹھا کرنا لوگوں کا معمول تھا۔ وہ کسی کی بات کا بھی برا منائے بغیر اپنے ''فرض'' کی تکمیل میں مشغول تھے مگر ایک گھر ایسا بھی تھا جو کسی بھی طور پر اسے ہیجڑا نہ مانتا تھا۔ بس وہ گھر کی واحد شخصیت تھی جو والدین اور بھائی کی مرضی کے خلاف ان کے گھر آتی جاتی تھی۔ بالکل سامنے ہی کھڑکی میں بیٹھ کر ان کی باتیں سنتی، ان کی باتوں کے جواب دیتی تھی۔

''رانی'' نام کی یہ سترہ اٹھارہ سالہ الہڑ مٹیار قادر پر اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ پورا محلّہ جانتا تھا کہ قادر ایک ہیجڑا ہے مگر رانی کا دل کہتا تھا کہ وہ ایک بھرپور مرد ہے۔ اس نے یہ بھیس کسی خاص مقصد کے لیے ہی بدلا ہوا ہے۔ بس وہ اپنے دل کی مان رہی تھی۔ اب بھی وہ قادر اور پپو کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''میں نے تمہاری تمام باتیں سن لی ہیں۔'' پپو دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ رانی نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ قادر نے گھبرا کر پپو کی طرف دیکھا مگر اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

''کیوں مجھے اور خود کو دھوکا دے رہے ہو قادر۔'' اس سے پہلے وہ قادر کو ''راجی زنانہ'' کے نام سے جانتی تھی۔ مگر آج اس کے دل کی گواہی سچ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ یک طرفہ عشق کی سیڑھی پر پاؤں رکھ چکی تھی۔ اب تو یہ بات پوری طرح سچی ثابت ہو گئی تھی کہ قادر ''راجی'' نہیں

ہے بلکہ ایم۔اے پاس مرد ہے۔ اس کی باتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے اور مرشد کے حکم پر بھیس بدل کر گھنگرو باندھ کر قادر سے راجی بن گیا ہے۔ یہ بہت گہری اور دلچسپ کہانی تھی جو ابھی تک صرف پپو اور قادر کو ہی معلوم تھی۔ رانی ان باتوں سے بے خبر تھی جوان کے بھیس بدلنے کے پس پردہ پوشیدہ تھیں۔

"کیا سن لیا ہے تم نے؟" قادر کا لہجہ راجی جیسا ہو گیا تھا مگر اس کی لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ دلی اور ذہنی طور پر رانی سے ہار گیا ہے۔ رانی نے اس کی چوری پکڑ لی ہے۔

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ تم کون ہو؟" اب وہ باقاعدہ اندر آ گئی تھی۔

"لیکن میں اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ میرا دل سچا ہے یا جھوٹا۔"

"کس معاملے میں" اس بار پپو بول پڑا تو قادر نے اس کی طرف دیکھ کر اس کی بات کی تائید میں اپنا سر ہلایا اور بولا۔

"ہاں...... ہاں۔ کس معاملے میں اپنے دل کی گواہی مانگ رہی ہو؟"

"سب سے پہلے تو قادر بن کر مجھ سے بات کرو، وہی قادر جسے میں دل و جان سے چاہتی ہوں اور وہی قادر جو چند لمحہ پہلے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تقریر کر رہا تھا۔"

وہ ان پر پوری طرح حاوی ہو چکی تھی مگر قادر اسے مسلسل نظر انداز کرتا آ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ محلہ بھر میں رانی ہی واحد ہستی ہے جو ان کی طرف پیار اور توجہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے دیکھنے میں کچھ نہ کچھ "خاص" ضرور تھا۔ آج اس کی چوری پکڑی گئی تھی اور رانی کے دل کی بات بھی زبان پر آ گئی تھی، وہ پھر بولی۔

"قادر......! میں نے دن رات تمہاری پوجا کی ہے۔ میں نے دل کے مندر میں تمہیں بھگوان بنا کر پوجا ہے، میری پیاسی آتما تمہاری دید کے درشن سے اپنے من کی پیاس بجھانا چاہتی ہے۔ قادر میں اپنا دین دھرم سب کچھ چھوڑ چھاڑ دوں گی ایک بار میری طرف پیار سے تو دیکھو، صرف ایک بار......"

مگر اس کی باتوں پر کان کون دھر رہا تھا۔ وہ تو دور خلاؤں میں گھورنے لگا تھا۔ اسے آج پتا چلا تھا کہ رانی کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ وہ مذہبوں کی جنگ نہ چاہتا تھا اور ویسے بھی وہ اس دنیاوی عشق اور محبت سے دور بھاگتا تھا۔ رانی اس کے لیے اپنا دھرم تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں اتنا اہم تو نہیں ہوں کہ میری خاطر اپنے ماں باپ بہن بھائی حتیٰ کہ مذہب بھی بدل لیا جائے۔ کیوں گناہ گار کر رہی ہے یہ مجھے۔ وہ یہ سوچ کر کانپ

کر رہ گیا۔

"میں ایک عام سا انسان ہوں رانی!" وہ اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "تمہارا دھرم کیا ہے؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ آج کی بات نہیں ہے میں نے کبھی بھی تمہیں پیار کی خاص نظروں سے نہیں دیکھا۔ مجھے پوج کر مجھے مندروں کا دیوتا بنا کر تم نے تو غلطی کی ہے مگر میں بھی اپنے رب کو منہ دکھانے جوگا نہیں رہا۔ تمہیں تمہارے بھگوان کا واسطہ مجھے انسان ہی رہنے دے۔"

یہ کہہ کر وہ رانی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ رانی دل کی گہرائیوں سے اس کی طرف متوجہ تھی۔ آج پہلی بار قادر اس کے سامنے اور وہ قادر کے سامنے کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ قادر بولتا رہے اور وہ سنتی رہے بس یہی میری زندگی ہو۔

"ہمارے مذہب میں یہ تمام باتیں شرک کے زمرے میں آتی ہیں، ہم ایک اَن دیکھے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ جسے ہم نے نہیں دیکھا مگر ہمارا یقین اور اعتقاد ہے کہ وہ ہمیں کائنات کے ہر ذرے سے دیکھتا ہے اور محبت سے دیکھتا ہے۔ ہم اس کی بارگاہ میں سجدہ ادا کرتے ہیں تو وہ فرشتوں سے کہہ اٹھتا ہے۔ دیکھو یہ ہیں میرے بنائے ہوئے انسان۔ جنہوں نے مجھے دیکھا بھی نہیں اور میری واحدانیت کا پرچار کرنے کے لیے میرے حضور سجدہ ریز ہیں۔"

"میں مذہب اور تہذیبوں سے بالا ہو کر تم سے عشق کرتی ہوں اور اپنے بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں۔ اگر مجھے اپنا دھرم بھی بدلنا پڑا تو بدل لوں گی۔ بس قادر...... مجھے اپنا لو، میرے عشق کو مت ٹھکراؤ۔ میں تمہاری داسی بن کر تمام عمر تمہارے چرنوں میں گزارنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ منت سماجت پر اتر آئی تھی۔ مگر قادر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ جھجک گئی۔

"میری خاطر! اپنے اجداد کا مذہب چھوڑ رہی ہو۔"

"نہیں عشق کی معراج کو بلند رکھنے کے لیے۔"

"مگر میں تو تم سے عشق نہیں کرتا۔" وہ اب رانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "میں تو اپنے سوہنے اور سچے رب سے عشق کرتا ہوں۔"

"تجھے تمہارے سوہنے اور سچے رب کا واسطہ قادر...... اک بار میری طرف محبت سے تو دیکھ۔"

''دیکھ تو رہا ہوں۔''

''نہیں قادر..... محبت، محبت کی نظریں پہچانتی ہے۔ دل، دل کے ارادے کو جانتا ہے، آنکھیں آنکھوں کی نیت پڑھ لیتی ہیں۔ میں انجان نہیں ہوں قادر۔ میں نے ایک دن بھی ایک بار بھی اپنے لیے تمہاری نظروں میں محبت کا پیغام نہیں پڑھا ہے۔''

''میری محبت اور میرا عشق۔ امتحان مانگتا ہے رانی۔ دیکھ میری طرف..... قادر علی سے راجی زنانہ بن کر پاؤں میں گھنگرو باندھ لیے ہیں۔ گلی گلی، قریہ قریہ ننگے پاؤں ناچتا ہوں، درد اور تکلیف سے میرے پاؤں کے چھالے پھٹ جاتے ہیں مگر میرے لبوں سے کبھی بھی شکوے کے طور پر آہ نہیں نکلی، کیوں.....؟ اس لیے رانی کہ یہ میرے مرشد کا حکم ہے میں بھی رب تعالیٰ سے عشق کا دعویدار تھا۔ ایک فقیر سے ملا اس نے دل کی دنیا بدل دی۔ خداوند کریم کا گھر دکھایا۔ ہزاروں میل دور سے اس گھر کو دیکھنے کے بعد دل میں خواہش ہوئی عشق پیدا ہوا کہ اس گھر کو پاس سے دیکھوں۔ اسے چھو کر دیکھوں، اس کی چوکھٹ پر اپنا سر رکھ کر اپنے عشق پر مہر ثبت کرواؤں، مگر..... تم جانتی ہو رانی..... مرشد نے کیا حکم دیا؟''

وہ زار و زار رونے لگا، اس کے آنسو اس کا دامن بھگونے لگے۔ وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

''رب سے عشق کا دعویدار بنتا ہے؟'' میرے مرشد نے کہا۔ ''یونہی رب رب کرنے سے رب نہیں ملتا۔ اس کے لیے بڑے کڑے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔''

''میں ہر امتحان سے گزرنے کے لیے تیار ہوں مرشد۔'' میں نے کہا تو مرشد مسکرانے لگے۔

''تو پھر تیار ہو جا پہلی آزمائش دینے کے لیے۔ باندھ لے گھنگرو اور چھوڑ دے اپنے علاقے کو۔ جا جا کر ناچ، کما اور کھا اور پھر اگلے امتحان کی آواز آنے تک گھنگرو مت اتارنا۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکا تو پونے آگے بڑھ کر پانی کا گلاس اس کے آگے کیا مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ رانی بڑی محویت سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''اب اگلا امتحان کیسا ہوگا؟ یہ میں نہیں جانتا، کب ہوگا؟ کس روپ میں ہوگا؟ یہ بھی میری عقل سے ماورا ہے مگر میں اپنے رب کے عشق میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ زبان سے لفظ عشق کہنا بہت آسان ہے مگر کرنا اور نبھانا بہت مشکل۔ جاؤ رانی..... واپس چلی جاؤ۔ یہ بہت کٹھن راہیں ہیں۔ ان پر کانٹوں سے بھرے راستے ہی منزل کی جانب بڑھنے کے لیے

کہکشاں کا کام دیتے ہیں۔ اب دوبارہ نہ آنا رانی میری زندگی میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ میں رب تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی انسان کے عشق میں مبتلا ہو جاؤں۔'' یہ کہہ کر اس نے رخ دوسری طرف موڑ لیا۔ گویا کہ اب کوئی بات نہیں کرے گا۔ رانی جھلمل کرتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی واپس دروازے کی طرف مڑ گئی۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن نے اپنی عادت کے مطابق نماز فجر کے بعد قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی۔ وہ بڑی محبت اور لگن سے تلاوت کر رہا تھا۔ وہ رب کریم کی طرف سے محبت کا جواب محبت سے دینے کی کوشش میں مگن تھا۔ اس کے سامنے رحل پر قرآن کریم پڑا ہوا تھا وہ ہلکا ہلکا ہل رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے قرآنی الفاظ سن کر پرندے اپنی چہچہاہٹ بھول گئے تھے۔ بنگلے میں لگے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے خاموش اور باادب ہو کر اس کلام کو سن رہے تھے۔ جو اگر پہاڑوں پر نازل کر دیا جاتا تو وہ روئی کے گالوں کی طرح اُڑ جاتے۔ یہ وہ کلام ہے جس کی قرأت کائنات کا ذرہ ذرہ کرتا ہے۔ یہ وہ کلام ہے جس کے مقابلے میں آج تک کائنات کا کوئی بھی شاعر اس جیسی شاعری نہیں کر سکا۔ اس کی زیر زبر کے مقابل آج تک اپنا کوئی کلام نہ لا سکا تھا اور پھر فیض الحسن کو اللہ تعالیٰ نے محبت بھری آواز دی تھی۔ اس نے تلاوت ختم کی تو دیکھا کہ اس کے کوارٹر کے دروازے پر مالی بابا بیٹھا رو رہا تھا۔

''آج سولہ برس بعد اس گھر سے قرآن کریم کی تلاوت کی آواز سنی ہے۔'' فیض الحسن نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''ہاں! فیض الحسن بڑے ملک صاحب کی وفات کے بعد کسی نے بھی اس مقدس کتاب کو نہیں کھولا۔ بس کبھی کبھار بڑی بیگم صاحبہ پڑھتی ہیں۔''

''مالی چاچا! میری تو عادت ہے۔ بس رب تعالیٰ نے مجھے توفیق دی ہے۔ شکر الحمدللہ!'' یہ کہہ کر فیض الحسن اٹھا اور مالی کے ساتھ ہی باہر لان میں آ کر ٹہلنے لگا۔ پرندے چہچہانے لگے تھے۔ صبح کا اجالا آنکھوں کو سکون بخش رہا تھا۔

''مالی چاچا! کب سے ہو یہاں؟''

''گزشتہ پچیس برس سے خدمت کر رہا ہوں اس گھر کی۔''

''گھر میں کتنے مکین ہیں؟''

''ملک عبدالرحمٰن، ملک عنایت، بڑی بی بی یعنی ان کی والدہ، دونوں بھائیوں کی

بیویاں، ان کے بچے وغیرہ اور ایک ان کی بہن ماہ نور بی بی۔" وہ شبنم سے تروتازہ گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہے تھے۔ فیض الحسن نے بنگلے کی پُرشکوہ عمارت کو دیکھا جس کی پیشانی پر "قصرِ ماہ نور" چمک رہا تھا۔

"تمہیں ماہ نور بی بی کے لیے ہی ڈرائیور رکھا گیا ہے۔" مالی نے انکشاف کیا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ وہ پھر بولا۔ "ہاں...... ملک صاحب کا خیال ہے کہ بی بی گاڑی بہت تیز چلاتی ہیں۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ وہ اپنی بہن سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کے ناز اور لاڈ اٹھاتے ہیں۔"

"ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی ملازم ہیں یا پھر تمام کام ہمیں ہی کرنا پڑے گا؟" فیض الحسن نے مالی سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

"میری طرف دیکھو...... میرا کام صرف میں ہی کرتا ہوں۔ تمہارا کام صرف تم ہی کرو گے۔ شیر خان ہمیشہ گیٹ پر ہوتا ہے۔ راجو اور ملکہ ہمیشہ کچن میں اور صفائی ستھرائی کے لیے پانچ ملازم اور ہیں کوئی بھی ایک دوسرے کا کام نہیں کرتا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب چھ بج گئے ہیں۔ مجھے گاڑی کی صفائی بھی کرنی ہے اور اپنی ڈیوٹی کا آغاز بھی کرنا ہے۔" فیض الحسن نے کہا تو مالی مسکرانے لگا۔

"بس یہی بات ملک صاحب کو اچھی لگے گی کہ تم وقت پر ہر کام کرو۔ تمہاری یونیفارم تمہارے کمرے میں پہنچا دی گئی ہے۔ آؤ میں تمہیں ماہ نور بی بی کی گاڑی بھی دکھا دوں۔ کہیں تم بھولے سے کوئی اور گاڑی دھو ڈالو۔" وہ فیض الحسن کو ساتھ لے کر پورچ کی جانب چل پڑا۔

پورچ میں پہنچتے ہی فیض الحسن کی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ وہ اس گاڑی کو پہچانتا تھا اور کبھی نہ بھول سکتا تھا۔ شہر میں اس کی ملاقات پہلی بار اگر کسی گاڑی سے ہوئی تھی تو وہ یہی تھی۔ تو پھر اس کا مطلب ہے کہ گاڑی والی بھی یہیں ہوگی۔ کیا اس کی مالکن وہی ماہ نور بی بی ہے۔ جو اس کے خوابوں میں آ کر اس کی نیندیں چرا کر لے گئی ہے؟ فیض الحسن سوچوں میں کھویا ہوا گاڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ گویا کہ وہ "شہر کی لڑکی" سے ہم کلام ہونے جا رہا ہو۔ وقت کی نزاکت کا احساس اس کے خوابوں کی تعبیر میں رکاوٹ تھا۔ اس نے گاڑی پورچ سے [illegible] اور [illegible] ابداری میں کھڑی کر کے پائپ لگا کر دھونے لگا۔ وہ بڑی محبت سے گاڑی کو دھو رہا تھا۔ [illegible] کی زندگی کا اہم ترین دن شروع ہونے والا تھا۔ وہ اپنی متاثر کن کارکردگی سے مالکوں

کو زیر کرنا چاہتا تھا۔

گاڑی کی اچھی طرح صفائی کے بعد اس نے تسلی بخش نظروں سے دیکھا اور اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ یونیفارم پہن کر بالکل تیار تھا۔ اس موقع پر اسے صفدر حسین بہت یاد آیا تھا۔ جس نے ایک ماہ میں ہی "پینڈو" کو شہری بننے کے تمام گُر سکھا دیے تھے۔ اگر صفدر حسین اسے پینٹ شرٹ پہننا نہ سکھاتا تو آج یقیناً پریشانی ہوتی۔ دروازے پر دستک سن کر اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی چہرے کو دیکھا جس پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹیں تھیں۔

"ہمارا نام راجو ہے۔ تمہارے لیے ناشتہ لائے ہیں۔" اس نے پلیٹیں آگے بڑھا دیں۔ جو فیض الحسن نے لے لیں۔

"ناشتہ کرنے کے بعد ٹھیک آٹھ بجے گاڑی کے پاس پہنچ جانا۔ یہ ملک صاحب کا حکم ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ فیض الحسن نے ناشتہ کرنا شروع کر دیا۔ گرم گرم چائے پی کر اس کی طبیعت مزید فریش ہو گئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ اچانک اسے لگا کہ ہوا تھم گئی ہو۔ صبح کے اجالے میں چاند سے زیادہ دمکنے والا چہرہ قصرِ ماہ نور کے اندرونی برآمدوں سے طلوع ہو رہا تھا۔ فیض الحسن کی آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کی صدا لگا کر سبھی کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا مگر اپنی کم مائیگی اور موجودہ حیثیت نے سب کچھ بھول بھال کر آنے والی کا خیر مقدم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ وہی تھی، اس دن اس کی زلفیں ہوا سے بکھرنے سے چاند پر ناگن کی طرح قابض ہونے کی جسارت کر رہی تھیں۔ مگر آج سلیقے سے تمام بالوں کو پونی میں باندھا ہوا تھا گویا کہ کسی جوگی نے پٹاری میں کسی ناگن کو قید کر لیا ہو۔ کالج یونیفارم نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ چاند کو بھی ایسے ہی پیرہن کی ضرورت ہے۔ آنکھوں کی گہرائی جھیل کو مات دینے کے لیے بے تاب تھی۔ صراحی دار گردن کسی بے بس اور پیاسے مے کش کا خالی جام بھرنے کو تیار تھی۔

وہ گاڑی کی پچھلی نشست کی جانب بڑھی۔ فیض الحسن نے اپنی کارکردگی دکھائی اور جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ اس نے نئے ملازم کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور سیٹ پر براجمان ہو گئی۔

فیض الحسن گھوم کر دوسری طرف سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا تو ملک عبدالرحمٰن کی

کڑک دار آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''ٹھہرو......فیض الحسن!'' اندر سے ملک صاحب چلے آ رہے تھے۔ رعب اور دبدبہ ان کے پُروقار چہرے سے جھلک رہا تھا۔ رہی سہی کسر ان کی بارعب آواز نے پوری کر دی تھی۔

''آج تمہارا پہلا دن ہے اور پہلا سبق لیتے جاؤ۔''

''جی صاحب۔'' فیض الحسن کی نگاہیں جھک گئیں۔

''ماہ نور ہماری اکلوتی بہن ہے۔ یہ گاڑی بہت تیز چلاتی تھی اور لاپروا بھی ہے تمہیں اسی لیے ڈرائیور رکھا ہے کہ تم احتیاط سے گاڑی چلاؤ۔ ہم کسی بھی حالت میں اپنی بہن کو پریشان یا پھر خفا نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی جان ہمیں ساری دنیا سے عزیز ہے۔''

''جی صاحب۔'' فیض الحسن اتنا ہی کہہ پایا۔ ملک عبدالرحمٰن کی آنکھوں کا اشارہ پا کر اس نے گاڑی کا سٹیئرنگ سنبھالا اور بسم اللہ پڑھ کر گاڑی گیٹ کی طرف احتیاط سے بڑھا دی۔

خوابوں اور خیالوں میں آ کر بسنے والی مہ جبیں ہم سفر تھی۔ اس کی نظریں سڑک پر جب کہ دل پچھلی نشست پر دھڑک رہا تھا۔ پھر اپنی حیثیت کا خیال دل میں ابھرتا تو وہ اداس ہو جاتا مگر یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ اب اس کا ڈرائیور ہے۔ اس کی قربت ہی اس کے لیے کل اثاثہ تھی۔ اب کائنات کی ہر چیز اس کے لیے ہیچ تھی۔ بس جو وہ چاہتا تھا اسے مل گیا تھا۔ اس نے بیک مرر شیشے سے پیچھے دیکھا تو سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اگلے چوراہے سے دائیں طرف موڑ لینا۔'' اس کی نقرئی آواز نے گاڑی میں ماحول مزید خوشگوار کر دیا تھا۔ گاڑی دائیں طرف موڑ کاٹنے کے بعد اب اسی سڑک پر پہنچ گئی تھی جس سڑک پر فیض الحسن کی پہلی ملاقات اس گاڑی اور گاڑی سوار سے ہوئی تھی۔

''کہاں سے آئے ہو......؟'' فیض الحسن کو توقع نہ تھی کہ وہ اس کے متعلق سوال کرے گی۔

''رشید نگر سے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ تو کسی گاؤں کا نام ہے۔'' دوبارہ آواز آئی۔

''جی...... میں گاؤں کا ہی رہنے والا ہوں۔'' وہ عاجزی سے بولا۔

''لگتے نہیں ہو۔''

''بس جی...... آپ کی صحبت کا اثر ہے۔'' اس نے کہنا چاہا مگر وہ کہہ نہ پایا تھا۔ بس اتنا

ہی کہہ پایا۔

''جیسا دیس ویسا بھیس اپنانا پڑتا ہے جی!''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''فیض الحسن۔''

''تعلیم کتنی ہے، کتنے بہن بھائی ہو؟''

''ڈنگر...... ہی ہے۔ اتنے سوال تو اس کے بھائی نے بھی نہ پوچھے تھے۔ اب نوکری پر رکھ کر انٹرویو کر رہی ہے۔'' مگر یہ باتیں اس کے دل میں ہی رہ گئیں اس کی زبان ان الفاظ کی ادائیگی سے محروم تھی۔ وہ اپنا تعارف کرواتا رہا۔ اس نے منظر علی اور صفدر حسین کا بھی بتایا تھا۔ انہی باتوں میں مگن تھے کہ سڑکوں کی لمبائی چوڑائی کاٹتے ہوئے وہ کالج کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ ماہ نور گاڑی سے اتری اور اسے دوپہر ڈیڑھ بجے کا کہہ کر گیٹ میں داخل ہو گئی۔ فیض الحسن اس کے حسن کے سحر سے نکل آیا تھا۔ اب وہ واپس گاڑی کو قصر ماہ نور کی طرف بھگائے جا رہا تھا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ اگر وہ زمین پر کھڑا ہوتا تو یقیناً پاؤں نہ ٹک رہے ہوتے۔ اس بات کا ثبوت گاڑی کی رفتار تھی۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ واپس اپنے کوارٹر کی طرف آ رہا تھا کہ ایک میٹھی نسوانی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''بات سنو بیٹا......'' اس نے دیکھا کہ ایک پُروقار عورت لان میں بچھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ فیض الحسن نے سوچا یہ بھی کوئی مالکن ہی ہو گی۔ اس نے قریب جا کر ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

''ہم عبدالرحمٰن کی والدہ ہیں۔ ماہ نور کی بھی والدہ ہوئیں۔ باپ کی وفات کے بعد عبدالرحمٰن نے اپنی بہن کو کوئی بھی دکھ نہیں آنے دیا۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بس ہماری بیٹی کو بحفاظت لانا اور لے جانا تمہاری ذمہ داری ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں بی بی جی۔ میں ان شاء اللہ ماہ نور بی بی کو کوئی پریشانی نہیں آنے دوں گا۔'' فیض الحسن نے محسوس کیا تھا کہ یہ الفاظ اس کے دل سے نکلے ہیں۔

''مجھے ان تکلفات سے نفرت ہے۔'' وہ پھر بولیں۔ ''بی بی جی، مالکن، صاحب وغیرہ۔ بس تم بھی مجھے تمام ملازموں کی طرح ''ماں جی'' کہہ لیا کرو۔ اب جاؤ اور وقت پر

میری پھول جیسی بچی کو کالج سے لے آنا۔"

"جی ماں جی!" فیض الحسن سعادت مندی سے جواب دے کر واپس مڑ گیا۔

وہ اپنے کوارٹر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ راجو آ گیا۔ "تمہیں بڑے ملک صاحب بلا رہے ہیں۔"

"بڑے.....؟" اس کے لہجے میں تحیر تھا۔

"ہاں بڑے..... ملک عبدالرحمٰن صاحب۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

"اس نے جلدی سے اتاری ہوئی ٹوپی پہنی اور ملک عبدالرحمٰن کی عدالت میں حاضر ہونے کے لیے نکل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ تمام فیملی لان میں جمع ہے۔ فیض الحسن نے نگاہیں جھکا کر سب کو سلام کیا اور باادب ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"فیض الحسن.....!" اپنا نام ملک عبدالرحمٰن کی زبان سے سن کر اس کی آنکھیں کچھ لمحہ کے لیے اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

"اس گھر میں کوئی کتا نہیں ہے۔" عبدالرحمٰن کی زبان سے یہ سن کر وہ سن ہو کر رہ گیا۔

"ہم نے اپنی اس چھوٹی سی دنیا کے لیے کوئی بھی کتا نہیں رکھا کیوں کہ آج کل نسلی کتے ملتے ہی کم ہیں۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش میں اپنی توہین مت سمجھنا کیوں کہ تمہارا بہت گہرا تعلق اس بات سے ہے۔" ملک عبدالرحمٰن کچھ لمحے کے لیے خاموش ہوئے تو وہ جی کڑا کر کے پوچھ بیٹھا۔

"میں کم علم بندہ ہوں جی۔ آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"تمہیں منظر علی کی وجہ سے اس گھر میں رکھا گیا ہے۔ منظر علی کو ہم بہت دیر سے جانتے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ تم سے بھی کوئی شکایت نہ ہوگی کیونکہ تم بھی منظر علی کی طرح کسی نسلی خاندان سے تعلق رکھتے ہو گے۔ یاد رہے تم ماہ نور کے "ڈرائیور" ہو۔ ہر وقت کسی بھی وقت تم ہی گاڑی ڈرائیو کرو گے۔ ماہ نور چاہے کتنی ہی ضد کیوں نہ کرے۔ وہ اسٹیئرنگ پر نہیں بیٹھنی چاہیے۔" یہ کہہ کر ملک صاحب خاموش ہوئے تو وہ ان سب کے چہرے دیکھ کر رہ گیا۔ جن پر اس سربراہ کی دہشت جمی ہوئی تھی۔ ان میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ دو عورتیں نوجوان اور خوبصورت تھیں ان کی گودوں میں ایک ایک بچہ تھا جب کہ ایک ماں جی تھیں۔ ایک مرد جو کہ عبدالرحمٰن صاحب کی شکل سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتا تھا۔ غالباً اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ ان دو عورتوں میں سے ایک اس کی بیوی اور دوسری بڑے ملک کی بیوی ہو گی۔ یہ

فیض الحسن کا اندازہ تھا۔ صحیح یا غلط اس بات کا فیصلہ مالی چاچا نے کرنا تھا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔ یہ ہماری تمام فیملی ہے مگر ماہ نور سے مکمل ہوتی ہے۔" وہ ملک عبدالرحمٰن کی بات سن کر نظریں جھکائے واپس مڑ آیا۔

اپنے آپ کو ان حالات اور ماحول میں ڈھالنا ہوگا۔ اس سے اچھی ملازمت اسے کہاں ملے گی۔ ملک صاحب نے اگر ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کی بے عزتی خراب کی ہے تو کیا ہوا۔ وہ مالک ہیں اور میں نوکر ہوں۔ نوکر تو نوکر ہی ہوتا ہے۔ چھ سو روپے اور پھر شہر کی لڑکی سے دن رات باتیں۔ اس کا دیدار ہی دیدار۔ دل کو انجانا سا سکون ملتا تھا حالانکہ اس کے اور ماہ نور کے درمیان سب سے بڑی دیوار دولت کی تھی مگر دل تو بیوقوف تھا، ڈنگر تھا، کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ بس اس کے لیے مچل رہا تھا، چاند کی طلب کر رہا تھا، زمین پر کھڑے ہو کر آسمان کو چھونے کی لگن کرنے لگا تھا، اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے، اسے اپنے اور ماہ نور بی بی کے درمیان عزت و تکریم کی دیوار کو قائم رکھنا ہوگا۔ ورنہ وہ اس نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ پھر باپ کی جائیداد جو کہ ایک مکان کی صورت میں گاؤں کے زمیندار کے پاس گروی تھی، اسے کبھی نہ چھڑا سکتا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے پُرسے اور دلاسے دینے لگا۔ سٹیٹس اور زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے لگا کئی گھنٹوں کے بعد دلِ ناداں سمجھا۔ تو اس نے مطمئن ہو کر گھڑی کی طرف نظر دوڑائی ابھی کالج آف ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس نے اپنی یونیفارم درست کی اور گاڑی نکالنے کے لیے پورچ کی جانب چل پڑا، ایک الہڑ سی دوشیزہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں وہ کوئی مجسمہ لگ رہی تھی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ فیض الحسن اس اچانک افتاد سے گھبرا کر آگے بڑھنے لگا تو اس نے اپنی ٹانگ آگے کر دی فیض الحسن گرتے گرتے بچا تھا۔ اسے اپنی طبیعت پر قابو رکھنا تھا پتا نہیں وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی، دل کو بھی سنبھالنا تھا، اس کی ہنسی نے نقرئی ماحول بنا دیا تھا۔

مگر فیض الحسن راستہ بدل کر نکل گیا۔ اس کے پاس اب وقت کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور ادھر اُدھر نظریں گھماتا ہوا گاڑی گیٹ کی جانب بڑھاتا لے گیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو رکنے کا کہا۔ فیض الحسن نے گاڑی روک دی تو وہ کھڑکی سے منہ اندر داخل کرتے ہوئے بولا۔

"ام شیر خان ہے۔ ادھر چوکیداری کرتا ہے۔ ام کو مالی بابا نے بتایا تم بہت اچھا بندہ

ہے۔ ہم تمہاری قدر کرتا ہے۔ بس اگر وہ تمہاری قدر کرتا ہے تو ام بھی کرتا ہے۔ ہم نے سنا ہے تم قرآن شریف اچھا پڑھتی ہو۔"

اس نے اچھے بھلے فیض الحسن کی جنس بدل دی تھی۔ وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکا اور سر ہلا کر گاڑی آگے کی بڑھا دی۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں کالج کے گیٹ پر پہنچ گیا تھا۔ یہ یقیناً شہر کا مہنگا ترین کالج ہوگا کیوں کہ اور بھی بہت ساری گاڑیاں موجود تھیں۔ جو یقیناً کسی نہ کسی کو لینے کے لیے ہی وہاں کھڑی تھیں۔

ماہ نور اپنی کسی کلاس فیلو کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی ہوئی خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ فیض الحسن نے دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اس وقت حیران رہ گیا جب اس کی سہیلی بھی اسی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے دروازے بند کیے اور سٹیرنگ سیٹ سنبھال لی۔

"ہاؤ، ہینڈسم...... یار میں تو کہتی ہوں مجھے دے دو۔" اس کے کانوں میں سہیلی کی آواز پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ پہلے الفاظ تو اس کی سمجھ سے بالاتر تھے مگر نہ جانے ماہ نور کے پاس کون سی چیز تھی جو وہ مانگ رہی تھی۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوئلوں میں سے ہی ہیرا نکلتا ہے۔" یہ ماہ نور کی آواز تھی۔

"مگر اس پر تو کوئلوں کا رنگ نہیں چڑھا ہوا کیوں کہ یہ پیدائشی ہی ہیرا ہے۔ بس اس کی تراش خراش ضروری ہے۔"

"کم آن یار...... میں خود ہی تراش لوں گی۔" وہ بے صبری ہو رہی تھی۔ فیض الحسن نے بیک مرر سے دیکھا تو حیران رہ گیا کیوں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی بھی چیز نہ تھی۔ تو پھر یہ کس چیز پر جھگڑ رہی ہیں؟ اسی کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ وہ محتاط انداز سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ڈبل سڑک پر پہنچ گیا تھا۔

"یہاں سے دائیں موڑ لینا۔ شمسہ کو ادھر ڈراپ کرنا ہے۔" ماہ نور کی آواز پر اس نے سر کے خفیف اشارے سے جواب دیا۔

"یہ بولتا نہیں ہے کیا......؟" سہیلی کی جوشیلی آواز نے اسے بتا دیا کہ یہ پہلی باتیں بھی اسی کے متعلق ہو رہی تھیں۔

"ابھی نیا نیا شہر آیا ہے۔ ابھی اس رنگ میں ڈھلنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ تم دیکھنا ایک دن بڑوں بڑوں کی بولتی بند کر دے گا۔"

اس بات نے اس کے چہرے پر پسینہ نمودار کر دیا تھا۔ ماہ نور اس کے بارے میں کیسے

جذبات اور خیالات رکھتی تھی۔ ابھی تو اس کی پہلی ملاقات تھی یعنی کہ ملازمت کا پہلا دن تھا۔ آزمائش شروع ہونے والی تھی یا پھر شروع ہو گئی تھی۔ وہ لرز کر رہ گیا کیوں کہ وہ امیر لوگوں کی پہنچ کو جانتا تھا۔

"بس یہیں روک دو۔" یہ آواز سن کر اس نے گاڑی روک دی۔ شمسہ کی کوٹھی سڑک پر واقع تھی۔ یقیناً لاکھوں روپے مالیت کی ہوگی۔ فیض الحسن نے اندازہ لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں۔" اس نے شیشے سے دیکھا تو ماہ نور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جی نہیں...... بس آہستہ آہستہ سب کے مزاج سے شناسا ہو جاؤں گا۔" اس نے اپنی دانست میں اچھا جواب دیا۔

"تمہیں سب کے مزاج سے آشنا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ فیض الحسن سوچنے لگا کہ کوئی اور بھی بات ہوگی۔ مگر باقی راستے خاموشی ہی رہی۔ گاڑی قصرِ ماہ نور میں داخل ہو چکی تھی۔ فیض الحسن نے اس کی طرف آ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ خود ہی باہر آ گئی تھی۔ فیض الحسن کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اس نے کچھ توقف کیا اور اس انداز سے بات کر کے آگے بڑھ گئی کہ دور سے کسی کو بھی یہ اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی بات ہوئی ہے۔

"انسانوں کے لیے جھکے ہوئے سر ہمیں ناپسند ہیں۔" وہ کب کی جا چکی تھی۔ مگر فیض الحسن اس کی عظمت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس نے گاڑی اپنی جگہ پر لگائی اور اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا۔ راجو اس کے لیے کھانا لے کر آیا تو اس کے ساتھ وہ قتالہ بھی تھی جو پورچ میں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ملکہ ہوگی۔ وہ واقعی حسن کی ملکہ تھی۔ مگر نوکرانی تھی۔ اس کے حسن کو اس کے عہدے نے ماند کر دیا تھا۔ اس کی خوبصورتی کے چاند کو غربت کے گرہن نے گہنا دیا تھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی مگر فیض الحسن نظر بچا گیا۔

"لو بھئی...... کھانا کھا لو۔ ملکہ بعد میں آ کر برتن لے جائے گی۔" راجو یہ کہہ کر برتن رکھ کر جانے لگا تو اس نے ملکہ سے کہا۔

"بس کر...... بس کر...... اب میرے بعد اس غریب کو بھی ڈبونے کا ارادہ ہے۔ چلو جلدی کرو۔ ماہ نور بی بی کو بھی کھانا دینا ہے۔" وہ بازو سے پکڑ کر ملکہ کو گھسیٹنے والے انداز میں پکڑ کر لے گیا۔ فیض الحسن نے یونیفارم اتاری، کپڑے تبدیل کر کے ہاتھ منہ دھویا اور کھانا کھا

کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ کچھ دیر ستانے کے لیے لیٹ گیا تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ تو مزید سونا چاہتا تھا مگر اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ملکہ کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا۔ ملکہ کی نظریں بدلی ہوئی لگ رہی تھیں۔ یہ تو ایک عجوبہ ہی تھا کہ وہ صرف اتنا ہی کہہ کر واپس چلی گئی۔

''ماہ نور بی بی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔'' فیض الحسن کے لیے یہ حکم بم سے کم نہ تھا، کیوں کہ وہ بغیر یونیفارم تھا اور ملک صاحب کا حکم تھا کہ وہ یونیفارم کے بغیر گاڑی ڈرائیو نہیں کرے گا۔ اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور کام ہو۔ پہلے پوچھ لیا جائے اگر کہیں جانا ہوا تو یونیفارم پہن لی جائے گی۔ وہ اپنے حلیہ کو درست کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دور لان میں ماہ نور اکیلی کرسی پر بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے پاس جا کر سلام کیا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''شمسہ کی کسی بھی بات کا برا مت ماننا۔'' اس نے لگی لپٹی رکھے کیے بغیر سیدھی سی بات کر دی۔

''مجھے تو ان کی کوئی بات سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔ پھر برا کیسا ماننا جی...... میرے لیے تو وہ بھی آپ کی طرح قابلِ احترام ہیں۔'' فیض الحسن کی سادگی بھری بات نے ماہ نور کو ایک بار پھر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تمہاری تعلیم کتنی ہے......؟''

''بس جی...... تین چار جماعتیں ہی پڑھ سکا ہوں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ قرآنِ کریم پورا پڑھا ہوا ہے۔''

''تمہاری باتیں تو پڑھے لکھوں جیسی ہوتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم جیسے لوگ جو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں مگر باتیں سقراط، بقراط اور ارسطو کی طرح کرتے ہیں۔ وہ خطرناک لوگوں کی نشاندہی ہے۔'' ماہ نور کی یہ بات اس ''ڈنگر'' کے پلے نہ پڑی تھی۔ وہ بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کر گیا۔

''یہاں...... کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟'' اس سوال نے فیض الحسن کو آنکھیں اٹھا کر ماہ نور کے چہرے کی دید کرنے کی جسارت بخش دی تھی۔ انتہائی معصومیت اور اجلا چہرہ لیے وہ حور لگ رہی تھی۔

''جی نہیں...... ابھی تک تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

''ہوگی بھی نہیں۔'' وہ کرسی سے اٹھتی ہوئی بولی۔ ''اگر بڑے بھیا کی منشاء پر چلو گے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر عمارت کی جانب بڑھ گئی۔ فیض الحسن واپس اپنے کوارٹر آ گیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی امیرزادی لاکھوں روپے کی مالک اس کی مالکن کو اس کی پریشانی سے کیا غرض ہونی چاہیے۔ گاؤں میں تو زمیندار نے کبھی بھی اس کی خیریت دریافت نہ کی تھی۔ وہ کیوں کرتا وہ زمیندار تھا اور فیضو اس کا ''کاما'' تھا۔ صورتِ حال یہاں بھی مختلف نہ تھی مگر ہو سکتا ہے کہ یہ مالک رحم دل اور ملازموں کا خیال رکھنے والے ہوں۔ ''اللہ دیاں اللہ ای جانے......'' وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا بظاہر تو کوئی کام نہ تھا، وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

☆=====☆=====☆

اَلصَّلوٰۃُ خَیرُ مِنَ النَّوم...... اَلصَّلوٰۃُ خَیرُ مِنَ النَّوم۔ مؤذن کی میٹھی اور محبت بھری آواز نے رانی کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہ ہوا تھا۔ وہ بے سدھ اور بے خبر سوئی رہتی تھی۔ ان مقدس و معطر الفاظ کے معانی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے مگر وہ جان گئی تھی کہ ان میں نامعلوم کشش ہے۔ وہ باقی اذان بھی غور سے سننے لگی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ بھائی نیند کی آغوش میں بے خبر ہو رہا ہے۔ اماں ابا دوسرے کمرے میں ہوں گے۔ سردی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ وہ دبے پاؤں اٹھی اور چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ چھت پر آ گئی تو اس نے دیکھا کہ اتنی سخت سردی میں قادر صحن میں لگے ہوئے نلکے سے پانی نکال کر نہا رہا ہے۔ اس کے جسم پر صرف ایک نیکر تھی۔ اتنی سردی میں قادر پاگل تو نہیں ہو گیا؟ مگر وہ ہر قسم کی سردی اور موسم کی زیادتی سے بے نیاز اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ اسے تو صرف اس بات کا علم تھا کہ اس کا اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے نہانے سے فراغت پانے کے بعد ایک طرف پڑے ہوئے تولیہ سے اپنا جسم پونچھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

اب رانی کی نظروں سے وہ اوجھل ہو گیا تو رانی کی جان پر بن آئی۔ اس نے رات نامعلوم کیسے گزاری تھی۔ وہ تو قادر کو اپنا بھگوان بنا چکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہر لمحہ قادر اس کے سامنے رہے اور وہ آنکھوں سے اس کی پرستش کرتی رہے۔ مگر ایسا ناممکن تھا۔ قادر مسلمان تھا اور اس کے مذہب میں ان چیزوں کو لغو مانا جاتا تھا۔

رانی کی ہمت جواب دے گئی۔ سردی سے اس کا جسم اکڑنے لگا تھا۔ وہ بھاگ کر نیچے آ گئی۔ اس نے قادر کو دیکھنے کی خاطر ایک مشکل فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اپنے فیصلے پر عمل کرنا تھا۔

اس نے چپکے سے ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر گلی میں نکل گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا یہ وہ وقت تھا جب دور دور مساجد ہوتی تھیں۔ آج کے دور کی طرح ہر گلی میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ ہوتی تھی۔ تبھی فرقہ وارانہ فسادات بھی نہ ہوتے تھے۔ اس لیے گلی بھی بالکل خالی تھی اور رانی کے دیکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی قادر کی کھڑکی سے چپک گئی۔ وہ اندر جھانکنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہی تھی مگر مکان ایسی طرز کا تعمیر کیا ہوا تھا کہ اس میں کوئی درز نہ تھی۔ ہاں مگر ایک روشن دان ضرور تھا جس سے اندر کمرے میں جلنے والے بلب کی روشنی باہر آ رہی تھی۔

رانی اس روشندان تک پہنچنے کے لیے کوئی چیز تلاش کرنے لگی مگر اتنی دیر میں اندر سے قادر کی دکھ بھری آواز نے اسے ایک بار پھر کھڑکی سے چپکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ پڑھی لکھی تو نہ تھی مگر پھر بھی اپنی اس حرکت پر خود کو نادم کرنے لگی مگر عشق اندھا ہوتا ہے۔ وہ کوئی بھی دلیل یا کوئی بھی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

یہی حال رانی کا تھا وہ کسی بھی دلیل یا خوف کو بالائے طاق رکھ کر اپنے عشق کو پروان چڑھانے کے لیے ہر طرح کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اس کے کانوں میں پڑنے والی قادر کی آواز نے اس کے ہوش خطا کر دیے۔

''میرے مالک' میں پُرتقصیر، خطاوار، گناہ گار بندہ تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔ میرے مولا میری حاضری قبول فرما۔

''میرے مالک' میرے پیارے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدس پر بے حد اَن گنت درود وسلام کے گجرے اور اس گناہ گار اُمتی کی طرف سے محبتوں بھرا سلام پہنچا کر ان کے درجات مزید بلند فرما۔

''میرے پروردگار میری خطاؤں اور غلطیوں کا کوئی حساب نہیں ہے مگر میرے مولا تیری رحمت بہت وسیع ہے۔ میری ہر غلطی ہر گناہ اور ہر تقصیر کو اپنی رحمت کے سائے میں پناہ عطا کر کے انہیں نیکیوں میں بدل دے۔ میرے مالک مجھے روزِ محشر دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھنا۔'' اب قادر کی آواز پھٹ گئی تھی۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا تھا۔ رانی کے وجود پر بھی لرزہ طاری تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی پتا نہیں وہ سردی تھی یا پھر اَن دیکھے پروردگار کا خوف تھا۔ جو اسے تھرتھراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

''میرے مالک تُو ارحم الراحمین ہے۔ تُو غفور و رحیم ہے۔ میری خطاؤں کی پردہ پوشی

فرما۔ میرے مالک تُو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ میرے اللہ مجھے ہر قسم کی آزمائش سے بچا۔ میں کسی بھی امتحان یا آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔ میرے رب مجھ پر رحم فرما۔ سختیوں کو دور کر کے میری مدد فرما۔''

رانی کے وجود نے اتنی سخت سردی میں پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ قادر کی التجائیں اور سماجتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک اَن دیکھے معبود کو پُوج رہا تھا۔ اس کے خوف اور ہیبت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ روزِ محشر اور دوزخ کی آگ سے خوفزدہ تھا۔ وہ اس معبود کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔ جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا مگر اس کا عقیدہ تھا کہ اس کا رب' اس کا معبود اسے اس کائنات کے ہر ذرے سے دیکھ رہا ہے۔ محبت کی انتہا سے دیکھ رہا ہے مگر قادر کا رونا اور گڑگڑانا اس بات کا ثبوت تھا کہ اگر وہ غفور و رحیم ہے تو جبار و قہار بھی ہے۔

رانی کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ اپنے تھرتھراتے وجود کے ساتھ واپس بمشکل اپنی چارپائی پر پہنچی اور دھڑام سے گر گئی۔ نامعلوم ساعتوں کے لیے گمنام دنیا میں کھو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک کیچڑ زدہ جگہ پر گردن تک دھنسی ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ باہر ہیں، وہ کیچڑ کی دلدل میں ہاتھ مار رہی ہے مگر ہر طرف کیچڑ اور گندگی ہی گندگی نظر آتی ہے۔ وہ ایک نامعلوم اجاڑ جنگل ہے۔ جس کے بیچ یہ دلدل بنی ہوئی ہے۔ اسی تگ و دو میں دور کہیں اسے ایک نورانی ستارہ نظر آتا ہے۔ غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ ستارہ متحرک ہے۔ اسی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ وہ ستارے کو دیکھ کر ہاتھ چلانے لگتی ہے۔ مگر بے سود' وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ اپنی مدد کے لیے چیخ و پکار کرنے لگی۔ اس کی صدا سننے والا کوئی بھی ذی روح آس پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔ تھک ہار کر مایوسی کو اپنا مقدر سمجھنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ستارہ بالکل قریب آ چکا ہے۔ اس نور کے ہیولے کو وہ ایک ستارہ سمجھتی رہی تھی۔ آنکھوں کو چندھیانے والے اجالے میں سے ایک ہاتھ نکلتا ہے۔ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ آگے کرتی ہے مگر کیچڑ میں دفن نامعلوم طاقتیں اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ وہ اسی تذبذب میں مبتلا ہوتی ہے کہ نورانی اجالے سے آواز آتی ہے۔

''پہلے دل کے مندر میں رکھے ہوئے بت کو توڑو...... پھر ہماری طرف رجوع کرنا۔''

اس کے ساتھ ہی نورانی ہیولہ ختم ہو جاتا ہے جب کہ وہ دوبارہ گردن سے بھی نیچے اس دلدل میں دفن ہو جاتی ہے۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو اس کی ماں اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا باپ بھی پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

”نیہ تُو کیا اناپ شناپ بک رہی تھی..... کمبخت.....؟“ ماں نے اس کے آنکھیں کھولتے ہی اسے بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ وہ حیرانگی اور تحیر کے عالم میں اپنی ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا باپ بھی اس کے پاس آ گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر پریشان لگتا تھا۔ مگر ان دونوں کی حیرت دیکھ کر رانی مزید پریشان ہو گئی تھی۔

”تم..... کیا کہہ رہی ہو ماتا جی.....؟“ اس نے ماں سے سوال کر دیا تھا۔

”حرام زادی..... آئندہ تیری زبان پر مسلمانوں کے رب کا نام نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ یاد رکھ یہ گز لمبی زبان کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی۔ کلموہی..... کبھی اپنے بھگوان کا نام بھی اتنی محبت سے لیا ہے؟“ وہ اس پر بھی خاموش نہ ہوئی پھر اس نے مغلظات کا طوفان بکنا شروع کر دیا رانی حیرانگی سے دیکھتی رہی۔ پھر اس کا باپو اس کی چارپائی کے پاس نیچے ہی بیٹھ گیا۔

وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ باپو زمین پر اس کے چہرے کے بالکل سامنے تھا۔ اس کی ماتا جی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ باپو نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔

”دیکھو رانی بیٹی..... میں تمہارا پتا ہوں۔ میں نے تمہیں گود کھلایا ہے۔ میری اچھی بیٹی بن کر مجھے بتا کہ تجھے کس نے ورغلایا ہے؟“

”کس معاملے میں پتا جی؟“ وہ حیرانگی سے بولی تو ماتا جی کے صبر کا پیمانہ پھر لبریز ہو گیا۔

وہ پھر مغلظات بکنے لگی تو رام داس نے اسے جھڑک دیا۔ ”اپنی زبان بند رکھو لکشمی..... مجھے بات کرنے دو..... یا پھر خود بھونکنا شروع کر دو۔“ لکشمی کی زبان بند ہو گئی تھی۔ رام داس پھر رانی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا لہجہ بدستور پُرسکون تھا مگر رانی کے چہرے پر تحیر اور پریشانی نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔

”تم سوتے میں مسلمانوں کے رب کا نام پکار رہی تھی، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے جس نے تمہیں ہندو دھرم سے ورغلا کر مُسلوں کے مذہب کی طرف راغب کیا ہے؟“

”آپ وشواش کریں باپو۔ وشواش کی جو ڈوری آپ کے اور میرے درمیان ہے۔ وہ کوئی بھی [illegible]۔“

رانی کی بات سن کر لکشمی کے اندر سے لاوا ابلنے لگا مگر پتی کی آنکھوں کی گھوری دیکھ کر وہ خاموش ہی رہی۔ ”جب میں بات کر رہا ہوں تو تم اپنی بکواس بند رکھو۔“

”دیکھو رانی! میں تمہارا پتا ہوں اور تم نے کبھی بھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولا، اب بھی جو سچ ہے بول دے، میری بیٹی! میری الجھن کو مزید مت بڑھاؤ۔“

”پتا جی!..... میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اب بھی سچ کہہ رہی ہوں۔ بھگوان کی سوگند..... مجھے کسی نے نہیں ورغلایا اور مجھے علم بھی نہیں ہے کہ میں نیند میں کیا پڑھ رہی تھی۔ وہ اشلوک میں نہیں جانتی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ ماتا پتا کے ماتھوں پر فکر اور پریشانی کی لکیریں مزید گہری ہو گئی تھیں۔ وہ مستقبل قریب میں اپنی بیٹی کو خود سے جدا ہو کر کہیں فضاؤں اور خلاؤں میں گم ہوتا دیکھ رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی بیٹی ان سے چھن رہی ہے۔ ان کے اجداد کے دھرم سے منہ موڑ رہی ہے۔ مگر ایسا کس کے کہنے پر کر رہی ہے؟ گو کہ اس محلہ میں زیادہ تر گھرانے مسلمانوں کے تھے۔ چند گھرانے ان کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کسی پر بھی شک نہ کر سکتے تھے۔ آس پاس کوئی مسجد بھی نہ تھی اور اتفاق سے کسی مولوی صاحب کا گھر بھی نہ تھا جس پر شک کیا جاتا۔

”میں تو کہتی ہوں..... آج ہی پنڈت جی سے مل کر اس کا آسیب اتارنے کی کوشش کریں۔ جوان لڑکی ہے اگر مذہب بدل گئی تو برادری ہم پر تھوتھو کرے گی۔“ لکشمی کی بات نے رام داس کو خیالات کی دنیا سے نکالا۔

”میں آج ہی پنڈت جی مہاراج سے بات کرتا ہوں۔“ رام داس نے کہا۔

”میں تو کہتی ہوں کہ ابھی کے ابھی جاؤ۔ مجھے معاملہ اتنا سیدھا نظر نہیں آتا۔ جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“ لکشمی کی بات میں فکرمندی محسوس کر کے رام داس نے اسی وقت دوسرے گاؤں پنڈت مہاراج کے پاس جانے کی ٹھان لی۔

☆=====☆=====☆

حمود علی نے لائٹ اور تاروں والا بیگ بند کر کے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا۔ کیمرہ اور باقی سامان وہ پہلے ہی رکھ چکا تھا۔ اب جاذب کا انتظار تھا مگر اس نے انتظار کرنے کی بجائے بابا کے کپڑے تبدیل کروانا شروع کر دیے۔ ابنارمل بابا کو بھی اس کی عادت ہو گئی تھی اور پھر حمود علی کا بھی کوئی نہ تھا۔ بس جاذب نے خدا خوفی کے پیشِ نظر گزشتہ دس سال سے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ مووِیز اور مکسنگ کا تمام کام جانتا تھا۔ جاذب کے اسسٹنٹ کے طور پر

کام کرتا تھا۔ گھر میں بابا کی دیکھ بھال اور مووِیز کو کمپیوٹرائزڈ کرنا، اس کی ایڈیٹنگ، ڈبنگ وغیرہ اس نے جاذب سے سیکھ لی تھی۔ اب تمام کام حمود علی اکیلا ہی کرتا تھا۔ جاذب دکان چلاتا تھا جو کہ شہر میں ''فیض مووِیز'' کے نام سے ایک مشہور دکان تھی کیوں کہ بابا کا نام فیض الحسن تھا۔ اسی مناسبت سے دکان کا نام بھی رکھا گیا تھا۔ شہر بھر میں اچھا کام کرنے والوں میں ان کا نام سرِفہرست تھا۔ اعلیٰ ہوٹلوں اور امیر گھرانوں میں جا کر مووِیز بنانا ان کا کام تھا۔

شادی بیاہ و دیگر تقریبات پر مووِیز بنوانے کے لیے امیر لوگ ان سے ہی رابطہ کرتے تھے۔ وقت نہ ہونے کی بنا پر وہ کسی دوسری جگہ سے مووِیز بنواتے تھے۔ ورنہ اولین ترجیح فیض مووِیز ہی تھی۔ جاذب نے تین چار لڑکے بھی رکھے ہوئے تھے جو کام کی زیادتی کی وجہ سے بیک وقت تین چار فنکشنز اٹینڈ کر سکتے تھے۔ اب بھی کسی نے فون پر انہیں فنکشن لکھوا دیا تھا۔ جاذب نے ڈائری میں سے خالی تاریخ دیکھ کر فنکشن نوٹ کر لیا تھا مگر اپنا طریقہ کار بھی بتا دیا تھا کہ وہ ایڈوانس کے بغیر فنکشن نہیں کرتے۔ لہٰذا شام کو ہی ایک بوڑھا ملازم ٹائپ بندہ انہیں ایڈوانس کی رقم دے کر رسید لے گیا تھا۔ اب ان کی تیاری عروج پر تھی۔ جاذب بھی کپڑے تبدیل کر چکا تھا اور حمود علی نے بابا کو کھانا بھی کھلا دیا تھا۔ اب وہ جانتے تھے کہ بابا اپنے کمرے میں اُن کے دیر سے واپس آنے تک سکون سے سویا ہوگا۔

اُنہوں نے وسیع گھر کے ایک کمرے کو مکسنگ رُوم کا نام دیا ہوا تھا۔ جس میں اُن کا بہت سارا سامان طریقے سے پڑا ہوا تھا۔ مکسر کمپیوٹرائزڈ کیمرے، کمپیوٹر، سی ڈیز پلیئر، ٹی وی وغیرہ۔ اس سامان کی مالیت تقریباً نو، دس لاکھ کے قریب تھی۔ یہ سب کچھ جاذب کے کزن کی مرہونِ منت تھا۔ جو پتا نہیں کون سا کاروبار کرتا تھا مگر جاذب اور بابا پر جان چھڑکتا تھا۔ اس کا نام صفدر حسین تھا۔ اس نے جاذب کی تعلیم کے بعد اس کا شوق اور لگن دیکھتے ہوئے اُسے مووِیز کا کاروبار کروایا تھا۔ وہ خود ان سے علیحدہ رہتا تھا۔ جاذب کو بھی علم نہ تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے؟ مگر اُس نے کبھی بھی اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش نہ کی تھی کیوں کہ صفدر حسین اس سے کم از کم اٹھارہ سال بڑا تھا۔ ویسے بھی اس کی متاثر کن شخصیت نے کبھی بھی جاذب کو کسی گلے شکوے کی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔

اُن کی گاڑی پر بھی فیض مووِیز لکھا ہوا تھا۔ حمود اور جاذب کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ حمود ہر لمحہ مذاق اور ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں ہوتا جب کہ جاذب موقع اور مناسبت سے اس کی بات کا جواب اسی کی زبان میں دے دیتا۔ اس کی یہ خوبی تھی کہ کام کے وقت وہ

بالکل سنجیدہ ہوتا تھا۔ کئی مواقع پر کئی لڑکیوں نے حمود اور جاذب کو اپنے موبائل نمبرز دیے، اُن کے کارڈز بھی لیے مگر جب فنکشن ختم، تمام معاملات بھی ختم۔ وہ کسی بھی لڑکی کو لفٹ نہ کراتے تھے کیوں کہ کام کے وقت کام ہی اُن کا منشور تھا۔ اب بھی حمود نے گھر کے گیٹ کو تالہ لگایا اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''باس!......ایک بات تو بتاؤ۔'' گاڑی کے ساتھ ہی حمود کی زبان بھی چل پڑی تھی۔ وہ جاذب کو باس کہتا اور جاذب بھائی کہہ کر پکارتا تھا۔ جاذب سمجھ گیا کہ اب اس کا دماغ خالی ہو جائے گا جب تک وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر نہیں پہنچ جاتے۔ اس لیے وہ بے زاری سے بولا۔

''بکو...... کیا بکنا چاہتے ہو......؟''

''اس طرح بے زاری سے تو نہ دیکھو، کہیں ہماری جان ہی نہ نکل جائے۔'' حمود پٹڑی سے اُتر رہا تھا۔ جاذب خاموش رہا۔ وہ پھر بولا، کیوں کہ اس کے لیے خاموش رہنا مر جانے کے مثل تھا۔

''جس گھر میں ہم جا رہے ہیں، پہلے اُسے دیکھا ہے یا نہیں۔'' یہ سوال کام کے متعلق تھا۔ جاذب بھی متوجہ تھا۔

''اس سے پہلے بھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہم نے وہ گھر دیکھے ہوں مگر اس بار پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم اس علاقہ میں ہی پہلی بار جا رہے ہیں جس جگہ پر یہ گھر واقع ہے۔'' اتنی دیر میں وہ دکان پر پہنچ گئے تھے۔ جاذب گاڑی سے اُتر کر دکان میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ شاکر بڑی تندہی اور توجہ سے دکان داری ہینڈل کر رہا تھا۔ اُسے شاکر پر اعتماد تھا اور شاکر بھی اس کے اعتماد پر پورا اُترنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب رات کے دس بج گئے تھے۔ جاذب اُسے کچھ ہدایات دے کر دکان سے باہر نکل آیا۔ عدنان بک سپاٹ کو تالہ لگا کر جاذب کی گاڑی دیکھ کر اس کی طرف بڑھ آیا۔

''جاذب بھائی......! اگر کوئی نئی کتاب کے شاعر کا پتا پوچھے تو کیا جواب دوں؟'' عدنان نے بائیں آنکھ دبا کر اس سے پوچھا۔

''کس نے پوچھا ہے......؟''

''حوریہ آپی نے۔''

''یہ محترمہ کون ہیں؟''

''وہی...... جس کے ہاتھ سے بابا نے کتب چھینی تھیں۔'' عدنان نے مسکراتے ہوئے کہا

تو جاذب کی آنکھوں کے سامنے حوریہ کا حور نما سراپا گھوم گیا۔

''نہیں...... کوئی ضرورت نہیں ہے کچھ بھی کہہ کر ٹال دینا۔ اگر پتا بتایا تو یاد رکھنا......

جاذب کی دھمکی میں بھی پیار تھا۔ عدنان مسکرا کر دوسری طرف چلا گیا۔ جاذب نے حمود کے برابر والی سیٹ سنبھالی اور گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔

جاذب حمود کو راستہ سمجھاتا جا رہا تھا۔ گاڑی ایک ویران سڑک پر آ گئی تو حمود نے اپنی زبان کو جنبش دینا ضروری سمجھا۔

''باس...... کیا اب ہمارا معیار اتنا گر گیا ہے کہ ہم مُردوں کی ڈاکومنٹری بنایا کریں گے؟''

''مُردوں کی ڈاکومنٹری......؟'' جاذب نے اس کی بات پر حیرت کا اظہار کیا تو حمود کی زبان پر پھر کھجلی ہوئی۔

''پیرومُرشد! ذرا میرے دائیں طرف دیکھ لیجیے تاکہ آپ کو بڑا قبرستان نظر آ جائے۔''

اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ جاذب خلافِ توقع قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

''اُلو کی دُم! یہ شارٹ کٹ راستہ ہے۔ تم دیکھنا ہم جلد ہی اس کالونی میں پہنچ جائیں گے۔'' جاذب نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا تو حمود علی کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا مگر جاذب نے محسوس کیا تھا کہ گاری کی رفتار بھی تیز ہو گئی ہے وہ مسکرانے لگا۔

قبرستان کا علاقہ ختم ہو چکا تھا اور وہ ایک خوبصورت علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ دُور سے ہی اُنہیں لائیٹنگ کا سیلاب نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ جاذب سمجھ گیا کہ اُن کا متعلقہ گھر وہی ہے۔ پوری سڑک پر لائیٹنگ کی ہوئی تھی، یقیناً کوئی بہت بڑی پارٹی تھی۔

''باس! کہیں کم پیسوں میں تو کام نہیں پکڑ لیا۔'' حمود کی زبان نے شک اگلا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ہم اچھا کرنے کے لیے اچھا معاوضہ ہی لیتے ہیں۔ پھر کم یا زیادہ کا مسئلہ نہیں ہے۔'' جاذب سامنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ قطاروں کی قطاریں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک باوردی ملازم گاڑیوں کو پارک کروا رہا تھا۔ ان کی گاڑی کو ملازم نے آگے لے جانے کو کہا۔ حمود ناک چڑھاتا ہوا گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ ایک بالکل الگ تھلگ جگہ پر گاڑی کھڑی کر کے جاذب اور حمود نے کیمروں والے بیگ اُٹھائے اور عظیم الشان کوٹھی کے وسیع تر گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی وسیع و عریض لان شروع ہو جاتا تھا جو اس وقت رنگ برنگی لائٹوں سے عجیب ہی

نظارہ پیش کر رہا تھا۔ عورتوں اور مردوں کی کثیر تعداد نے اس فنکشن کی رونق مزید بڑھا دی تھی۔

جاذب نے اصل عمارت کی پیشانی پر مصنوعی روشنیوں کے بیچ ''قصرِ ماہ نور'' جلتا ہوا دیکھا۔ وہ اس خوبصورتی میں چار چاند لگا رہا تھا۔ جو ملازم جاذب کو ایڈوانس دے کر آیا تھا۔ اس نے جلدی سے اُنہیں ویلکم کیا۔ حمود علی کو الیکٹریشن سے ملوایا تاکہ وہ اپنی لائٹ کی کیبل لگا سکے۔ جاذب نے لان کے درمیان میں عورتوں سے گھرے ہوئے ماحول میں کیمرے کا سٹینڈ لگا دیا۔ اس پر کیمرہ فٹ کرنے کے بعد لائٹ بھی لگا دی۔ اس کا کنکشن حمود کی بچھائی ہوئی کیبل سے کر دیا۔

دوسرا کیمرہ جاذب کے کندھوں پر تھا۔ اس نے لائٹنگ کی ویڈیو بنانا شروع کر دی۔ قصرِ ماہ نور سے آغاز کیا اور پھر آہستہ آہستہ ساری ہی لائیٹنگ کو کور کر لیا گیا۔ اب وہ پُرسکون ہو کر ایک جگہ پر کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

''باس! لڑکی کی مہندی پر اتنا بڑا انتظام......؟''

''بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں کیا ہم تو اپنا کام کریں گے۔'' جاذب نے کہا تو وہ پھر بول پڑا۔

''مگر ابھی تک تو کوئی بھی گھر والا ہمیں ویلکم کرنے نہیں آیا۔''

''اُسی ملازم سے پوچھتے ہیں نا۔ بھائی ہم کس کے گھر آئے ہیں؟ کن لوگوں کی زیادہ فلم بنانی ہے؟ اور کون سے سپیشل مہمان ہیں؟ اس گھر کے داماد کون ہیں؟ اس گھر کے بڑے کون کون ہیں؟ لڑکی کا باپ کون ہے؟ ماں کون ہے؟......

''بس بس باس! میں سمجھ گیا۔'' وہ جاذب کی بات کاٹتے ہوئے بولا تھا۔

''دیکھو حمود بیٹا! جتنے بڑے محل میں اس وقت تم کھڑے ہو۔ اس سے پہلے کبھی بھی اتنا بڑا گھر تم نے دیکھا تھا؟ جاذب اس وسیع تر محل نما گھر سے خاصا مرعوب لگ رہا تھا۔

''نہیں باس۔'' حمود کا مختصر جواب سن کر وہ اس کی جانب حیرانگی سے دیکھنے لگا کیونکہ آج تک اس نے اتنا مختصر جواب کبھی نہ دیا تھا بلکہ لمبی تقریر کر ڈالتا تھا۔

اتنی دیر میں وہی ملازم اُن کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ پاس آ کر جاذب سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کو بڑے ملک صاحب بلا رہے ہیں، کیمرے کے بغیر ہی تشریف لائیں۔'' اس نے جاذب کو ہی مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جاذب اکیلا ہی جائے۔ ابھی کوئی لوکیشن

دیکھنی ہوگی۔ اس کے بعد ویڈیو گرافی یا پھر گھر والوں کا تعارف ہوگا تا کہ ان کی خصوصی طور پر فلم بنائی جائے۔ وہ یہ سوچتا ہوا اس ملازم کی رہنمائی میں چلنے لگا۔ رنگین آنچل اور فیشن کا بازار لگا ہوا تھا۔ ملازم اُسے کوٹھی کے پچھلی طرف سے لے کر جا رہا تھا کیوں کہ فرنٹ پر مہمان براجمان تھے۔ وہ چلتے ہوئے سرونٹ کوارٹروں کے سامنے پہنچ گئے۔ ملازم بڑھتا جا رہا تھا مگر جاذب کو ایک کوارٹر نے پکڑ لیا تھا۔ وہ وہیں جم کر رہ گیا تھا۔ ایک مانوس سی خوشبو اس کے دروازے سے نکل کر جاذب کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ چند ساعتیں عجیب سی صورتِ حال پیدا کر گئیں تھیں۔ اس نے بمشکل قدم آگے بڑھائے اور تھوڑی دور ہی راہداری میں ملازم کو لیا۔

خوبصورت راہداری سے گزرتے ہوئے ملازم چلتا ہوا ایک کمرے کے سامنے رُک گیا۔ اس نے احتیاط اور آہستگی سے دستک دی۔ اندر سے اجازت ملنے پر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جاذب باہر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ چند منٹ بعد وہ باہر آیا تو اس نے جاذب کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

جاذب دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا ماحول اس کے ہوش گم کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ تو بہت بڑا کمرہ تھا۔ گھر کے تمام افراد جمع تھے، ان میں سے ایک مرد آگے بڑھا جس کے چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔ اس کا قد و کاٹھ بتا رہا تھا کہ وہی بڑے ملک صاحب ہیں، اس نے جاذب کو سرتا پا ایک نظر دیکھا۔

''میں ملک عبدالرحمٰن ہوں، اس گھر کا سربراہ، یہ میری پوری فیملی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ گھر میں کسی فنکشن کی ویڈیو فلم بن رہی ہے۔ تمہیں بلوانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ان چہروں کو غور سے دیکھ لو تا کہ تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ ان میں یہ میری بیوی ہیں، یہ میری والدہ، یہ میری بہن، یہ میرے بھائی، یہ ان کی بیوی، یہ ان کا بیٹا، یہ میرا بیٹا اور یہ میری بیٹی اور......'' پھر اُن کی تان ٹوٹ گئی۔ وہ اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کرنے لگے۔ چند لمحات کے توقف کے بعد پھر بولے۔

''میری بھتیجی کی رسمِ حنا ہے۔ کل بارات آئے گی، تمام کام بہترین ہونا چاہیے۔ ہم نے تمہارا بہت نام سنا ہے۔ اپنے نام کی لاج رکھنا اور بہترین کام سے ہمیں جیت لینا۔ اس فنکشن سے تمہیں بہت کام ملے گا۔'' وہ خاموش ہوئے تو جاذب ہمت کر کے بولا۔

''اب اگر آپ کہیں تو کیمرہ لے آؤں تا کہ آپ سب کی ایک بہترین سی سٹل بنا

جائے۔'' ملک نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

''تجھے تو ہر کام افراتفری میں کرنے کی عادت ہے۔ اپنی لاڈلی کو تو آنے دو۔'' یہ بزرگ خاتون کی آواز تھی جو جاذب کے کانوں میں پڑی۔ وہ غالباً ملک صاحب کی والدہ اور اس گھرانے کی بڑی بوڑھی ہوں گی۔ وہ انہی خیالات میں مگن باہر نکلا اور راہداری سے چلتا ہوا سوچ رہا تھا کہ دونوں نوجوان جو کہ تنومند اور خوبرو تھے اور تیسرا مرد جو کہ وجاہت اور دِلکش شخصیت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ بولا تھا۔ کسی نے بھی کوئی بات نہ کی تھی۔ یہ ملک عبدالرحمٰن کی شخصیت کا رعب اور دبدبہ تھا یا پھر احترام......؟ جاذب انہی سوچوں میں مگن کسی سے ٹکرا گیا۔ ہوا یوں کہ راہداری کا ایک موڑ تھا جہاں سے جاذب نے مڑ کر نیچے سیڑھیاں اُترنا تھیں مگر وہ اس خاندان کی جمع تفریق میں اُلجھا ہوا تھا کہ اُسے ہوش ہی نہ رہا۔

''اُف!'' کی نسوانی آواز نے جاذب کو شرمندہ کر دیا تھا۔ اپنے سر کو ہاتھوں سے پکڑ کر نیچے بیٹھنے والی نے نارنجی کلر کا فراک پہنا ہوا تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ جاذب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے؟ یقیناً بڑے زور کی ٹکر تھی، جاذب بھی لڑکھڑا گیا تھا۔

وہ ہولے ہولے اپنا سر اُٹھا رہی تھی۔ جاذب بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا تا کہ معذرت کر سکے مگر یہ کیا؟ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے والی کی نشیلی آنکھوں میں پانی دیکھ کر وہ شرمسار تو تھا ہی مگر اس کی ٹکر اس جگہ پر حوریہ سے ہو جائے گی، یہ اس کے گمان میں نہ تھا۔

''آپ......؟'' دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

دونوں مسکرا دیے تھے۔ حوریہ اپنا درد بھول گئی تھی۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ جاذب یہاں تک پہنچ جائے گا۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات جنم لے رہے تھے۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور پھر یہاں تک کیسے آ گئے؟'' اس نے ایک ہی بار دو سوالات کر دیے۔

''آپ یہاں غالباً مہمان ہوں گی۔ اس لیے میرا سوال کرنا اچھا نہیں لگے گا۔ میں تو ویڈیو گرافی کرنے آیا ہوں اور ملک صاحب کے حکم کی بدولت یہاں تک پہنچ سکا ہوں۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا تو حوریہ بھی مسکرانے لگی۔

''خوش نصیبی ہے آپ کی۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ جاذب بھی اپنی راہ پر ہولیا۔ وہ

ایک بار پھر سرونٹ کوارٹرز کے سامنے سے گزرتا ہوا عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوا تھا مگر یہ کیفیت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ مہمانوں کے بیچوں بیچ ہوتا ہوا حمود تک پہنچا تو وہ اس پر پہلے ہی منہ پھلائے ہوئے بیٹھا تھا۔

''کچھ تو شرم کریں، یہ کوئی وقت ہے آپ کے آنے کا؟'' اس نے کہا تو جاذب حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں جناب کیا فرما رہے ہیں؟''

''میں نہیں کہتا، یہ بات مجھ سے ایک لڑکی کر گئی ہے۔'' اس نے کہا تو جاذب ہنس پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ فنکشنز پر ایسی ہوٹنگ ہوتی ہی رہتی ہے۔ یہ معمول کی کارروائی تھی۔ اس نے حمود کو کیمرہ اور سٹینڈ بمعہ لائٹ ساتھ لانے کے لیے کہا۔ کام شروع ہو گیا تھا۔ اب حمود بھی سنجیدہ تھا۔

وہ اب دونوں اس کمرے کے باہر کھڑے تھے، دستک دے کر اندر گئے تو ملک صاحب نے تمام خاندان کو ریڈی کروا دیا تھا۔ اب ان کی مووی بننے والی تھی۔ کیمرہ سٹینڈ پر لگا کر جاذب اُن سب کو گائیڈ کر کے اپنی مرضی سے کھڑا کر رہا تھا۔ جب حوریہ کی باری آئی تو وہ گڑبڑا گیا۔ کیوں کہ وہ ملک عبدالرحمٰن کے پہلو میں کھڑی تھی تو گویا یہ محترمہ کا اپنا گھر ہے اور وہ لاڈلی صاحبزادی ہیں۔ جاذب اُسے کچھ بھی نہ کہہ پایا تھا۔ اس نے اپنے فن کا کمال دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی انگلیاں اور نظریں کیمرہ کو اپنی مرضی کے مطابق آپریٹ کر رہی تھیں۔ وہ بڑی مہارت اور محنت سے اپنا کام کر رہا تھا جب کہ حمود علی بطور اسسٹنٹ اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

چند منٹ کی فلم بنانے کے بعد اس نے لائٹ بند کر دی تو وہ اس سوگوار چہرے کی طرف دیکھ کر رہ گیا جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نے رنگ و روپ کی انتہا کر دی تھی۔ وہ میچور خاتون بڑی افسردہ اور اس ماحول میں میچ نہ کر رہی تھیں۔ اُن کی بھرپور شخصیت سے جاذب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنا سامان بھی سمیٹ رہا تھا اور کنکھیوں سے اُن کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ ہستی تھی جن کو دیکھ کر انسان بے اختیار سبحان اللہ پکار اُٹھتا ہے۔ اُن کے چہرے پر پاکیزگی اور تقدس ایسا تھا کہ حوریں بھی شرما جاتیں۔ اُنہوں نے کسی بھی قسم کا کوئی میک اپ نہ کیا تھا۔ بس براؤن کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس پر کسی بھی قسم کی کڑھائی وغیرہ نہ تھی مگر اُن کی جاذب نظر شخصیت کسی بھی زیور یا پھر ایمبرائیڈری کی محتاج نہ تھی۔ جاذب نے بھی محسوس کیا کہ

وہ اسی کی طرف دیکھ رہی ہیں مگر اب زیادہ دیر ٹھہرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ اپنا سامان سمیٹ کر نیچے لان میں پہنچ گئے۔

ملک عبدالرحمٰن اور گھر کے دوسرے لوگ اب مہمانوں کو ''خوش آمدید'' کہہ رہے تھے۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ دُلہا کی طرف سے مہندی آنے والی تھی۔ حوریہ کے علاوہ سبھی لوگ نظر آ رہے تھے مگر محترمہ کہاں تھیں؟ یہ معلوم نہ تھا۔ جاذب کی نظریں یونہی بے اختیار عمارت کی طرف اُٹھیں تو اس کی نظر دور جلنے والی لائٹنگ میں ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں سوگوار اور اداس چہرے پر پڑ گئی۔ وہ اس طرح سے کھڑی تھیں کہ یوں لگتا تھا کہ وہ جاذب کو ہی دیکھ رہی ہوں مگر یہ جاذب کا وہم تھا۔ اس نے حمود علی کو اشارے سے اس کھڑکی کی طرف متوجہ کیا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

''باس......! ایک بات ماننا پڑے گی یار۔ آنٹی کی شخصیت انتہائی دلکش ہے مگر اُن کے خوبصورت چہرے پر چھائی ہوئی اداسی اور سوگواری میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' وہ تبصرہ کر گیا تھا۔

''تُو بھی جاہل ہے۔ ہمیں کیا پڑی ہے؟ کسی کی شخصیت کا کھوج لگائیں۔ بس اپنا کام کر اور چلتا بن۔''

''ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر نہ جانے کیوں میں اس عورت کو فراموش نہ کر سکوں گا باس......''

اتنے میں شور مچ گیا کہ دُلہا والے آ گئے ہیں، مہندی آ گئی ہے، لڑکیاں پھولوں کی بھری ہوئی ٹوکریاں اُٹھائے گیٹ کے دونوں طرف کھڑی تھیں۔ حوریہ سے مشابہت والی ایک چھوٹی لڑکی بھی سب سے پیش پیش تھی۔ مہمانوں کو بھرپور انداز سے خوش آمدید کہا گیا۔ گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ آنے والے مہمانوں میں ایک مردانہ شخصیت کو دیکھ کر اُسے جھٹکا لگا۔ ملک عبدالرحمٰن آگے بڑھ کر ان سے گلے ملے اور پھر انہیں خاص استقبال خاص شان سے اندر لے آئے۔ پولیس کی گاڑیاں اِردگرد اپنی نیلی بتیوں سے علاقے کو خوفزدہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

''باس! یہ تو ہمارے صوبے کے وزیر ہیں۔'' حمود نے کہا تو جاذب کے ذہن میں فوراً آیا کہ اس نے ان وزیر موصوف کو کئی بار خبروں میں ٹی وی پر دیکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ملک عبدالرحمٰن کوئی چھوٹی مچھلی نہیں ہے۔ سچ ہی کہا ہے کہ ''خاناں دے خان پردھنے''

مہمانوں کی ٹھنڈے مشروبات سے آؤ بھگت کی جا رہی تھی۔ دوسری طرف سے آنے والا ویڈیو گرافر جاذب کی اچھی ساکھ اور مستند نام سے مرعوب تھا۔

کھانا کھانے کے بعد دُلہن کو لانے کے لیے جاذب اور حمود کو ایک بار پھر اُسی راہداری میں جانا پڑا۔ دُلہن کو تیار کرنے میں حوریہ بنفسِ نفیس خود اس کے پاس موجود تھی۔ تبھی تو وہ پنڈال میں نظر نہ آ رہی تھی۔ دُلہن کو دوپٹے کی چھاؤں تلے باہر لان میں لایا جا رہا تھا۔ وہ حوریہ کی کزن تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی حسن دینے میں فیاضی سے کام لیا تھا۔ جاذب نے محسوس کیا کہ حوریہ کی بار بار اُٹھنے والی نظریں اس کے لیے کوئی پیغام دے رہی ہیں مگر وہ ہر طرح کی ذہنی خلش کو بالائے طاق رکھ کر اپنے کام میں مگن تھا۔

دُلہن کو لان میں بنے ہوئے خوبصورت سٹیج پر بٹھایا گیا۔ اس کے اردگرد لڑکیوں کا جھمگٹا لگ گیا تھا۔ جاذب نے کچھ دیر کے لیے کیمرہ بند کر دیا۔ اس نے دوسرے کیمرے کی طرف دیکھا جسے حمود آپریٹ کرنے میں مصروف تھا۔ اب وہ انتہائی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ مگر جاذب کی نظروں نے تاڑ لیا کہ ایک لڑکی حمود میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ حمود کے لیے معمولی "کیس" ہے۔

وہ انہی خیالوں میں مگن تھا کہ وہ درد کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔ کوئی منچلی اس کے پاس سے گزرتی ہوئی اس کی کمر میں چٹکی کاٹ گئی تھی۔ اس نے سٹیج پر کھڑی حوریہ کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے یہ شرارت کروائی تھی مگر کیوں؟...... جاذب اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا کہ یہ بھی معمول کی کارروائی ہے۔ اب سٹیج پر رش کم ہو گیا تھا۔ دُلہن کا خوبصورت چہرہ پیلے رنگ کے دوپٹے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ڈھولکی پر گیت گائے جانے لگے۔

"کیا محسوس کر رہے ہیں؟" اس کے پاس سے ہی حوریہ کی آواز اُبھری تو وہ دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔ کیوں کہ حوریہ کے ساتھ وہ منچلی بھی موجود تھی جس نے چٹکی کاٹی تھی۔

"بہت اچھا۔" جاذب کی نگاہ کیمرے کے لینز پر تھی۔ اس کے مختصر سے جواب کے بعد حوریہ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتی ہوئی بولی۔

"ہمارا غریب خانہ آپ کو پسند آیا۔" جاذب نے محسوس کیا کہ اس کی اس بات میں غرور شامل ہے۔

"اگر یہ غریب خانہ ہے تو ہم جیسے غریبوں کے گھر...... اس عظیم الشان محل کے مقابلے

میں خیمے یا پھر جھونپڑیاں ہی ہوں گی۔" وہ اپنے لہجے کی تلخی کو چھپا نہ سکا مگر الفاظ کا لبادہ اوڑھا کر اچھے طریقے سے جواب دے دیا تھا۔

"غریب خانے وہ ہوتے ہیں، جہاں سکون اور قلبی اطمینان ہو۔ ان محلوں کی کہانیاں اور اُن کے اندر چھپے ہوئے دُکھ اگر کوئی جان لے تو وہ جھونپڑے میں رہنے کو ترجیح دے۔" وہ جانے لگی تو جاذب کو یک دم محسوس ہوا کہ اس کی بات میں یاسیت اور مایوسی ہے۔

"ٹھہریے!" وہ رک گئی لیکن جاذب کے بات کرنے سے پہلے ہی بول پڑی۔

"میں اس لمحہ بہت مصروف ہوں، جلدی کہہ لیں تو نوازش ہو گی۔" وہ اس انداز سے باتیں کر رہے تھے کہ دور سے دیکھنے والے کو محسوس ہو جیسے حوریہ اور اس کی سہیلی سٹیج پر ہونے والے فنکشن کے بارے میں تبصرہ کر رہی ہوں کیوں کہ جاذب کی نگاہیں تو پہلے ہی اس طرف مرکوز تھیں۔

"میں نے اس سے پہلے ایک باوقار خاتون کو سنجیدہ اور غم زدہ دیکھا ہے اور اب آپ بھی اس طرح کی باتیں کر رہی ہیں کہ مجھے یوں لگا کہ محلوں میں رہنے والے اس سے بھی زیادہ کی توقع کر رہے ہیں؟"

"وہ باوقار خاتون میری پھپھو ہیں، ماہ نور پھپھو۔ ان کے بارے میں کوئی بھی بات میں اس انداز سے نہیں سن سکتی۔ باقی پھر کبھی سہی۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں جب کہ جاذب کی نظریں ایک بار پھر "قصرِ ماہ نور" کے جگمگاتے نام پر گئیں۔

اب سبھی لوگ باری باری دُلہن کو مہندی لگا رہے تھے۔ ماہ نور پھپھو کی بھی باری آ گئی مگر اُنہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر دُلہن کی طرف دیکھا اور بغیر مہندی لگائے ہی اُٹھ گئیں۔ جاذب نے اُن کا بہت اچھا کلوز لیا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسو بھی موتیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اس کی ویڈیو گرافی کا یہی کمال تھا۔ وہ ایک نہ ایک سپر ہٹ سٹل لیتا۔ بعد میں اس کی پرنٹنگ کروا کے اس شخصیت کو تحفہ میں دیتا تھا۔ اس کی کئی تصاویر کا شکریہ کے ساتھ فون پر جواب موصول ہوا تھا۔ اب بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ یہی تصویر اس فنکشن کی سپر ہٹ سٹل ہو گی۔

مردوں کے حصے میں بھی ڈیشنگ پرسنالٹی مرد موجود تھے۔ ملک عبدالرحمٰن اور وزیر صاحب کی گاڑھی چھن رہی تھی۔ وہ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ کسی کسی بات پر قہقہہ بھی بلند ہو جاتا تھا۔ اُن کی بھرپور ویڈیو گرافی کے بعد لیڈیز پورشن میں اب تقریباً فنکشن ختم ہونے

والا تھا کیوں کہ دُلہا والے واپس جانے لگے تھے۔

دُلہا والوں کو رُخصت کرنے کے بعد اب گھر والوں نے دُلہن کے ساتھ مہندی کے لباس میں اپنی اپنی مووی بنوانی شروع کر دی۔ ماہ نور بُوا کو بھی زبردستی سٹیج پر لایا گیا تھا۔ جاذب نے حوریہ کی جانب دیکھا تو حیران ہوا کیوں کہ اب وہ پینٹ شرٹ اور جینز میں بالکل لڑکا ہی لگ رہی تھی۔

اس خاندان کی چھوٹی بچی جس کا تعارف بھی اس طرح ہوا تھا کہ یہ بھی خاندان کا اہم حصہ ہے اس کی عمر کوئی بارہ تیرہ سال ہوگی۔ بہت کیوٹ اور سندر لگ رہی تھی۔ جاذب اپنے کام میں مصروف تھا کہ کسی نے اس کی کمر پر پیار سے ہاتھ رکھا، اس نے کیمرہ چلتا رہنے دیا مڑ کر دیکھا تو وہی بچی ہاتھ میں گلاب کا تازہ پھول لیے کھڑی تھی۔

''گڈ مارننگ مسٹر......'' یہ کہہ کر اس نے پھول جاذب کی طرف بڑھا دیا مگر جاذب نے مارننگ کہنے پر گھڑی دیکھی تو صبح کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ اس پھول پر تیرنے والی شبنم بتا رہی تھی کہ یہیں کہیں سے اس پھول کو توڑا گیا ہے۔

''تھینکس بیٹا'' جاذب نے شکریہ ادا کر کے پھول لے لیا۔ دوبارہ کیمرہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس بچی کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

''میرا نام غزنوق ہے۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''اور آپ کا نام؟''

''جاذب۔'' اس نے اپنا نام بتایا تو وہ پھر بولی۔

''پورا نام بتائیں نا۔ جیسے غزنوق رحمٰن۔''

''جاذب مرادالحسن۔'' جاذب نے اپنا نام بتایا تو اس کے پیچھے کھڑی ماہ نور بُوا کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ وہیں کرسی پر ہی بیٹھ گئیں۔

''آپ بہت کیوٹ ہو، مگر آپ کا وہ دوست بور ہے۔'' اس نے حمود کی طرف اشارہ کیا تو جاذب مسکرا کر رہ گیا۔

''وہ ہے ہی ایسا ڈنگر۔'' یہ الفاظ جاذب کی زبان سے ادا ہو کر ماہ نور بُوا کے دل میں تلوار کا وار کر گئے تھے۔ اُنہوں نے نظریں اُٹھا کر جاذب مرادالحسن کی طرف دیکھا اور دل سے ایک آہ نکل کر آسمان کے اس پار چلی گئی۔ ''اگر اس کا مرادالحسن زندہ ہوتا تو یقیناً آج اتنا ہی بڑا ہوتا۔'' اُنہوں نے سوچا اور بے اختیار بڑبڑانے لگیں۔

''اپنی یادوں اور باتوں سے کہہ دو فیض الحسن، میرا پیچھا چھوڑ دیں۔'' اُن کی آنکھیں

بھیگنے لگی تھیں۔ وہ اُٹھ کر عمارت کی طرف بڑھ گئیں جب کہ اذانِ فجر کی آواز سن کر جاذب نے کیمرہ کی لائٹ آف کر دی۔ یہ اس کا اصول تھا وہ نائٹ فنکشن اذانِ فجر تک ہی کرتا تھا۔

اُسے کیمرہ اور دیگر سامان سمیٹتے ہوئے دیکھ کر غزنوق بھی جانے لگی، جاذب نے اسے بلایا۔

''ہاں تو مس غزنوق رحمٰن، آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟''

''یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہے بہت خوبصورت، اور یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ یہ نام میری شخصیت پر مناسب ہے یا نہیں۔''

''ہنڈرڈ پرسنٹ فٹ ہے اور آپ تو اس سے بھی زیادہ کی حق دار ہیں۔''

''تھینک یو۔ اب میں جاؤں؟'' وہ یہ کہہ کر کچھ بھی سنے بغیر چلی گئی۔ حالانکہ وہ اجازت لے رہی تھی۔

دُلہن کو اُٹھا کر سکھیاں اندر کی طرف لے گئیں تھیں۔ اب پنڈال میں حمود، جاذب اور ملازموں کی فوج ہی رہ گئی تھی۔ ویٹرز اپنا سامان سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ حمود نے بھی تیزی سے اپنا سامان پیک کیا اور بیگ لا کر جاذب کے پاس رکھ دیے۔

تھکن سے چُور حمود اور جاذب نے بیگ اٹھائے اور باہر نکل گئے۔ جاذب وہیں کھڑا رہا جب کہ حمود گاڑی لینے چلا گیا۔

گاڑی میں بیگ رکھنے کے بعد جاذب اپنی نشست پر بیٹھا تو اس کی نظریں بے ساختہ قصرِ ماہ نور کی طرف اُٹھ گئیں۔ جہاں کھڑکی میں ایک چہرہ جو کہ سوگواری اور حزن و ملال کی زندہ تصویر بن کر اُنہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جاذب نے اس عورت کے بارے میں انتہائی کرب سے سوچا۔

''نہ جانے کون سا روگ ہے، جو اس پُروقار عورت کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔'' اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا کیوں کہ آنکھیں اور دماغ نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ گھر پہنچنے تک آنکھیں کھلی رکھنا بہت ضروری تھا۔ وہ بخیریت گھر تک پہنچ گئے تھے۔ بابا کا کمرہ کھول کر دیکھا تو وہ پُرسکون انداز میں سو رہے تھے گویا کہ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر پُرسکون ہو کر سو گئے۔

اُن کی صبح تو دوپہر ڈھلے ہوئی تھی مگر بابا کو ناشتہ کروانا حمود کی ذمہ داری تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے غافل نہ تھا۔ اس نے صبح دس بجے اُٹھ کر بابا کو ناشتہ کروایا اور پھر سو گیا جب کہ بابا

صحن میں آنے والی دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا۔

''باس......! مجھے اس بُوا کے کریکٹر کی کوئی سمجھ نہیں آئی۔'' اب وہ دوپہر کے کھانے اور ناشتے کی جگہ پر اکٹھے بیٹھے تو حمود نے تبصرہ کر دیا۔

''کیا مطلب کہ کریکٹر کی سمجھ نہیں آئی۔ تمہارا کیا مطلب ہے کہ ہم رات کو کوئی فلم دیکھ کر آئے تھے جس کے کرداروں پر تبصرہ کیا جا رہا ہے؟'' جاذب نے بسکٹ منہ میں رکھ کر چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''اتنی عزت، دولت، اعلیٰ مقام اور پھر اللہ نے خوبصورتی سے بھی نوازا ہے مگر چہرے پر ملال، غم اور دُکھ کی لکیریں، مجھے بھی مغموم کر گئی ہیں۔'' وہ تاسف سے بولا تو جاذب نے اس کی طرف گہری نظر سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر واقعی دُکھ نظر آ رہا تھا اور ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ حمود سنجیدہ تھا۔ جاذب کی اس رگ رگ سے واقف ہو گیا تھا۔

''ہو گا کوئی دُکھ...... ہمیں کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاذب نے بے فکری سے کہا تو حمود چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''دل سے کہہ رہے ہو باس؟''

''رب تعالیٰ بے نیاز ہے وہ کسی کو دولت اور شہرت کی خوشیاں نوازتا ہے تو انسان سے اپنا شکر یہ بھی مانگتا ہے، مگر ناشکرا انسان دولت کی طمع اور لالچ میں اس کی ذاتِ واحد کو بھول جاتا ہے۔ بس پھر وہ اپنا آپ دکھاتا ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی محبوب چیز یا پھر کوئی جان سے پیارا رشتہ چھین لیتا ہے۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ ماہ نور بُوا کی شخصیت پر بھی کوئی ایسا ہی قہر ٹوٹا ہے جس کی وہ تصویر بنی رہتی ہیں۔'' جاذب کا تبصرہ جان دار تھا۔

''لیکن ماہ نور بوا کے معاملے میں مَیں تم سے اور تمہاری دلیل سے اتفاق نہیں کرتا۔'' حمود نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''کوئی فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔'' جاذب نے جان چھڑانے والے لہجہ میں کہا تو اندر سے بابا کے گاڑی چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جاذب نے پیار سے کمرے کی طرف دیکھا اور زیرِ لب مسکرا دیا۔

''اچھا ایسا کرو، بابا کو لے کر ہسپتال چلے جاؤ۔ ڈاکٹر احمد ندیم سے میرا اسلام کہنا اور پھر دیکھنا کہ وہ بابا کے بارے میں کیا کہتا ہے؟'' حمود علی بہت توجہ سے اس کی گفتگو سن رہا تھا کیوں کہ بابا کا معاملہ تھا جو کہ بالکل سنجیدہ تھا۔

''اوہ یار...... میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر بس ایسا ہی ہے۔ ڈھنگ سے تو کوئی بات سنتا نہیں بس فضول ہی ہے۔'' حمود نے جاذب کے ڈاکٹر دوست پر چوٹ کی تو جاذب نے بھی اسے بھرپور جواب دیا۔

''اس کی تمہیں کوئی سمجھ بھی نہیں آ سکتی کیوں کہ ویسے بھی وہ انسانوں کے ڈاکٹر ہیں۔''

اس گہری جواب چوٹ پر حمود تلملا کر رہ گیا۔

''آج کا کیا پروگرام ہے؟'' اس کا اشارہ رات کے فنکشن کی طرف تھا۔

''بارات آئے گی اور رُخصتی ہو گی...... بس اتنا ہی پروگرام ہے۔''

''جاذب بھائی......! مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہ جو...... عبدالرحمٰن ملک ہے۔ یہ کام دھندہ کیا کرتا ہے؟''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس یونہی، کیوں کہ میں نے کسی بھی کاروبار میں اس کا نام نہیں سنا اور نہ ہی یہ سیاستدان ہے۔''

''اُن کے بچے تو کچھ کام دھندہ کرتے ہوں گے۔'' جاذب اپنی جگہ سے اُٹھ گیا تو حمود کو بھی یہ بحث بے سود ہی لگی۔ وہ بھی اُٹھ کر بابا کی طرف بڑھ گیا۔

بابا کو صاف ستھرا لباس پہنا کر وہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بابا کو بٹھا کر اس نے پیار سے دروازہ بند کیا اور گاڑی سڑک پر دوڑا دی مگر جانے سے پہلے بابا نے جاذب کو ''ٹاٹا'' کیا تو وہ مسکرانے لگا۔

''آپ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائیں بابا...... یہی میرا ارمان ہے۔'' اس کے دل سے آواز نکلی۔ اس نے گیٹ بند کیا اور واپس اندر آ گیا۔ اس کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔ اس نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا تو اجنبی نمبر دیکھ کر حیران رہ گیا پھر بھی فون تو سننا ہی تھا۔

''السلام علیکم!'' جاذب نے کہا تو دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے پھر ''السلام علیکم'' کہا تو اس بار ایک نسوانی آواز سن کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگنے لگی کیوں کہ کسی بھی لڑکی کا فون آنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ جب بھی کسی فنکشن سے واپس آتے تھے۔ حمود کی شرارت کی بدولت اپنے کافی سارے وزٹنگ کارڈ تقسیم ہونے کی بنا پر ایسے اجنبی فون آتے ہی رہتے تھے۔ اب بھی جاذب نے سوچا کہ فارغ ہی ہیں چلو بات کر کے ٹائم گزاری کرتے ہیں۔

"مے آئی سپیک ٹو مسٹر جاذب؟"

"یس...... آئی ایم سپیکنگ۔"

"ذرا ایک شعر کا مطلب تو بتائیں؟" دوسری طرف سے کہا گیا تو اس نے حیرانگی سے فون نمبر کو دیکھا کیوں کہ کسی بھی لڑکی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ شاعر بھی ہے۔ یہ نمبر نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میڈم...... میرا شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مگر اب میرا تو آپ سے تعلق ہو گیا ہے۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر وہ ٹپٹا گیا۔

"آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں؟"

"یہ پوچھنا اور بتانا تو سراسر فضول ہے کیوں کہ موبائل پر جھوٹا جواب دینا بہت آسان ہے۔" جاذب سمجھ گیا کہ وہ بتانا نہیں چاہتی مگر پھر بھی اس کی آواز نے جاذب کو چونکا دیا۔

"اگر مجھ سے ملنے کے لیے اتنے ہی بے چین ہو رہے ہیں تو کھولیے اپنا گیٹ...... ابھی ملاقات ہو جاتی ہے۔" دوسری طرف کی آواز سن کر حقیقت میں اس کی روح فنا ہو گئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کے گھر کے باہر گیٹ پر کھڑی تھی۔ وہ بہت نروس ہو رہا تھا۔ اس نے موبائل آف کیا اور ڈرتے ڈرتے قدموں سے گیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ یک دم "ڈنگ ڈنگ" کی آواز نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔ ڈور بیل نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے گیٹ کھولا تو سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے کھڑی شخصیت ایک بھرپور مرد کی تھی۔ وہ اُسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"آپ......؟ صفدر بھائی...... آپ؟" اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا کہ صفدر حسین نے اسے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ خوشی کے آنسوؤں کا تبادلہ رُکا تو دونوں مسکراتے ہوئے صحن میں آ گئے۔ جاذب نے فوراً کرسی پیش کی مگر وہ حیران رہ گیا کہ صفدر حسین کرسی پر بیٹھنے کی بجائے بابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"چاچا کہاں گیا......؟" وہ خالی کمرہ دیکھ کر واپس آ گیا تھا۔ اب کرسی پر بیٹھنے سے پہلے وہ جاذب کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر کے پاس......" جاذب اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"حمود ابھی لے کر گیا ہے۔ آپ آنے سے پہلے اطلاع کر دیتے میں بابا کو روک لیتا۔

بہر حال پھر بھی حمود کو رِنگ کر دیتے ہیں۔ وہ ابھی واپس آ جائے گا۔"

"نہیں...... چاچا کا علاج ضروری ہے۔ اچھے سے اچھے ہاسپٹل میں ان کا علاج کراؤ۔ روپوں کی فکر نہ کرنا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی سائیڈ پاکٹ سے ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈی نکال کر جاذب کی جھولی میں پھینک دی۔

جاذب ایک لاکھ روپے کی رقم دیکھ کر تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ اس نے واپس کرنے کے لیے نوٹ صفدر حسین کی طرف بڑھائے۔

"آپ کی دعا چاہیے صفدر بھائی! اللہ کی رحمت سے میرا کاروبار بہت اچھا ہے۔ آپ یہ پیسے رکھ لیں۔ میرے پاس روپے موجود ہیں۔ جب ضرورت ہو گی آپ کو کہہ دوں گا۔"

"اب اگر دوبارہ ایسی بات کہی تو تھپڑ مار دوں گا ڈنگرا...... میں کوئی غیر ہوں؟ اور یہ روپے اگر تمہارے اور چاچا کے کام نہ آئے تو میں نے اتنی دولت کو آگ لگانی ہے۔" وہ مصنوعی ناراضگی سے بولا تو جاذب کو رقم رکھتے ہی بنی۔ وہ جانتا تھا کہ صفدر حسین بہت غصے والا ہے مگر وہ بابا کی عزت کرتا تھا اور جاذب سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کے خلوص اور محبت میں کوئی دکھاوا نہ تھا۔

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے کبھی بھی غیر نہ سمجھنا۔ میرے جاننے والے اور دوست تو ہزاروں ہیں مگر بھائی اور بھائی جیسا دوست پھر چاچے فیض الحسن جیسا باپ کا رشتہ کوئی نہیں ہے۔" صفدر حسین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"آئی۔ ایم سوری صفدر بھائی!" جاذب کو اپنی غلطی اور اس کی محبت کا احساس ایک بار پھر ہوا۔

"اچھا آپ بتائیں کیا کھائیں گے؟" جاذب نے پوچھا تو وہ مسکرانے لگا۔

"تمہا امطلب ہے کہ میں کچھ کھاؤں اور چلتا بنوں۔ نہ، نہ نہ نہ...... ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ جاذب کو بے اختیار قہقہہ لگانا پڑا۔ "بس یونہی ہنستے رہو کیوں کہ ہمیشہ مسکراتے رہنا ہی زندگی ہے اور تم میری زندگی ہو جاذب......!" صفدر حسین کو بچپن میں کہے ہوئے چاچا فیض الحسن کے الفاظ یاد آ گئے اور آج اس نے جاذب کو لوٹا دیے۔ وہ کڑیل جوان تھا مگر اس کے ذہن میں بچپن اور چاچا فیض الحسن کے ساتھ گزرا ہوا تمام وقت محفوظ تھا۔

جاذب نے اس کے لیے چائے تیار کی اور پُر تکلف سنیکس بھی ساتھ پیش کیے تو صفدر حسین کی طبیعت راضی ہو گئی۔

وہ چائے وغیرہ سے ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ گاڑی کا ہارن سن کر صفدر حسین کھڑا ہو گیا اس کا چاچا آ گیا تھا۔ جاذب نے گیٹ کھولا تو حمود گاڑی اندر لے آیا۔ صفدر حسین کو دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا۔ دل کی گہرائیوں سے اس نے اُسے گلے لگایا تھا۔ صفدر حسین کی نگاہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑی تو اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ چاچا فیض الحسن یوں دبکا بیٹھا تھا جیسے کہ وہ کسی سے ڈر کر چھپ گیا ہو۔ اس نے اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا صفدر حسین کے آنسو اب بہہ نکلے تھے۔ یہ وہی فیض الحسن تھا جس نے صفدر حسین کو ہنسنا اور مسکرانا سکھایا تھا مگر آج سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس کی ہنسی اور غمی سب کچھ مصنوعی تھا۔ اس کے جاندار قہقہے بے جان ٹھنڈی آہوں میں بدل گئے تھے۔ اس کی خوشیاں اس سے منہ موڑ چکی تھیں۔ وہ اپنا آپ کھو چکا تھا۔ اپنی پہچان، اپنا نام، اپنا رشتہ اور اپنی بیوی بچے کو بھول کر زندگی کی بے رحم موجوں کے تھپیڑوں پر دن پورے کر رہا تھا۔ اسے کچھ بھی نہ یاد تھا۔ نہ منظر علی، نہ بھتیجا صفدر حسین، نہ اپنا مراد الحسن اور نہ اپنی باوقار ماہ نور۔

صفدر حسین کا ہاتھ تھام کر فیض الحسن گاڑی سے اس شان سے نکلا جیسے کوئی اعلیٰ آفیسر کسی معائنے پر آیا ہو۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور جاذب کو اپنی طرف اُنگلی کے اشارے سے بلایا۔ ''ہمیں سخت بھوک لگی ہے، بلی کو دودھ پلاؤ اور بارش بھی آ رہی ہے، سورج کی تپش بڑھ جائے گی، اپنا سامان سمیٹ کر دکانیں بند کر لو۔'' اس کے بے ربط الفاظ اس کے ذہنی ترجمان تھے۔ صفدر حسین سر جھکائے فیض الحسن کو اس حالت میں دیکھ کر دُکھی ہو رہا تھا۔ فیض الحسن نے اس کی طرف دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو صفدر حسین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا وہ پیچھے سے بے اختیار پکار اُٹھا۔

''چاچا...... چاچا'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش نے شامل ہو کر ماحول کو مزید سوگوار کر دیا تھا۔ فیض الحسن اس کی آواز پر غور کرنے کے قابل نہ تھا۔ بس اپنی ہی دُھن میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ صفدر حسین نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے جاذب اور پھر حمود علی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ وہ پوچھ رہا ہو، چاچا کب اصلی فیض الحسن بنے گا اور مجھے ''ڈنگرا'' کہے گا؟ اس سوال کا جواب اُن تینوں کے پاس نہ تھا مگر اُن کی آنکھیں اور دل رب کائنات کی عظیم بارگاہ میں آس لگائے ہوئی تھیں۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں کسی بھی قسم کی ٹینشن نہیں ہونی چاہیے۔'' حمود نے کہنا شروع کیا تو وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''اس نے کہا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ اپنی اصلی

حالت کی طرف مڑ جائیں گے مگر ان کے لیے کوئی بڑا جھٹکا نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ خاموش ہوا تو صفدر حسین بول پڑا۔

''کسی اور ڈاکٹر کو چیک کروالیں۔''

''نہیں صفدر بھائی اس پوزیشن پر ہم کوئی بھی رسک نہیں لے سکتے کیوں کہ ڈاکٹر احمد ندیم نے بابا پر بہت محنت کی ہے اور اب آپ نے سنا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ان شاء اللہ بابا آہستہ آہستہ اپنی اصلی حالت کی طرف مڑ آئے گا۔'' جاذب کو بھی آس اور اُمید نے رب کریم کی رحمت سے مایوس نہ ہونے دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی اصلی حالت یعنی اسے تندرست حالت میں دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے اپنے باپ سے کوئی بھی بات تندرستی کی کیفیت میں نہ کی تھی۔ اسے تو آج تک یہی پتا تھا کہ صفدر حسین نے اس کی پرورش کی ہے۔ یقیناً صفدر حسین کا بہت بڑا احسان تھا۔ جو جاذب مراد الحسن کی سات پشتیں بھی نہیں اتار سکتی تھیں۔ مراد الحسن کو پڑھا لکھا کر اس معاشرے کا باعزت شہری بنانے میں صفدر حسین کا بڑا کردار تھا۔

اپنے باپ کی وفات کے بعد صفدر حسین نے چاچا فیض الحسن کی بیماری اور پھر مراد الحسن کی پرورش کرنے کے لیے تقدیر کے آگے سینہ سپر ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے ارادوں میں کس طرح کامیاب ہوا تھا یہ ایک الگ کہانی ہے۔

صفدر حسین چاچا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فیض الحسن پلنگ پر بیٹھا اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ دروازے میں کھڑے صفدر حسین پر پڑی تو وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو مگر صفدر حسین جانتا تھا کہ یہ چاچا کے لیے ناممکن ہو گا۔ وہ کافی دیر تک چاچا کو دیکھتا رہا پھر الٹے قدموں واپس پلٹ آیا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

''مراد الحسن!'' وہ جاذب سے مخاطب ہوا تو جاذب دل و جان سے متوجہ ہوا تھا۔ ''اب میں چلتا ہوں پھر جلدی ہی چکر لگاؤں گا۔'' وہ جانے لگا تو جاذب نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ اسے بے ساختہ وہ بیتا منظر یاد آ گیا جب فیض الحسن پہلی مرتبہ نوکری پر جا رہا تھا تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی دیوار بنا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ بالکل ایسا ہی کچھ جاذب نے کیا تھا۔

''آپ ایسے نہیں جا سکتے صفدر بھائی۔ کھانا کھائے بغیر میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔'' وہ اڑ گیا مگر صفدر حسین نے پیار سے اس کے گالوں پر چپت لگانے والے انداز میں ہاتھ پھیرا۔

"مسافروں کا راستہ نہیں روکا کرتے۔ یہ پنچھیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ کبھی اس دیس میں اور کبھی اُس دیس میں مگر اپنے گھونسلوں کو نہیں بھولتے۔ یہ میرا گھر ہے میں کہیں بھی رہوں۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ مجھے یاد آتی رہتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ جاذب اور حمود بت بن کر کھڑے تھے۔

"حمود علی!" وہ اس سے مخاطب ہوا۔ "تم مکسنگ کا کام شروع کرو۔ میں ذرا شاپ پہ چکر لگالوں۔" یہ کہہ کر جاذب اندر کی طرف گیا، رقم محفوظ جگہ پر رکھنے کے بعد وہ باہر نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

بارات آچکی تھی۔ حمود اور جاذب اپنے کام میں مگن تھے۔ دُلہا بھی کافی ہینڈسم تھا۔ آخر وزیر کا بیٹا تھا۔ زمانے کی دھوپ چھاؤں سے محفوظ رہ کر روپے پیسے کی ریل پیل میں جوان ہوا تھا۔ رنگ روپ بھی نکھرنا ہی تھا۔ حوریہ نے کاسنی کلر کی ساڑھی باندھی ہوئی تھی مگر جاذب نے غور سے دیکھا تو وہ اس لباس میں جچ نہ رہی تھی یا یوں کہا جاسکتا تھا کہ یہ لباس اس پر جچ نہ رہا تھا۔ بہرکیف یہ معاملہ اس کی ذاتی پسند کا تھا۔ ان دو دنوں میں اسے حوریہ کی ذات میں ہلکی سی وابستگی محسوس ہوئی مگر اس وابستگی کو وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ اب بھی اس کی نگاہیں کنکھیوں سے حوریہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

"ڈھونڈا اُنہیں جاتا ہے جو کھو چکے ہوں۔" یہ حوریہ کی آواز تھی جو اس کی پشت سے اُبھری تھی وہ کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا مگر جواب ضروری تھا ورنہ وہ چور بن جاتا۔ وہ پیچھے دیکھتے ہوا بولا۔

"جو آنکھوں کے رستے دل میں اتر جائیں ہم اُنہیں کھوتے نہیں۔"

"بات حلق سے نیچے نہیں اترتی، شعبہ مووِیز، انداز شاعرانہ، الفاظ فلسفیانہ۔"

"ایک ہی چہرہ دیکھ کر دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔" وہ یہ کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"باس!" یہ آواز سن کر اس نے حمود کی طرف دیکھا جو پنڈال کے ایک کونے میں کیمرے سے آنکھ لگائے مصروف تھا مگر مائیک کے ساتھ اس کا رابطہ جاذب کے ہیڈفون سے تھا۔ اس کی آواز دوبارہ آئی۔ "کام کے وقت کام عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔" اس نے جاذب اور حوریہ کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یہ بات اس کے گلے میں ہڈی بن کر چبھ رہی ہوگی۔ [illegible] "[illegible]" نکال کر بولا "کام کی باتیں ہی ہو رہی ہیں۔ جلنا چھوڑو اور دُلہا کی خوبصورت

شلز نکالو۔" جاذب نے بھی مائیک پر اسے جواب دیا تو وہ الرٹ ہوگیا تھا۔

"بوا جی...... آپ؟ آئیے یہاں بیٹھیں...... رش میں مت جائیں۔" جاذب نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حوریہ ایک پُر وقار عورت کو ایک نشست پر بٹھا رہی تھی۔ اُن کے گھر کا فنکشن تھا۔ اُن کی ذات سے وابستہ اس فنکشن کی بہت اہمیت تھی۔ ماہ نور بُوا دُلہن کی بھی بُوا تھیں۔ مگر ان کا شادی کے فنکشن میں دلچسپی نہ لینا بلکہ ایک طرف ہٹ کر خاموشی سے بیٹھ جانا جاذب کو کھٹک رہا تھا مگر اونچے محلوں کے راز بھی اونچے ہی ہوتے ہیں۔ رب جانے کیا مسئلہ تھا؟ مگر جو بھی تھا۔ جاذب کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا مگر پھر بھی پاگل دل نہ جانے کیوں بار بار اس عورت کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"بوا...... ان سے ملیے، یہ جاذب ہیں۔" حوریہ نے اس کا تعارف بُوا سے کرایا تو جاذب نے غور کیا کہ اس عورت کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ جاذب نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اُنہوں نے بھی سر کے خفیف اشارے سے جواب دیا۔

دودھ پلائی کی رسم پر غزنوق نے دودھ پیش کیا تو حوریہ بھی ساتھ تھی۔ وہی رسم جو اکثر شادیوں پر ہوتی ہے۔ اِن کی ڈیمانڈ ایک لاکھ روپیہ تھی جب کہ دُلہا میاں صرف پانچ ہزار دے رہے تھے بحث شروع ہوگئی۔ حوریہ کسی سے کم نہ تھی اس نے اپنی دلیلوں اور خوش زبانی سے تمام حاضرین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہوا تھا۔ جاذب کی نظروں نے بڑی محبت سے کئی مرتبہ اس کے حسین چہرے کا طواف کیا تھا۔ کافی بحث کے بعد دُلہا بھائی نے ایک لاکھ کا چیک سائن کر دیا۔

"ھُرّے" کی آواز سے اس نے چیک کیمرہ کی طرف کیا اور سٹیج سے نیچے اُتر گئی۔ غزنوق بھی اس کے ساتھ ہی تھی ہر کام خوش اسلوبی سے طے ہوگیا تھا۔ دُلہن جو کہ ماہم تھی۔ آج بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔ رُخصتی کے لمحات ہر باپ اور ماں کے لیے جان لیوا ہوتے ہیں۔

عنایت علی نے بیٹی کو گلے لگایا تو آنسوؤں کی جھڑی نے اُن کے دامن کو تر کر دیا۔ ماں بھی بیٹی کو وداع کرتے وقت آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔ ملک عبدالرحمٰن کی آنکھیں بھی نم تھیں مگر جب ملک زمان کی باری آئی تو بہن بھائی کے بےلوث رشتے نے سب کو رُلا دیا۔ حوریہ بھی ایک کونے میں کھڑی بھیگی پلکوں سے ماہم کو رخصت کر رہی تھی۔ غزنوق کو رُخصتی کی سمجھ تو نہ تھی مگر وہ گھر کے بڑوں کو دیکھ کر ہی رو رہی تھی۔ ملک عبدالرحمٰن نے وزیر موصوف کے سامنے

ہاتھ جوڑے تو اس نے مسکرا کر اُنہیں گلے لگا لیا۔

''شیر بن ملک شیر...... بیٹیاں تو پرائی امانتیں ہوتی ہیں۔ چڑیوں کے چنبے کی مانند ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔'' وہ ملک عبدالرحمٰن کو دلاسہ دے رہے تھے۔ ''میں ماہم کو بیٹی بنا کر لے جا رہا ہوں۔ بہو کا نام تو معاشرے کا دیا ہوا نام ہے۔ فکر مت کرو کوئی ٹینشن نہیں لینی۔'' وہ سیاستدان تھا مگر اس لمحہ شاید وہ سچ کہہ رہا ہو۔ گاڑی روانہ ہوگئی تو حمود نے کیمرہ کلوز کر دیا۔ جاذب نے بھی اپنا کیمرہ بند کر کے مائیک اور ایک کان سے ہیڈ فون اُتار دیا۔ اب وہ فری ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور حمود اپنے سامان کو سمیٹنے میں مصروف تھا۔

''مووی کب تک تیار ہو جائے گی؟'' غزنوق اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تو جاذب نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''آپ کو کب چاہیے......؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے پاس پڑی ہوئی خالی کرسی اُٹھا کر غزنوق کو پیش کی تو وہ ''تھینکس'' کہتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''کل دے دیں۔'' وہ اس کی بے صبری پر ہلکا سا قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

''امپاسیبل...... کیوں کہ اس کی ایڈیٹنگ ہوگی، ڈبنگ، مکسنگ، کمپیوٹرائزڈ ایفیکٹ اور پھر اسے سی ڈیز پر بھی کنورٹ کرنا ہوگا۔ تھوڑا سا ٹائم اور دو......'' جاذب اس سے گفتگو کر کے اپنی ذہنی تھکان دور کرنا چاہتا تھا۔

''اچھا تو پھر وَن ویک ٹھیک رہے گا؟'' وہ معصوم ادا سے بولی تو جاذب کو اس پر بڑا پیار آیا۔

''نو......'' اس کے مختصر سے جواب سے غزنوق کو بڑی حیرت ہوئی اس کا اظہار اس کے ماتھے پر پڑنے والی شکنیں کر رہی تھیں۔ ''تو پھر ٹو ویک، بس...... انف از انف۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنایا اور جاذب کا جواب سنے بغیر غصے میں اٹھ کر چلی گئی۔ جاذب اُسے جاتا دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اس کا ذہن پُرسکون ہونے لگا تھا۔

کچھ لمحات اسی طرح گزر گئے تو جاذب نے آنکھیں کھول کر اِردگرد کا جائزہ لینا چاہا تو سامنے دیکھ کر ٹھٹک پڑا۔ اس کے بالکل سامنے انتہائی خاموشی سے آ کر ماہ نور بُوا بیٹھ گئی تھیں۔ وہ اسے محویت اور محبت سے دیکھ رہی تھیں۔

''آپ......؟'' جاذب کھسیانا ہو کر رہ گیا تھا۔ بس یہی کہہ سکا۔

''بہت زیادہ تھک گئے ہو گے۔'' وہ محبت اور خلوص کے موتی نچھاور کر رہی تھیں۔ ''گھر

میں ماں بھی انتظار کر رہی ہو گی۔'' اُن کے لہجے میں یاسیت کی جھلک صاف محسوس ہو رہی تھی۔

جاذب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ یہ لفظ ''ماں'' کیا ہوتا ہے؟ مگر اس نام کی عظمت کو دل نے ہر روز سلام کیا ہے۔'' وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔

''بن ماں کے ایسی تربیت آج کل کے دور میں ایک معجزہ ہے۔'' وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''معجزات تو انسانوں کو رب کریم کی ذات عطا کرتی رہتی ہے مگر ناسمجھ انسان اس کی رمزیں سمجھنے سے قاصر ہے۔'' جاذب نے اپنا علم استعمال کیا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھی ہستی بھی تعلیم یافتہ ہے۔ وہ نروس بھی ہو رہا تھا کہ اتنی مالدار عورت اس رات کے لمحات میں نوکروں اور ویٹروں کی موجودگی میں اپنے خاندان کے وقار کے منافی ایک معمولی ویڈیو گرافر میں دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟

''کہاں کے رہنے والے ہو......؟'' یہ سوال بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''ناظم آباد میں ایک چھوٹا سا مکان ہے۔'' اس نے جواب دیا تو اُن کے لبوں پر دُکھ کی لکیر بناتی ہوئی مسکراہٹ نے ان کا غم اور کرب اُن کی آنکھوں سے ظاہر کر دیا۔

''بڑے بڑے محلوں اور بڑے بڑے بنگلوں میں اگر انسان بسنا شروع ہو جائیں تو چھوٹے چھوٹے مکان انسانوں سے خالی ہو جائیں گے۔'' وہ اٹھ گئیں۔ ''سردی بہت ہے میں تمہارے لیے چائے بھجواتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چلی گئیں۔ جاذب اُنہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا پھر سوچنے لگا۔ اس عورت کے لہجے میں جو سوز اور درد ہے اس میں جاذب کے لیے اپنائیت ہی اپنائیت ہے۔ پیار اور خلوص کا انجان رشتہ جاذب کو سوچوں میں غرق کر گیا۔

کچھ لمحہ پہلے پنڈال میں مہمانوں کی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ رُخصتی کے بعد گھر کے مکین بھی اپنے اپنے کمروں میں بند ہو گئے تھے۔ اگر جاگ رہی تھیں تو دو ہستیاں ایک ماہ نور بُوا اور دوسری حوریہ رحمٰن۔ کیوں کہ جاذب دیکھ رہا تھا کہ ملازم چائے کی ٹرے اٹھائے آ رہا تھا اس کے پیچھے پیچھے حوریہ بھی چلی آ رہی تھی اور اپنی مخصوص کھڑکی میں ماہ نور بُوا بھی اسی شان و شوکت سے اپنے چہرے پر اداسی کو چڑھائے ہوئے جاذب کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھیں۔

''یہاں رکھ دو۔'' حوریہ نے ایک کرسی سیدھی کر کے جاذب کے سامنے رکھی۔ ملازم

اس پر چائے رکھ کر چلا گیا۔ وہ دوسری کرسی پر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''اپنے اکلوتے اسسٹنٹ کو بھی بلوالیں۔'' ایک پُرکشش مسکراہٹ اس کے کلیوں اور پھولوں جیسے ہونٹوں پر بکھری ہوئی تھی۔

''آپ نے خواہ مخواہ ہی تکلیف کی۔'' اس کا اشارہ گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے کی طرف تھا۔

''میں نے نہیں جناب! یہ ماہ نور بُوا کی طرف سے ہے۔'' وہ خاص دل رُبا انداز میں مخاطب تھی۔

''ہاں البتہ بنائی میں نے ہے۔ اب پتا نہیں اچھی ہے یا پھر ایویں ای ہے۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔ اب وہ ڈریس چینج کر چکی تھی۔ اس ہلکے پھلکے ٹراؤزر اور کٹ میں وہ بالکل لڑکا معلوم ہوتی تھی مگر اس کے شانوں تک بکھرے بال اور اس کی گفتگو کا انداز اس کی نسوانیت کی چغلی کھاتا تھا۔

''آہا...... مزیدار چائے۔'' حمود کی آواز سن کر دونوں چونک گئے۔ ''اس بھیگتی ہوئی سرد رات میں آپ نے یہ نیکی کی ہے۔ ایمان سے اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔'' وہ ہاتھوں کو اپنے رومال سے پونچھ رہا تھا۔ غالباً سامان سمیٹتے ہوئے گندے ہو گئے ہوں گے۔ وہ اُن کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ جاذب نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا تو اس کے منہ سے بے ساختہ ''واہ'' نکلا۔

''کیا ہوا......؟'' حوریہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ویری ٹیسٹی۔'' وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ حمود درمیان میں بول پڑا۔

''اس اعتبار سے تو آپ کھانے بہت اچھے بناتی ہوں گی۔''

''میں نے کوکنگ اپنی گریٹ بُوا سے سیکھی ہے۔ وہ بہت اچھی کُک ہیں۔'' حوریہ کو کسی کی فکر تھی۔ وہ بار بار عمارت کی طرف بھی دیکھ لیتی۔ شاید اس لمحہ اُس کا اس طرح اُن کے پاس بیٹھنا کسی کو ناگوار گزر رہا ہو۔ وہ یقیناً اپنے ڈیڈی سے ڈرتی ہو گی۔

''مووی کب مل جائے گی......؟'' حوریہ نے پوچھا تو جاذب مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا اور مس غزنوق کا وعدہ دو ہفتوں کے کم تر وقت پر طے ہو گیا ہے۔'' وہ اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔ ''ان شاءاللہ پندرہ دن بعد مل جائیگی۔''

''او کے...... گانوں کی سلیکشن اچھی اور پیاری ہونی چاہیے۔'' وہ آخری فقرہ ادا کرتے

ہوئے مڑی تھی اور اس کا اس طرح مڑ کر بات کرنا جاذب کو اندر سے ہلا کر رکھ گیا تھا۔

''باس......!'' حمود نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''اب چلنا چاہیے کیوں کہ اذانِ فجر ہونے والی ہے۔'' وہ بیگ وغیرہ تو گاڑی میں رکھ کر گاڑی گیٹ پر کھڑی کر کے چوکیدار کی ڈیوٹی لگا کر آیا تھا۔ جو ایمان داری سے اپنی جگہ پر موجود تھا۔ گاڑی چل پڑی تو جاذب کی نظر ایک بار پھر اس کھڑکی کی طرف اُٹھ گئی جس میں وہ پُروقار اور پُرخلوص چہرہ یاسیت اور حسرت کی تصویر بنا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

قادر علی گھر میں داخل ہوا تو اس کے لیے ایک بڑی خبر منتظر تھی۔ اُس کا ساتھی ایک پرچے پر اس سے جدائی کا پروانہ تحریر کر کے غائب ہو چکا تھا۔ تحریر کچھ یوں تھی۔

''قادر علی! میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ ان کٹھن راہوں پر چلنے کے لیے میرے پاس اعتماد اور اعتقاد کے پاؤں نہیں ہیں۔ میں ربِ واحد کی ذات کا منکر نہیں ہوں مگر اس کی تلاش کرنے کے لیے جس حوصلے اور دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں ان راہوں پر تمہارا ساتھ دینے سے قاصر ہوں۔ میں اپنے ابا جی کے ہمراہ جا رہا ہوں۔ زندگی نے وفا کی تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔ جب بھی واپس آؤ یا آنا چاہو۔ میرے دل کے دروازے تمہارے لیے کھلے ملیں گے۔ تمہارا وہ ہمراہی جو ہمراہ نہ چل سکا۔ پپو۔''

''بیوقوف! منزل کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی بھگوڑا بن گیا۔'' قادر علی نے اس کا خط پرزے پرزے کر دیا۔ اس نے اپنی چارپائی پر رکھے ہوئے سرہانے کے نیچے دیکھا تو اب تک جمع کیے ہوئے تمام پیسے جوں کے تُوں موجود تھے۔ ان پیسوں میں پپو کا بھی حصہ تھا۔ اس نے بھی راتیں اور دن اذیت ناک طریقے سے گزار کر قادر علی کا ساتھ دیا تھا مگر اس کا کتنا حصہ تھا۔ یہ قادر علی کو فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کیوں کہ وہ اس کا حق اپنے ذمہ نہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پتا نہیں اب پپو کب ملے؟ ملے بھی یا نہ ملے مگر اس کا حصہ کسی ایسے شخص کے حوالے کر دے جو اس تک پہنچا دے مگر وہ تو یہاں بالکل اجنبی تھا۔ لوگ اسے ہیجڑا کہہ کر پکارتے تھے، کون اس کی بات سنے گا؟

وہ اپنے آپ کو اس قابل نہ سمجھتا تھا کہ ان روپوں کا حساب لگا سکے۔ اب پتا نہیں زندگی

کی ان راہوں پر کبھی پپو سے ملاقات بھی ہو سکے گی یا نہیں۔ وہ اس کی کمائی میں ڈنڈی نہ مارنا چاہتا تھا۔ وہ ان جمع کیے ہوئے روپوں سے حج کرنا چاہتا تھا۔ رب واحد کے مقدس و معطر گھر کی زیارت ہی اس کا مقصد تھا۔ مگر وہ بے ایمانی نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ پپو کی کمائی اپنی کمائی میں ملا کر ایسا نہ کرنا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ تمام رقم جو کہ لگ بھگ آٹھ نو ہزار ہو گی۔ وہ مسجد کے امام صاحب کو دے دے گا تاکہ وہ یہ رقم مسجد کی تعمیر میں لگا لیں کیوں کہ وہ کمائی اس اکیلے کی نہ تھی۔ وہ اللہ کی تلاش میں نکلا تھا۔ اس کے گھر کی زیارت کے لیے اپنی حق حلال کی روزی کمانا چاہتا تھا۔ مُرشد کا حکم تھا اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ اگلے حکم کے انتظار میں اسے ناچتے ہی رہنا تھا۔ اگلا حکم کب آئے گا کس شکل میں یہ اسے معلوم نہ تھا۔

''اگر وہ تمام رقم مولوی صاحب کو دے دے گا تو حج کہاں سے کرے گا......؟'' یہ خیال آتے ہی اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہونے لگا۔ اس کے ہاتھوں سے پیسے گر کر زمین پر بکھر گئے۔ وہ بھی دھڑام سے زمین پر گر پڑا، دل سے صدا نکلنے لگی۔

''میرے معبود!...... میں گناہ گار ہوں۔ تیری ذات سے بھروسہ اُٹھنے کے لیے شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنی گندی زبان سے تیری ذاتِ مقدس پر اعتماد متزلزل ہونے کی بات آ گئی۔ مجھے معاف فرما دے میرے مالک۔ تُو نے پیدا کیا ہے، تُو نے دل بنایا ہے۔ اس میں خواہش پیدا کی ہے تو میرے معبود اس کی تکمیل بھی تیرے حکم سے ہی ہو گی۔ میری اس غلطی کو اپنی وسیع تر رحمت کے صدقہ سے معاف فرما'' وہ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔ اسے کوئی دلاسا نہ دینے والا تھا۔ مگر کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا تو قادر علی کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ وہ کبھی پُر نور چہرے والے مرشد کی طرف اور کبھی اپنے دروازے کی کنڈی کی طرف دیکھتا تھا جواب تک بند تھا۔

''مُرشد یہاں کیسے پہنچے؟'' یہ خیال اس کے دل میں بجلی بن کر کوندا تھا۔ مرشد نے اسے گلے لگایا۔ اس کا بدن اب بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''سرکار...... آپ؟''

''حیران رہ گئے ہو قادر علی!'' مرشد کی پُر وقار آواز نے ماحول کو خوابناک بنا دیا تھا۔

''آپ تشریف رکھیں سرکار......'' اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ مرشد کو کہاں بٹھائے؟ اُن کی کیا خدمت کرے؟ وہ تو ابھی تک اس جھٹکے سے نہ نکلا تھا کہ مرشد بند دروازے سے اندر

کیسے آ گئے؟ مگر یہ حق و معرفت کے قصے تھے۔ قادر علی ان کی سُدھ بُدھ بھی نہ جانتا تھا۔ مرشد سرکار کھڑے ہی تھے قادر علی اُن کے سامنے سر جھکا کر کھڑا تھا۔

''اپنا دل اور سر صرف اس رب واحد کی بارگاہ میں ہی جھکانا۔ کبھی بھی کسی دولت مند اور مغرور آدمی کو اپنی ہستی پر مت چھانے دینا۔ اس کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر گھنگرو باندھنے والے قادر علی تم اس آزمائش میں کہاں تک پورے اترے ہو۔ یہ رب واحد کی ذاتِ بابرکت ہی جانتی ہے مگر مجھے حکم ملا ہے کہ تمہاری ڈیوٹی بدل دی جائے۔'' نورانی گفتگو نے گھر میں نور ہی نور پھیلا دیا تھا۔

''حکم کریں مرشد سرکار......'' قادر علی کی نظریں جھک گئیں۔

''جو دے اس کا بھی بھلا...... جو نہ دے اس کا بھی بھلا......'' مرشد کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو قادر علی دہرانے لگا۔ اس کی ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ پتا نہیں معرفت الٰہی میں یہ اس کی تنزلی تھی یا ترقی؟ یہ تو اوپر بیٹھا قادرِ مطلق ہی بہتر جانتا تھا مگر قادر کی زبان پر اُف نہ آئی تھی۔ وہ حق و معرفت کے اس خزانے کو پانے کی خاطر فقیر بن کر در در گلی گلی بازار بازار نگری نگری گھومنے کو تیار ہو گیا تھا۔

''یہ تمام رقم مسجد میں دے دو، اس سے تمہارا حج کرنا تمہارے دل کے لیے اطمینان بخش نہ ہو گا۔ اپنی تنہا ذات کو لے کر چلو قادر علی تبھی وہ تنہا، واحد، اکیلا اپنا آپ گنوا کر اس کی ذاتِ واحد کو تلاش کرنے والے کو اپنا آپ بخش دیتا ہے۔ حق و معرفت کے اسرار اس پر کھول دیتا ہے۔ اس کے دل کی دنیا بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی صداؤں میں، اس کی وفا میں، اس کی نگاہ میں، اس کی جفا میں، اس کے ارادوں میں، اس کی نیتوں میں وہ رب واحد شامل ہوتا ہے۔ اس کی عطا کی فیاضی زمانہ جانتا ہے۔ اللہ والے جانتے ہیں۔ اللہ اللہ ہی ہے۔ بس اللہ اللہ اللہ ھو، اللہ ھو......''

مرشد سرکار کنڈی کھول کر باہر نکل گئے اور قادر بت بنا کھڑا رہا مگر اس کے ہونٹ متحرک ہو گئے تھے۔ ''جو دے اس کا بھی بھلا...... جو نہ دے اس کا بھی بھلا...... جو دے......''

☆=====☆=====☆

''مجھے نماز پڑھنی سکھاؤ قادر علی!'' رانی کا یہ فقرہ اس پر بم بن کر گرا تھا۔ وہ حیرت و تعجاب کی تصویر بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت اس کے گھر کے صحن میں موجود تھی۔ باہر والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ قادر علی کے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی کہ ایک ہندو لڑکی اپنے دین دھرم سے

بغاوت کرنے پر تلی ہوئی تھی مگر کیوں؟ اس کیوں کا جواب تو قادر علی کے پاس بھی نہ تھا اور رانی بھی اس بات کا جواب دینے سے قاصر تھی کسی غیر مسلم کا اسلام کی طرف راغب ہونا خوش کن اور معرکہ آرا بات تھی مگر راغب ہونے والے کو رب واحد کی ذات اور مذہب اسلام سے دلی وابستگی کے لیے ٹھوس دلیل کی ضرورت ہوتی ہے مگر رانی کا معاملہ اور تھا وہ قادر علی سے عشق کرتی تھی، وہ اسی بنا پر مسلمان ہونا چاہتی تھی اور یہ بات اسلام کے منافی تھی کہ کوئی لڑکی یا لڑکا اپنا مذہب انسانوں کے عشق میں گرفتار ہو کر تبدیل کرے۔ دین اسلام میں شامل ہونے کے لیے رب تعالیٰ کی ذات واحد پر مکمل اعتقاد ضروری ہے۔ ان دیکھی ذات کو سجدہ کرنے سے پہلے دل کا پاک صاف ہونا بہت ضروری ہے۔ قادر علی لرز کر رہ گیا۔ یہ خیال ہی اس کی روح کو تڑپا کر رکھ گیا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کی ذات میں دلچسپی لینے والی ہندو لڑکی دین اسلام میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ رب تعالیٰ کی ذات کے متعلق کچھ نہ جانتی تھی۔ محض قادر علی کو اَن دیکھے خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز دیکھ کر اپنے مطلوب کے عشق میں اس کے خدا کو سجدہ کرنا چاہتی تھی اور قادر علی کو کسی صورت یہ منظور نہ تھا۔

''سجدہ کرنے کے لیے پہلے اپنے دل کو دھونا پڑتا ہے رانی۔'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اس یقین اور اعتقاد کو پختہ جگہ دینا پڑتی ہے کہ وہ ہمیں ہر طرف سے دیکھ رہا ہے۔ جسے ہم کہیں سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ مگر اپنے دھلے ہوئے پاک صاف دل کے آئینے میں جب بھی چاہیں، نظریں جھکا کر آنکھوں کو باوضو کر کے اس معبود کو دیکھ سکتے ہیں، وہ ہر جگہ سے نظر آتا ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ اور صاف شفاف دل درکار ہے۔'' وہ چاہتا تھا کہ رانی چلی جائے۔ ابھی تو وہ خود راہوں میں بھٹک رہا تھا۔ رب کائنات کو ابھی اس کے مزید کتنے امتحان مقصود تھے۔ وہ قادر علی نہ جانتا تھا مگر رانی اپنی ضد پر اڑ گئی تھی۔

''میں اپنا دل دھولوں گی قادر!'' اس کا لہجہ عجیب سی خماری سے سرشار تھا۔ ''میں وہ ہر کام کر لوں گی جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔''

''کیا کر سکتی ہو......؟'' اس کی آواز میں گھن گرج شامل تھی۔ ''اپنے والدین کو چھوڑ سکتی ہو؟ اپنا دھرم چھوڑ سکتی ہو؟ اپنی برادری، خاندانی رسم و رواج چھوڑ سکتی ہو؟...... بہت مشکل ہے رانی بہت مشکل ان راہوں پر چلنے کے لیے جن پاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس تو وہ پاؤں ہی نہیں ہیں، دل کہاں سے لاؤ گی؟'' وہ سانس لینے کے لیے رکا تو رانی بول پڑی۔

''قادر علی! کیا تمہارے پاس اپنے رب کو پہچاننے والی آنکھ ہے؟ صاف شفاف اور

دھلا ہوا دل ہے؟ اُن کٹھن راہوں میں چلنے کے لیے پاؤں ہیں؟'' یہ سوال قادر علی کے دل پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگے۔

رانی جا چکی تھی مگر قادر علی کا غرور خاک میں ملا گئی تھی۔ وہ ابھی اس قابل کہاں ہوا تھا کہ وہ دوسروں کو نصیحت کرتا۔ وہ تو رانی کو بیوقوف سمجھتا تھا مگر رانی اس کے چودہ طبق روشن کر گئی تھی۔ اس کے دل کی کھڑکیاں کھول گئی تھی۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں تو وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے آسمان کی جانب منہ کر کے رب تعالیٰ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کی نگاہ تھکی ماندی واپس پلٹ آئی کیوں کہ اس عظیم رب کو دیکھنے کے لیے آسمان کی جانب منہ اٹھانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے دل کی طرف پیار سے نظریں جھکانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆=====☆=====☆

ادھ کھلی کھڑکی سے فیض الحسن کی محبتوں بھری آواز میں قرآنِ کریم محو خواب، محو استراحت ماہ نور کے کانوں میں پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ذرا سی کسمسائی مگر آنکھ کھولنا ہی پڑی۔ اتنی پیاری آواز کس کی ہے؟ یہ کون ہے؟ جو اتنی خوش الحانی سے تلاوتِ قرآن کریم میں مگن ہے۔

''اور تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دعا کرو۔ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بیشک وہ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ عنقریب ذلیل ہو کر دوزخ میں جائیں گے۔''

فیض الحسن کی آواز نے ماہ نور کو کھڑکی تک کھینچ لیا۔ اس نے اپنے جسم کے گرد چادر لپیٹی اور کھڑکی میں کھڑی ہو کر صبح کا اجالا دیکھنے لگی۔ لان میں لگے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے خاموش تھے۔ ماہ نور کو اس بات سے بڑی حیرت ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ فیض الحسن جب قرآن پڑھتا ہے تو پرندے بھی اس کی تلاوت خاموشی سے سنتے تھے۔ ماہ نور کا کمرہ سرونٹ کوارٹرز کی طرف تھا۔ اس کی کھڑکی فیض الحسن کے کوارٹر کے بالکل سامنے کھلتی تھی۔

اجلی اجلی اور نکھری صبح کے ٹھنڈے تازہ ہوا کے جھونکے نے ماہ نور کو خوش آمدید کہا۔ وہ تازہ ہوا کو محسوس کر کے دل مسوس کر رہ گئی۔ آج تک خوامخواہ ہی سوئی رہتی تھی۔ پُر نور اجالا دل اور آنکھوں کو لبھا رہا تھا۔ فیض الحسن کی آواز نے ایک بار پھر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو۔ دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو۔''

(انعام-۱۵۳)

ماہ نور سمجھ گئی کہ فیض الحسن پہلے عربی زبان میں آیات کا ورد کرتا ہے پھر اس کا ترجمہ سناتا ہے۔ اس نے تلاوت ختم ہونے پر مالی کو اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ فیض الحسن کس کو ترجمہ سناتا ہے۔ یہ فیض الحسن کی ایسی خوبی تھی جو ماہ نور پر عیاں ہوئی تھی۔ ان چند آیات نے اس کے دل میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ چاہنے لگی کہ فیض الحسن جس محبت سے اللہ کی مقدس کتاب کی تلاوت کرتا ہے۔ وہ پڑھتا رہے اور وہ سنتی رہے۔ بس اسی طرح ماہ و ایام گزرتے گزرتے زندگی تمام ہو جائے مگر یہ اس کی خواہش تھی کیوں کہ فیض الحسن کو صرف اتنا ہی حکم تھا کہ وہ اس کا ملازم ہے، اس کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔

ماہ نور نے غور کیا کہ اب پرندے بھی چہچہانے لگے تھے۔ چڑیاں اور بلبلیں گیت گانے لگی تھیں۔ رب تعالیٰ کی وحدانیت کے ترانے ہر پرندے کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ شرم سے ڈوب مرنا چاہیے کہ بے زبان جانور اور پرندے چرندے رب کی ثنا خوانی کریں اور انسان نرم و گرم بستروں میں زندگی کے مزے لوٹتے ہوئے اپنی عیاشیوں پر پردہ ڈال کر پُرسکون سوتا رہے۔

فیض الحسن لان میں گھاس پر تازہ شبنم پر ٹہل رہا تھا۔ اس کا کسرتی وجود ہر قسم کی تھکان سے بے نیاز تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پُرسکون مسکراہٹ اور ایک پُرنور اُجالا تھا۔ یہ سب کچھ قرآن کی بدولت تھا۔

''افسوس ہے ماہ نور تم پر تم نے قرآن پڑھ کر بھلا دیا۔ کبھی اپنے رب کو سجدہ بھی نہیں کیا۔ اس کی نعمتوں کا شکر بجالانے کے لیے کبھی تمہاری زبان سے ''الحمدللہ'' بھی نہیں نکلا۔'' وہ خود کو ملامت کر رہی تھی۔ اب تو وہ قرآن بھول گئی ہوگی۔ کس سے پڑھے؟ اس عمر میں کس مدرسے میں جائے؟ کس مولوی پر اعتبار کرے؟ اسے کون نیکی کا سبق پڑھانے کے لیے تیار ہوگا؟ کون کون کون؟

''ہاں! وہ پڑھائے گا اسے......'' اس نے خود ہی سوچا۔ ''کون......؟ ملازم......؟'' شیطان کا وار چلنا شروع ہو گیا۔ ''مگر سیکھنے کے لیے مالک و ملازم نہیں بلکہ استاد اور شاگرد کا رشتہ ہوتا ہے۔'' اس نے شیطان مردود کے منہ پر تھوکنے کی کوشش کی۔

''کیا بھیا مان جائیں گے کہ تم جو کہ اس تمام جائیداد کی اکلوتی وارث ہو، ایک ملازم سے قرآن پڑھو؟'' مردود اپنا وار کر گیا۔

''مجھے یہ جائیداد اور عزت و دولت نہیں چاہیے۔ میں قرآن پڑھوں گی اور وہ بھی فیض الحسن سے۔'' اس نے فیصلہ کر کے ایک بار پھر شیطان پر لعن طعن کی۔ ماہ نور کا یہ فیصلہ اٹل تھا۔ بس پھر شیطان کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ ماہ نور کو اس معاملہ میں بہکا سکے۔ وہ بھاگ گیا تھا۔ فیض الحسن اب اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ماہ نور نے دیکھا کہ وہ پرانے کپڑے پہن کر باہر نکلا اور گیراج کی جانب چل دیا۔ اب یہاں سے گیراج نظر نہ آتا تھا۔ پتا نہیں دل کو کیا ہو رہا تھا۔ عجیب سی کیفیت سے دوچار ماہ نور بے چین ہو کر اپنے نرم و گداز بستر پر گر گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میلوں بھاگتی ہوئی آئی ہے۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ دل نے بھی دھک دھک کی صدا دینا شروع کر دی تھی۔ اچانک اس کے دل پر کس کا قبضہ ہو گیا ہے؟ وہ پریشان ہو گئی، سامنے رکھے ہوئے ڈریسنگ کے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ آئینے میں ملازم فیض الحسن کی شبیہہ ابھر آئی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور دوسرے ہی لمحے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ یہ اس کا وہم تھا اس کی ایک نظر کا دھوکا تھا، فریب نظر تھا، آئینے کی کارستانی تھی، دماغ کی اختراع تھی۔

فیض الحسن کے خیالات نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ تو اسے اپنے ملازم کے عہدے سے ہٹا کر ایک بلند عہدے پر فائز کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ استاد کے اعلیٰ ترین مقام پر بٹھا کر فیض الحسن کو عزت اور مرتبہ دینا چاہتی تھی مگر وہ دل کی دنیا پر ہی قابض ہونا چاہتا تھا۔ کم ظرف کم ذات تھا، ملازم کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے؟ مالکن نے مسکرا کر دو چار باتیں کیا کر لیں وہ اپنی اوقات ہی بھول گیا تھا۔ مالکوں کے دل پر راج کرنے کا خواب تمہیں مہنگا پڑے گا فیض الحسن اپنی حد اور اوقات میں رہو۔

مگر یہ سب کچھ اس کا خیال تھا۔ ہو سکتا ہے بے چارہ غریب ڈرائیور اس طرح کے کسی بھی جذبے سے نا آشنا ہو۔ یہ ماہ نور کے ذہن کی فضول اختراع ہو۔ ہاں! بالکل ایسا ہی کچھ تھا۔ وہ فیض الحسن کو ڈرائیور سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دے گی۔ بس...... یہ اس کا اٹل فیصلہ تھا۔ اس نے کتنی ہی دیر ذہنی کشمکش میں رہنے کے بعد اٹل فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کالج کا وقت ہو رہا تھا۔ فیض الحسن گاڑی تیار کر کے ماہ نور کا منتظر تھا۔ ٹھیک اپنے وقت پر وہ محل کے اندر سے برآمد ہوئی۔ آج کالج میں کوئی فنکشن تھا۔ اس لیے یونیفارم کی بجائے اس نے آسمانی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ماں جی اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ وہ ہر روز ماہ نور کو رخصت کرنے کے لیے گیراج کی جانب آتی تھیں۔ گاڑی محل کے

صدر دروازے پر کھڑی ہوتی تھی۔

وہ ایک دل کش ادا سے چلتی ہوئی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دروازہ فیض الحسن نے ہی کھولا اور بند کیا تھا۔ اس نے گاڑی کا سٹیئرنگ سنبھالا تو گاڑی تیز اور دل کو لبھانے والی خوشبو سے بھری ہوئی تھی۔ ایک لمحہ تو فیض الحسن بھی لمبا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شاید اسی طرح ماہ نور کو اپنی سانسوں میں بسا لینا چاہتا تھا مگر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون اس کی راہ میں رکاوٹ تھے۔

''شمسہ کو بھی لیتے ہوئے جانا ہے۔'' ماہ نور کی سریلی آواز نے فیض الحسن کو بیک ویو مرر میں دیکھنے پر مجبور کر دیا تو اس نے نظریں فوراً جھکا لیں کیوں کہ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی مگر آنکھوں کی جنگ میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں نے کام دکھا دیا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

ایک کو زعم تھا دولت اور امیری کا مگر اس کی راہ میں خاندانی روایات اور عزت کی دیوار کھڑی تھی اور دوسرے فریق کو اپنی کم مائیگی اور غربت نے کوئی بھی جذبہ دل میں نہ پالنے کی بار بار تنبیہہ کی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ اپنے اپنے دلوں کو سمجھانے کی کوشش میں مصروف تھے مگر بات بڑھ چکی تھی۔ گزشتہ ایک ماہ سے وہ کئی بار شمسہ کی کوٹھی پر گیا تھا مگر باہر ہی باہر سے اسے پک کرنا اور ڈراپ کرنا ہوتا تھا۔ اب بھی اسے معلوم تھا کہ شمسہ کو لے کر کالج پہنچنا ہے اور پھر اس کی چھٹی اور دوبارہ تقریباً فنکشن ختم ہونے پر اسے پھر بلایا جائے گا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج صفدر حسین کو ضرور ملنے جائے گا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ آج ماہ نور سے بات کر کے صفدر حسین سے ملنے کی اجازت ضرور لے گا۔ کالج کے سامنے رک کر اس نے ماہ نور کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ماہ نور بی بی!'' ماہ نور کا نام لیتے ہوئے فیض الحسن کا دل بھی دھڑک گیا تھا جب کہ اپنا نام فیض الحسن کے منہ سے سن کر وہ بھی اپنی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

''کہو! کیا بات ہے؟'' اپنی حیثیت اور مان مرتبے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ماہ نور کے لہجے میں آنے والی تلخی فیض الحسن نے محسوس کر لی تھی مگر اب بات کرنا ضروری تھی۔

''واپس کتنے بجے آؤں؟'' وہ اپنا سوال بدل گیا تھا مگر ماہ نور کے بولنے سے پہلے ہی شمسہ بول پڑی۔

''تمہیں جانے کون کمبخت کہہ رہا ہے کہ تم جاؤ۔'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر

بولی۔ ''تم تو ایسے ہو کہ تمہیں ہر لمحہ دیکھا جائے۔'' شمسہ کی گستاخانہ باتیں گزشتہ کئی دنوں سے وہ سن رہا تھا۔

''دو بجے آ جانا اور کچھ......؟'' اب اس کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا اور یہ فیض الحسن کے لیے حیران کن ہی تھا۔

''وہ جی! میں اپنے بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو...... میں دو بجے یہاں پہنچ جاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں عاجزی اور مسکینیت عود آئی تھی۔ ماہ نور مسکرانے لگی۔

''اتنی سی بات کے لیے اتنا وقت ضائع کر دیا تم نے۔ میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں دل چاہے جاؤ، آؤ مگر اپنی ڈیوٹی ایمان داری اور وقت کی پابندی سے کرتے رہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کالج کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گئیں جب کہ شمسہ نے کئی بار مڑ کر فیض الحسن کی طرف دیکھا تھا۔

اور وہ صفدر حسین سے ملاقات کے لیے اجازت مل جانے کی خوشی میں مسرور اور شاداں تھا۔ وہ شمسہ کا مسکرانا نہ دیکھ سکا۔

گاڑی منظر علی کے دروازے پر کھڑی کر کے اس نے گیٹ کو ہاتھ سے بجانا شروع کر دیا تھا۔ اندر سے صفدر حسین کی جھلائی ہوئی آواز نے اس کی روح میں تازگی بھر دی تھی۔ اس پورے شہر میں منظر علی اور صفدر حسین کے علاوہ اس کا کوئی نہ تھا۔ منظر علی اس کا بھائی، محسن اور بہت کچھ تھا مگر صفدر حسین اس کا بھتیجا، اس کا جگر اور یار تھا اور یہ سب سے بڑا رشتہ تھا۔

گیٹ کھل گیا تو سامنے صفدر حسین گومگو کی حالت میں فیض الحسن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح ادا کار تھا۔ اس کے چہرے پر مکمل سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور وہ فیض الحسن کو کنفیوز کرنے کے لیے کافی تھی۔

''ڈنگرا......'' فیض الحسن نے چہک کر نعرہ لگایا اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا مگر صفدر حسین کے رویے میں کوئی تبدیلی یا گرم جوشی نہ دکھائی دی تو حیران ہو گیا۔ اس نے صفدر حسین کو خود سے الگ کیا اور سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''ڈنگرا...... کیا بات ہے؟ اپنے چاچا کو نہیں پہچانتا؟'' وہ خفگی اور ناراضی سے بولا۔

''میرا کسی امیر چاچا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے منہ دوسری طرف کر لیا تو فیض الحسن گھوم کر پھر اس کے سامنے ہو گیا۔

''دیکھو۔ صفدر حسین! میں سخت شرمندہ ہوں، تم پڑھے لکھے ہو یار، میری مجبوری کو سمجھتے

ہو گئے بیگانی نوکری میں مالکوں کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' وہ سمجھ گیا تھا کہ صفدر حسین اس کے ایک ماہ بعد ملنے کی وجہ سے ناراض ہے اور اب فیض الحسن کو کئی پاپڑ بیلنے تھے۔

''سرکار، مائی باپ، میں ابھی تک غریب آدمی ہوں۔'' اس کے چہرے پر یتیمی برسنے لگی تھی۔ ''جناب عالی ابھی؛ پہلی تنخواہ حضور کی نظر کرم سے کل ملنے والی ہے۔'' اب اس نے صفدر حسین کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ننھے صفدر حسین کے لبوں پر مسکان پھیل گئی مگر اس نے منہ دوسری طرف موڑ لیا تو فیض الحسن کو اُدھر ہی رُخ موڑنا پڑا۔

''جیسے ہی مجھے تنخواہ ملے گی سرکار کا قرض اچھی سی دعوت سے چکا دوں گا۔''

''پکا وعدہ کرو، وعدہ خلافی ہمیں پسند نہیں ہے۔'' صفدر حسین نے کہا تو فیض الحسن کا قہقہہ بلند ہو گیا۔ صفدر حسین کی بات اس طرف اشارہ تھی کہ اس کا موڈ ٹھیک ہو رہا ہے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو زور سے گلے لگایا۔ فیض الحسن نے کئی بار صفدر حسین کا منہ چوما تھا۔

''ڈنگرا......تمہاری ناراضگی تو میری جان نکال دیتی ہے اور واقعی تُو بہت بڑا اداکار بنے گا۔''

''تیرا یہی تکیہ کلام سننے کے لیے تڑپ رہا تھا ڈنگرا۔'' صفدر حسین کا جواب بھی اسی کے لہجے میں تھا دونوں کے قہقہے بلند ہونے لگے۔

منظر علی کسی دوسرے شہر ڈرامہ کرنے گیا ہوا تھا۔ صفدر حسین نے بتایا کہ وہ تین دنوں سے اکیلا ہی رہ رہا ہے اور آج اسے چاچا کی بہت یاد آ رہی تھی۔

دونوں نے مل کر اچھا سا ناشتہ کیا۔ فیض الحسن نے صفدر حسین کو گاڑی میں شہر کی سیر کرائی اور دوستی کو مزید پکا کر لیا۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' فیض الحسن جانے لگا تو صفدر حسین اداس ہو گیا۔

''مجھ سے ملتے آتے رہنا چاچا، ایک تم ہی تو ہو، جو میرے دوست بھی، ماں بھی، بھائی اور بہن بھی ہو۔ نہ جانے کتنے رشتوں کی زنجیر میں نے تمہاری محبت کے ساتھ اپنے پیار سے باندھ رکھی ہے۔'' وہ مغموم ہو گیا تھا۔ ''اس زنجیر کو ٹوٹنے نہ دینا، ورنہ میں ٹوٹ جاؤں گا چاچا۔'' اب وہ باقاعدہ رونے لگا تھا۔ فیض الحسن نے اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے گال پر محبت سے بوسہ دیا اور بولا۔

''تم دیکھنا یہ زنجیر مضبوط بنانے کے لیے تیرا چاچا اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرے گا۔'' وہ بھی اداس تھا مگر بھرپور مرد کی نشانی یہی ہے کہ وہ رویا نہیں کرتا۔ اس نے بھی

اپنے آنسو پی لیے تھے۔ ''اب آئندہ ہمارے درمیان کوئی بھی اداسی اور غم کی بات نہیں ہو گی۔'' فیض الحسن نے اس کی آنکھیں صاف کیں اور باہر نکل گیا۔

دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے وہ با آسانی کالج تک پہنچ گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد ہی شمسہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ فیض الحسن نے بیزاری سے ناک چڑھا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ اسے شمسہ کے لباس اور انداز سے سخت کوفت ہو رہی تھی مگر حیرانی اس بات کی تھی کہ شمسہ اکیلی کیوں آ رہی ہے، ماہ نور کہاں ہے؟ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب اسے شمسہ سے ملنے والا تھا۔

''ہیلو ہینڈسم!'' اس نے پاس آتے ہی کہا اور گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ فیض الحسن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے منہ باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''گاڑی سٹارٹ کرو اور مجھے گھر ڈراپ کر کے آؤ۔'' اس کا انداز تحکمانہ تھا اور یہ فیض الحسن کی طبیعت پر گراں تھا کہ اس کے مالکوں کے علاوہ کوئی اس پر حکم چلائے۔ جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو شمسہ چیخ کر بولی۔

''بیوقوف ڈرائیور! تمہیں سنائی نہیں دیتا، میں کیا کہہ رہی ہوں؟'' فیض الحسن نے اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھا۔ کوئی اس کی بے عزتی خراب کرے اور وہ اسے جواب نہ دے یہ اس کی توہین تھی مگر یہاں معاملہ ماہ نور کی دوست کا تھا اور وہ ماہ نور کے کتوں کی بھی عزت کرتا تھا۔

''میڈم! میں ماہ نور بی بی کے علاوہ کسی کے بھی حکم کا پابند نہیں ہوں۔'' اس نے نہایت تحمل سے جواب دیا تو شمسہ کا پارہ ہائی ہو گیا۔

''تم! جاہل دیہاتی۔'' وہ یہ کہہ کر گاڑی سے باہر نکل آئی۔ اب اس کی رگیں غصے کی وجہ سے پھول رہی تھیں۔ ''تمہاری اتنی جرأت کہ تم مجھے اور میرے آرڈر کو کوئی اہمیت نہ دو۔'' اس نے آگے بڑھ کر فیض الحسن کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اس تھپڑ سے وہ سن ہو کر رہ گیا۔ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ فیض الحسن کو ڈرائیور کی یونیفارم میں دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے کہ ایک امیر دوسرے غریب پر اپنی دولت اور غرور کا بوجھ لادنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کہتا اور شمسہ کوئی اور کچھ بکتی ایک زوردار تھپڑ شمسہ کے گالوں پر اپنے نشان چھوڑ گیا۔

فیض الحسن نے دیکھا کہ وہ ماہ نور تھی۔ نہ جانے کہاں سے وہ مجمع کو چیرتی ہوئی آئی تھی یا پھر اس نے ساری کارروائی دیکھ لی تھی۔ جبھی تو اس نے فیض الحسن کی طرف سے شمسہ کو کرارا سا

جواب دیا تھا۔

’’دولت کے نشے میں مدہوش ہو کر انسانیت سے اتنا مت گرو کہ کل اپنی نظروں سے بھی گر جاؤ۔‘‘ شمسہ گال پر ہاتھ رکھے کبھی ماہ نور کو اور کبھی مجمع کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ حرکت ناقابلِ یقین تھی کہ اس کی بیسٹ فرینڈ ایک ملازم کے لیے اس کے منہ پر تھپڑ مارے گی۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا جھٹکا تھا۔ اس سے پہلے کہ معاملہ مزید بگڑتا، ایک لڑکا آگے بڑھا اور شمسہ کا ہاتھ پکڑ کا مجمع سے کھینچتا ہوا لے گیا۔ ماہ نور نے بھی اب اندازہ کیا تھا کہ وہ کس جگہ پر کھڑی ہے؟ اور ایک ڈرائیور کی طرف داری کر کے اس نے سب کی نظر میں اپنے آپ کو مشکوک بنا لیا تھا مگر معاملہ سب کا نہ تھا یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا، اس کے دل کا فیصلہ تھا۔ جس پر اس نے بلا چون وچراں عمل کیا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی تو ہونقوں کی طرح کھڑا فیض الحسن بھی اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کے لیے اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی، ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ماہ نور کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس سے پہلے وہ ہزاروں خیالوں اور وسوسوں میں کھویا ہوا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

’’ہم گھر نہیں جا رہے، گاڑی جناح گارڈن کی طرف موڑ لو۔‘‘ یہ حکم اس کی مالکن کا تھا مگر اس میں غرور اور تکبر یا پھر حاکمانہ انداز نہ تھا بلکہ بھیگی ہوئی آواز نے فیض الحسن کو شیشے سے پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ لرز کر رہ گیا تھا، ماہ نور کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

’’سڑک پر نگاہ رکھو فیض الحسن یہی تمہارا کام ہے۔‘‘ ماہ نور نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں کی چوری ہمیشہ کی طرح پکڑ لی تھی۔ اس کا رندھا ہوا لہجہ فیض الحسن کو سوگوار کر گیا تھا مگر وہ کچھ بھی بولنے کی پوزیشن میں نہ تھا اور نہ ہی کوئی فیصلہ کرنے کی سکت رکھتا تھا۔ شمسہ نے اس کی بےعزتی کی تھی۔ اس کے منہ پر تھپڑ مار کر اس نے اس غریب کو سرِ بازار ننگا کر دیا تھا۔ دولت کی چھاپ نے غربت پر چھانے کی کوشش کی تھی۔

جناح گارڈن میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک درخت تلے گاڑی روک کر فیض الحسن نیچے اترا اور ماہ نور کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔ وہ سوگوار کیفیت میں باہر نکل آئی۔ وہ اِدھر اُدھر اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے کہ فیض الحسن سے نظریں نہ ملانا چاہتی ہو۔ حالانکہ اس تمام معاملہ میں اس کا کوئی قصور نہ تھا وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔

’’میری وجہ سے تمہاری جو بےعزتی ہوئی ہے میں اس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔‘‘

[illegible] فیض الحسن [illegible] ماہ نور کی آنکھیں آنسوؤں کے نمکین پانی

سے بھری ہوئی تھیں اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ معافی مانگنے والے انداز میں جوڑے ہوئے تھے۔ فیض الحسن کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ ایلیٹ فیملی سے تعلق پھر اس کا اور اس کا رشتہ کیا تھا؟ ایک مالک اور نوکر کا۔ زمین اور آسمان کا، ندیا کے دو کناروں کا، دن اور رات کا، مخمل اور ٹاٹ کا آپس میں کبھی بھی ملاپ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ آج کے بنائے ہوئے اصول ہیں اور یہ وہ اصول ہیں جو اس دور کے پتھر کے انسانوں نے بنائے تھے۔ ان انسانوں نے جو خود کو غریبوں کا ہمدرد اور مسیحا کہتے ہیں۔ دراصل ان کے اصول بھی کانچ کے ہیں اور وہ خود بھی کانچ کے مسیحا ہیں کیوں کہ خود ہی اصول توڑ دیتے ہیں جیسے کہ اب ماہ نور کر رہی تھی۔

فیض الحسن نے بےاختیار ہو کر اس کے جڑے ہوئے ہاتھ پکڑ لیے۔

’’آپ مجھے کیوں گناہ گار کرتی ہیں؟‘‘ مگر ماہ نور کی روح میں ایک بےنام سا نشہ اترتا جا رہا تھا۔ وہ فیض الحسن کی طرف دیکھ رہی تھی مگر دل دل کی طرف متوجہ تھا۔ ’’آپ کا اس میں کوئی بھی قصور نہیں ہے اور پھر آپ میری مالکن ہیں۔ آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے ماہ نور بی بی!‘‘ فیض الحسن کو احساس ہوا تو اس نے یک دم گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ وہ شرمسار نظر آ رہا تھا مگر ماہ نور نے اس کی طرف تڑپ کر دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ جیسے کہ یہ لمحات رک جانے چاہئیں تھے مگر ظالم وقت بڑی تیزی سے گزرنے لگا تھا۔

’’شمسہ تم سے معافی مانگے گی، فیض الحسن!‘‘ اچانک اتنا بڑا فیصلہ سن کر وہ دنگ رہ گیا تھا کیوں کہ وہ ایک ماہ میں جان گیا تھا کہ ملک عبدالرحمٰن کیا چیز ہے؟ اس نے بڑے بڑے وزیر اور پولیس آفیسر اس محل میں سلام کے لیے آتے ہوئے دیکھے تھے۔ اگر یہ بات بڑے ملک صاحب تک پہنچ گئی تو یقیناً شمسہ تو اس سے معافی مانگے گی ہی مگر اس کی نوکری بھی جاتی رہے گی۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا اور پھر اگر شمسہ نے یہ بتا دیا کہ ماہ نور نے بھی ایک ملازم کی حمایت میں اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہے تو یقیناً فیض الحسن کی کھال میں بھی بھس بھروایا جا سکتا ہے، وہ کانپ کر رہ گیا تھا۔

’’آپ ایسا نہیں کر سکتیں ماہ نور بی بی۔‘‘ وہ لجاجت سے بولا۔

’’کون روکے گا مجھے۔ تم......؟‘‘ اس کی آنکھوں سے اب شعلے نکل رہے تھے۔ ’’اس نے تمہاری ہی نہیں میری بھی توہین کی ہے اور ماہ نور کبھی بھی یہ برداشت نہیں کرے گی۔‘‘

’’میری اتنی جرأت اور مجال نہیں کہ آپ کو روک سکوں مگر منت کرتا ہوں کہ میری نوکری نہ چلی جائے۔‘‘ وہ سماجت کرنے لگا۔ ’’آپ بڑے ملک صاحب کو کچھ نہ بتائیے گا، آپ کو

میری قسم بی بی!" یہ اس کی سادگی تھی یا اس کے دل سے نکلے الفاظ تھے۔ ماہ نور کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ فیض الحسن نے اسے اپنی قسم دی تھی اب تو فیصلہ بدلنا پڑے گا مگر کیوں؟ فیض الحسن اس کا کیا لگتا ہے؟

دل نے دھڑک دھڑک کر کوئی بھی فیصلہ سنانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں اور فیض الحسن کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ وہ جلد بازی میں کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔ اس بات کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس نے الفاظ جمع کیے اور غلطی کی گنجائش نہ رکھتے ہوئے ادائیگی کرنے لگا۔

"آپ نے میرا انتقام لیا، میری خاطر پورے کالج کے سامنے....." مگر اس کی بات درمیان میں ہی رہی۔

"تمہاری خاطر میں نے کچھ نہیں کیا، جو کچھ بھی کیا ہے میں نے اپنی خاطر کیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئی مگر فیض الحسن کو یہ بات سمجھانے کے لیے وقت درکار تھا جب کہ گنجائش نہ تھی۔

"اب اس واقعے کو بھول جانا" ماہ نور نے اس سے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔ "آئندہ ایسا کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوگا" اس کے آخری الفاظ انتقام سے بھرپور تھے جو فیض الحسن نے محسوس کر لیا تھا۔

گاڑی اپنی مخصوص جگہ پر جا کر رک گئی۔ فیض الحسن اپنے کوارٹر میں آ گیا تو چند منٹ بعد ہی ملکہ اور راجو اس کے لیے کھانا لے کر آ گئے۔ ہمیشہ کی طرح راجو ملکہ کو کھینچ کر ہی لے گیا تھا۔ فیض الحسن نے ہاتھ منہ دھو کر کھانا شروع کر دیا۔ وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ کوئی اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس کی حرکات کو بغور دیکھ رہا ہے۔ اس نے کھانا کھا کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اللہ رب العزت کا شکر ادا کر کے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے اور پھر وہ ان ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگا اور یہ سلسلہ کتنی ہی دیر جاری رہا۔ ماہ نور کی نظریں بھی بے ساختہ اپنے ہاتھوں پر اٹھ گئیں اس نے اپنے ہاتھوں کو چوم لیا تھا۔

اگلا دن کالج میں شمسہ کے لیے بہت برا تھا۔ پرنسپل نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر جھاڑ پلائی تھی اور ماہ نور سے معافی مانگنے کا کہا تھا مگر ماہ نور نے اسے اس شرط پر معاف کر دیا کہ وہ میرے ڈرائیور سے معافی مانگے۔ شمسہ کو یہ سب چار و ناچار کرنا پڑا تھا کیونکہ ملک عبدالرحمٰن کالج کو ہر سال اچھا خاصا چندہ دیتے تھے اور پھر بات بھی ان کی لاڈلی بہن کی تھی۔

شمسہ جانتی تھی کہ وہ چاہے کتنے ہی امیر باپ کی بیٹی ہے مگر اس شہر میں اور کالج میں ملک عبدالرحمٰن کی ہی سُنی جائے گی۔ اب وہ گیٹ کے باہر کھڑی ہو کر معافی مانگنے سے کترا رہی تھی۔ پرنسپل نے مزید رعایت یہ دی کہ فیض الحسن کو اپنے دفتر میں بلوایا اور شمسہ نے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی۔ وہ انتہائی نادم تھی مگر اس کے دل میں اپنی عزت خراب ہونے کا انتقام پل رہا تھا۔ ماہ نور دلی طور پر خوش تھی جب کہ فیض الحسن کو یہ اچھا نہ لگا تھا۔ وہ اپنی حیثیت اور اوقات میں ہی رہنا چاہتا تھا مگر اس کی مالکن کی ضد تھی کہ وہ پرنسپل کے آفس میں پہنچے تاکہ شمسہ اس سے معافی مانگ سکے۔ پتا نہیں وہ ماہ نور کو کسی بھی طرح یا کسی بھی حوالے سے ناراض نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

معطر و مطہر صبح کی مقدس روشنی اندھیرے سے اُجالے کا نمودار ہونا ماہ نور کے لیے بڑا دلچسپ منظر تھا وہ خود کو کوستی رہی کہ اتنی عمر یونہی نیند میں ہی گنوا دی۔ صبح صبح کا پُرنور اجالا اس کی آنکھوں کو فرحت بخش رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر کھڑکی میں کھڑے ہو کر صبح کے چاند کے غروب ہونے کا منظر آنکھوں میں بسایا۔ اذانِ فجر سن کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے کافی عرصہ سے فجر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ فجر کی نماز کیا، باقی بھی کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ آج دل کو عجیب سا سرور محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ نماز کیا ہے؟ کیسے ادا ہوتی ہے؟ کیوں ہے؟ اور کس کے لیے ہے؟ مگر دل اور روح کا رشتہ اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس کا قائل تھا۔ وہ پڑھی لکھی تھی، جانتی تھی کہ نماز کیسے پڑھتے ہیں۔

اس کے دل کی آواز نے اتنی سخت سردی میں بھی اسے وضو کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا کے جھونکوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ قبلہ کی طرف منہ کر کے اپنے کمرے میں بچھے ہوئے نرم و ملائم غالیچے پر اس نے کھڑے ہو کر رب تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنا شروع کر دی تو لطف و سرور نے اسے اپنی آغوش میں لپیٹ لیا۔ آنکھوں کے حلقے کمزور پڑ گئے تھے، طاقتور آنسوؤں نے انہیں توڑ کر اس کی گالوں سے بہنا شروع کر دیا تھا۔ تشکر الٰہی سے معمور ماہ نور نے رکوع اور سجدہ کی حالت میں خود کو عجیب سے نورانی ہالے میں محصور محسوس کیا۔ سجدہ سے جبیں اٹھی تو دل اب تک رب تعالیٰ سے دوری پر پھر آنسو بہانے لگا۔ وہ لبوں سے حمد و ثنا کی ادائیگی تو کر رہی تھی مگر دل سے خود کو رب تعالیٰ کی محبت بھری عدالت میں کھڑی محسوس کر رہی تھی۔ اس کی روح کانپ رہی تھی گویا کہ خداوند کریم اسے دیکھ رہا ہے۔

مدتوں بعد رب تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اس نے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس

کیا تھا۔ اس نے خشوع کے ساتھ نماز کی ادائیگی کی تھی۔ پھر اس نے تسبیح کی درود و سلام پڑھا اور ایک بار پھر شکرانے کے طور پر رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی جبیں کو جھکا دیا۔

''تمہارا خدا کے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ کوئی مددگار۔ ان کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا اور ولی بنائے، مکڑی کی سی ہے۔ جس نے جالا بنا اور بے شک سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا ہے۔''

فیض الحسن کی خوش الحانی قرآن کریم کی اس آیت کے ترجمے کے ساتھ اس کے دماغ اور دل میں گھس گئی۔ اس نے اپنی بھیگی آنکھوں اور بوجھل پلکوں کو کمرے کی چھت کی طرف اٹھایا جیسے کہ وہ خداوند کریم کو ڈھونڈ رہی ہو۔

''نہ سُست پڑو تم لوگ، نہ غمگین ہو اور تم ہی بلند ہو اگر تم سچے مومن ہو۔'' فیض الحسن نے اپنی آواز کی بدولت قرآنی آیت کے توسط سے ماہ نور کی توجہ ایک بار پھر اپنی طرف کر لی تھی، وہ کھڑکی میں آ کر بیٹھ گئی۔ فیض الحسن کی آواز کا سوز بتا رہا تھا کہ وہ کتنی محبت سے تلاوت میں محو ہے۔

ماہ نور کھڑکی میں بیٹھی قرآنِ کریم کی آیات کا ترجمہ سنتی رہی۔ فیض الحسن کی آواز کی عجیب سی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ اپنا مقام مرتبہ اور سٹیٹس بھولنے لگی تھی۔ دل کے کونے میں فیض الحسن مسیحا بن کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ من ہی من میں اسے چاہنے لگی تھی مگر اظہار کرنا ناممکن تھا کیوں کہ اس کے دل کی کیا خبر کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

مگر اسے کیا چاہیے ماہ نور جیسی خوبصورت لڑکی کسی کو چاہے۔ حسن کی ملکہ کسی پر فریفتہ ہو گی تو دوسرے کو کیا اعتراض ہوگا مگر نہیں یہ زبردستی اور زور کے سودے نہیں ہوتے۔ یہ دلوں کا بیوپار نہیں ہوتا۔ دکانداری نہیں کی جاتی، گھاٹے کھانے پڑتے ہیں، نقصان کرنا پڑتا ہے، تب جا کے کہیں نفع کی صورت نظر آتی ہے کیوں کہ دل پر کسی کا زور نہیں ہوتا مگر وہ فیض الحسن سے کیسے پوچھے کہ وہ بھی مجھے چاہتا ہے یا نہیں۔

وہ خاندانی رسم و روایات سے بغاوت کرنے چلی تھی۔ وہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے جا رہی تھی۔ وہ نالی کی اینٹ چوبارے کو لگانے والی تھی۔

وہ فیض الحسن کو نہیں بتائے گی، اس نے سوچا۔ وہ اس کی دل کی گہرائیوں سے پوجا کرے گی، خاموش پوجا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق لان میں ٹہل رہا تھا۔ اسے کل کے واقعات یاد آ رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگتا تھا۔ اس نے بے اختیار ماہ نور کے ہاتھ پکڑنے کی جرأت کی تھی اور اسے حیرت تب ہوئی کہ ماہ نور نے بالکل بھی برا نہ منایا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے ابھی تک ماہ نور کے وجود کی خوشبو آ رہی تھی۔

اِدھر ماہ نور کو صبح کے پُرنور اجالے نے اپنے ہالے میں لے لیا تھا۔ وہ فیض الحسن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مردانہ شخصیت کا جائزہ لے رہی تھی۔ گورا چٹا رنگ، لمبا قد، آنکھیں بھی بڑی بڑی، تراشیدہ مونچھیں اس کے اوپر والے گلابی ہونٹ کو چھپا کر رکھتی تھیں۔ بھرے ہوئے مضبوط جسم نے اس کی مردانہ وجاہت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ پھر اس کی خوش الحانی اور گفتگو کرنے کا خوبصورت انداز سبھی کچھ دل کو اچھا محسوس ہو رہا تھا۔

ماہ نور کو یک دم ایک خیال آیا وہ لرز کر رہ گئی اگر فیض الحسن نے کوئی بھی غلطی کی تو رحمٰن بھائی تو اسے نکال دیں گے اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟ ماہ نور مر جائے گی، مگر کیوں؟ ایک ملازم کی خاطر؟ ایک ڈرائیور کے لیے اپنے دل میں ایسے جذبات؟ یہ سب کیا ہے؟ کہیں یہ محبت تو نہیں؟ نہیں نہیں، یہ محبت نہیں ہے۔ محبت تو وہ ہوتی ہے جو اپنے جیسے لوگوں سے کی جائے، اپنے برابر کے لوگوں سے محبت ہوتی ہے، پھر یہ کیا ہے؟

''پگلی! یہ محبت نہیں ہے، یہ عشق ہے، عشق کبھی بھی اپنے برابر کے لوگوں سے نہیں ہوتا بلکہ یہ زمین و آسمان اور مخمل و ٹاٹ کے پیوند سے وجود میں آتا ہے۔ امیری غریبی اللہ کی تقسیم ہے مگر عشق کے لیے مخصوص دل ہوتے ہیں۔ جو ہر کسی کے سینے میں نہیں دھڑکتے۔'' یہ ماہ نور کے دل کی آواز تھی جو اس نے واضح طور پر سنی تھی۔ عشق، عشق اور بس عشق اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی۔

''معراجِ عشق منانے کے لیے والی کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خالقِ کائنات نے پل بھر میں اپنے حضور طلب کر لیا تھا۔ کہاں زمین؟ کہاں عرشِ بریں۔ مقصد صرف عشق کی معراج تھا۔'' اس کی آنکھوں کے کونے بھیگنے لگے تھے۔

وہ اپنے عشق کو بلند رکھنے کے لیے اپنا مان مرتبہ اپنا خاندان اور روپیہ پیسہ سب قربان کر دے گی۔ اب وہ انتہائے عشق کر کے دکھائے گی۔ عشق کی بلندیوں کو چھو کر دکھائے گی۔ یہ زمانہ، یہ سماج، یہ رسم و رواج، یہ دھن دولت اور امیر غریب کا فرق اس کی راہ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وہ ہر قیمت پر فیض الحسن کو پائے گی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ ہر دیوار پھلانگے گی۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن صفدر حسین سے ملنے چلا آیا تھا۔ آج اس کی ملاقات منظر علی سے بھی ہو گئی تھی۔ صفدر حسین نے فیض الحسن کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ فیض الحسن اس نوکری سے بہت خوش ہے۔

''تمہارے قرآن کریم کی پڑھائی کا کیا بنا؟'' اس نے صفدر حسین سے پوچھا۔ وہ پہلے ہی اپنی طبیعت کے مطابق فیض الحسن پر غصہ نکالنے کے لیے بے چین تھا، جھٹ سے بول پڑا۔

''آپ کو اس سے کیا؟ آپ تو بھگوڑے استاد ہو۔'' اس کے انداز پر منظر علی اور فیض الحسن دونوں ہی ہنس پڑے۔ وہ پھر بولا۔ ''تاریخ گواہ ہے کہ شاگرد کام چھوڑ کر بھاگتے رہے ہیں مگر اب سے مؤرخ جو بھی لکھے گا، تمہارا نام سنہری حروف میں لکھے گا کہ ایک استاد اپنے شاگرد کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔'' وہ فیض الحسن کو چڑا رہا تھا مگر آج اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ وہ کوئی بھی جواب نہ دے رہا تھا۔ یہی بات صفدر حسین کو کھٹک رہی تھی۔ منظر علی رات بھر کا تھکا ہوا تھا، سونے کے لیے چلا گیا۔ اب وہ دونوں تھے اور باتیں تھیں۔

''اچھا یہ تو بتاؤ...... وہ کیسی ہے؟'' صفدر حسین نے گفتگو کا آغاز کیا۔ فیض الحسن اس کا یہ سوال سن کر گڑبڑا گیا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا۔

''بہت خوبصورت ہے۔'' اس نے سرور اور مدہوشی کی کیفیت میں ڈوب کر جواب دیا تو وہ مشکوک انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''کبھی تمہارے ساتھ باہر گھومنے گئی؟'' صفدر نے دوسرا سوال کیا۔

''ہر روز بلاناغہ!''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ انتہائی بدصورت اور اندھی ہو گی؟''

''نہیں...... ! وہ بہت خوبصورت ہے، اس کی آنکھیں ہیڈ لائٹیں ہیں، جگ مگ کرتی رہتی ہیں۔ بس اس کی ہر چیز پر میرا قبضہ ہے۔'' فیض الحسن نشے سے سرشار کیفیت میں بول رہا تھا۔

''کبھی بانہوں میں بانہیں ڈال کر آئس کریم کھائی ہے؟''

''اس کی تو بانہیں ہی نہیں ہیں۔'' فیض الحسن نے دُکھ سے کہا تو صفدر حسین کے چہرے پر دُکھ اور کرب پھیل گیا۔

''کیا وہ ٹنڈی ہے؟'' وہ رو دینے والے انداز میں بولا تھا مگر فیض الحسن کا قہقہہ سن کر اس کی طرف تحیر آمیز انداز میں دیکھنے لگا۔

''ڈنگرا...... ! کبھی گاڑی بھی ٹنڈی ہوتی ہے......'' وہ اپنے قہقہے کو بمشکل روکتے ہوئے بولا تو صفدر حسین ادھر اُدھر ایسے دیکھنے لگا جیسے کہ وہ مارنے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ آج چاچا فیض الحسن نے اُسے خوب بیوقوف بنایا تھا اور وہ بن گیا تھا، بس وہ ہوا میں مُکّہ لہرا کر رہ گیا۔

''ٹھیک ہے، کبھی دادے کی اور کبھی پوتے کی۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں ہنستا ہوا بولا تو فیض الحسن پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تم لڑکی کی بات کر رہے تھے...... میں سمجھا گاڑی کی بات کر رہا ہے؟''

یہ فیض الحسن کی چھٹی کا دن تھا۔ اس نے صفدر حسین کے ساتھ مل کر اس دن کو خوب مزے سے گزارا اور مغرب کے وقت اُن کو خدا حافظ کہہ کر اپنی پہلی تنخواہ میں سے آدھے پیسے منظر علی کو جمع کروا کے واپس قصرِ ماہ نور چلا آیا تھا۔ ابھی وہ گیٹ میں داخل ہوا ہی تھا کہ ماہ نور اور ماں جی کو اپنا منتظر پایا۔ وہ لان میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ ماں جی کے بلانے پر اُن کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچنے پر اس نے دونوں کو سلام کیا اور نظریں جھکا لیں۔

''تمہیں یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے، فیض الحسن؟'' ماں جی کا انداز پیار سے بھرپور تھا۔

''نہیں ماں جی...... آپ کی دُعا سے کوئی تنگی یا پریشانی نہیں ہے۔'' وہ عاجزی سے بولا تھا۔

''کھانا تو ٹھیک وقت پر ملتا ہے یا نہیں۔'' اب کہ بار ماہ نور کے منہ سے پھول جھڑے تھے۔ وہ نگاہ اُٹھا کر دیکھنے کی جسارت کر گیا۔ اس کی آنکھوں میں پیار ہی پیار تھا، محبت اور خلوص کی شمعیں روشن دیکھ کر فیض الحسن کی گستاخ نگاہیں جھک گئیں۔

''جی...... کھانا بھی وقت پر ملتا ہے اور ناشتہ بھی۔ غرض کہ ہر طرح آرام اور سکون میں ہوں۔''

''کوئی پریشانی یا دُکھ تکلیف ہو تو ''مانو'' کو بتا دینا۔'' ماں جی نے اس بار نیا نام متعارف کروایا تو اس کی نظروں میں استفہامیت تھی۔ اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں کے خفیف اشارے سے بتایا کہ اسے ''مانو'' بھی کہتے ہیں۔

''جی...... ضرور بتا دوں گا۔'' ماں جی اندر کی طرف بڑھ گئیں کیوں کہ سردی بڑھنے کی وجہ سے وہ زیادہ دیر کھلی جگہ پر نہ ٹھہر سکتی تھیں۔ اب ماہ نور اور فیض الحسن رہ گئے تھے۔ باقی

لوگ اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ان سردوں میں آگ روشن تھی، کمروں کا ماحول انتہائی گرم تھا؛ اس لیے ماہ نور کو اس بات کا ڈر نہ تھا کہ کوئی کھڑکی کھول کر اُنہیں دیکھ لے گا۔

''تمہارے پاس کوئی سویٹر یا جرسی وغیرہ ہے؟'' ماہ نور نے نیا اور عجیب سوال کیا تو وہ چونک پڑا۔

''جی...... ایک جرسی ہے تو سہی، وہ منظر علی ہے نا میرا بھائی...... اس کے گھر رہ گئی ہے۔'' فیض الحسن نے جھوٹ بولا تھا اور ماہ نور اس کے لہجے کی چغلی کو سمجھ گئی تھی۔

''میرا ساتھ دو گے......؟'' فیض الحسن کا دل دھڑکنا تو نہ بھولا تھا مگر کچھ دیر کے لیے رک ضرور گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ ماہ نور بی بی کا سوال نہ آیا تھا۔

''میں کم عقل ہوں جی...... آپ کی گہری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔'' اس نے اچھے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

''بازار جانے تک میرا ساتھ دو گے کیوں کہ آج تمہاری چھٹی ہے۔ اس لیے تمہیں مجبور تو نہیں کیا جا سکتا نا۔'' ماہ نور کی وضاحت نے اس کے منہ سے ٹھنڈی سانس خارج کروا دی۔ وہ مطمئن انداز میں بولا۔

''میں تو آپ کا خادم ہوں، اب موجود بھی ہوں اور آپ کے ساتھ جانے کے لیے حاضر بھی۔''

''ٹھیک ہے، گاڑی نکالو ابھی جانا ہے۔'' وہ ''جی بہتر'' کہتا ہوا پورچ کی جانب چلا گیا۔

گاڑی شہر کے مشہور بازار میں پہنچ گئی تھی۔ جرسیوں اور سویٹرز کی دکانیں رات دیر تک کھلی رہتی تھیں۔ ابھی صرف شام کے سات ہی بجے تھے، وہ اب ڈرائیور کی یونیفارم میں نہ تھا، شلوار قمیص پہنے ہوئے اس کی شخصیت اور بارعب ہوگئی تھی، وہ دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

''تم بھی میرے ساتھ آؤ......'' یہ کہہ کر ماہ نور ایک طرف چل پڑی۔ اس نے گاڑی کو اچھی طرح لاک کیا اور مالکن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ماہ نور ایک جگہ رک گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی جیسے کہ فیض الحسن کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

''میرے ساتھ آئے ہو تو میرے قدموں سے قدم ملا کر چلنا سیکھو فیض الحسن!'' اس

کے لہجے میں عجیب سی اپنائیت تھی۔

وہ دونوں ایک ساتھ ہی دکان میں داخل ہوئے تو دکان دار اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ ان دونوں کو نوبیاہتا جوڑا سمجھا تھا کیوں کہ ماہ نور واقعی جگمگا رہی تھی جب کہ فیض الحسن بھی گریس فل لگ رہا تھا۔

''مجھے مردانہ جرسیاں اور سویٹرز دکھائیے۔'' ماہ نور نے کہا تو فیض الحسن حیران رہ گیا کہ مردانہ کس کے لیے؟ دکان دار نے اس کے آگے جرسیاں اور سویٹرز ڈھیر کی شکل میں رکھ دیئے۔ وہ باری باری ماہ نور کو جرسیاں کھول کر دکھا رہا تھا مگر وہ ناپسند کر دیتی۔

''آپ یہ ڈیزائن دیکھیں۔'' دکان دار نے ایک بہترین جرسی پکڑتے ہوئے اسے کھولا اور ماہ نور سے بولا۔ ''یہ یقیناً صاحب پر سوٹ کرے گی۔'' ماہ نور کے ہونٹ لرز کر رہ گئے، وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس نے فوراً فیض الحسن کی طرف دیکھا اس کی بھی نظریں جھک گئیں۔ ماہ نور نے فوراً وہ جرسی خرید لی اور دو عدد مزید سویٹرز لے کر دکان سے باہر نکل آئی۔ فیض الحسن بھی اس کے ساتھ تھا۔ دکان دار نے فیض الحسن کو ماہ نور کا خاوند سمجھا تھا۔ ماہ نور بھی خاموش اور فیض الحسن بھی خاموشی سے اس کے ساتھ قدم ملا کر چلا آ رہا تھا کہ ایک بھکاری لڑکا ان دونوں کے سامنے اچانک آ گیا۔ اُن کو اپنے تیز تیز قدم روکنے پڑے۔

''صاحب! اللہ کے نام پر دو، بیگم صاحبہ اللہ آپ کی جوڑی سلامت رکھے، آپ کو نظر نہ لگے۔'' وہ لڑکا بھیک مانگ رہا تھا یا...... اس سے آگے وہ دونوں کچھ نہ سن سکے، وہ پھر بولا۔

''صاحب اپنی بیگم صاحبہ کا صدقہ ہی دے دو، گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، اللہ آپ کی جوڑی سلامت رکھے، آپ کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔'' فیض الحسن نے اپنی جیب سے پچاس پیسے کا سکہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا مگر ماہ نور گم صم سی اس فقیر لڑکے کو جاتا دیکھتی رہی۔

''ماہ نور بی بی......!'' وہ فیض الحسن کے پکارنے پر چونکی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو کیا نام دے، وہ کوئی بھی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی، اس کا دل کبھی کسی انجانے خیال سے بلیوں اچھلنے لگتا اور کبھی اس کے چہرے پر افسردگی چھا جاتی۔ وہ گاڑی تک پہنچے تو ابھی ایک اور امتحان مقصود تھا۔ ایک ہٹا کٹا فقیر اُن کی گاڑی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''جو دے اسکا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔'' وہ چھ فٹ اونچا لمبا خاصا صحت

مند فقیر تھا۔ وہ فیض الحسن کے آگے کشکول کر کے اپنا سوال دہرا رہا تھا مگر دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھ رہے تھے، بالآخر فیض الحسن کے منہ سے نکلا۔

''قادر علی......؟'' وہ چند قدم آگے بڑھ گیا، اس نے فقیر کو گلے لگا لیا۔ ''قادر علی تم وہی قادر علی ہو نا، جو میرے گاؤں کے زمیندار کا بیٹا ہے، بتاؤ قادر علی، بتاؤ تم وہی ہو نا۔'' وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا، لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور ماہ نور خود کو ان کی شناخت میں نشانہ بنتا ہوا محسوس کر رہی تھی مگر وہ فیض الحسن کو کچھ نہ کہہ سکتی تھی، کیوں؟ بس وہ نہ جانتی تھی کہ کیوں؟

''فیض الحسن!'' قادر علی کے منہ سے نکلا تو فیض الحسن نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ پھر بولا ''فیض الحسن تمہاری منزل تمہارے سامنے ہے۔'' اس نے ماہ نور کی طرف اشارہ کیا تو ماہ نور گڑبڑا گئی کیوں کہ وہ اُن کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ''بہت سے کٹھن مراحل طے کرنا ہوں گے، گھبرانا نہیں، منزلیں اسی طرح ملا کرتی ہیں۔''

''اور تم قادر علی......؟''

''میری منزل کون سی ہے، تم اچھی طرح جانتے ہو فیض الحسن۔ ابھی تک بھٹک رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ ''جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔'' فیض الحسن اور ماہ نور کتنی ہی دیر اس فقیر کو جاتا دیکھتے رہے۔

ماہ نور کے ذہن میں قادر علی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''تمہاری منزل تمہارے سامنے ہے فیض الحسن۔'' پھر دکان دار اور فقیر بچہ جنہوں نے بالترتیب فیض الحسن کو ماہ نور کا صاحب اور خاوند سمجھا تھا۔ انجانی سی خوشی سے اس کا دل معمور ہو گیا تھا، بے نام اور عجیب سے رشتے نے اسے فیض الحسن کی زندگی میں رفیق بنا دیا تھا۔ وہ دلی طور پر بہت مسرور و شاد تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ یہ الفاظ یہ سوچ حقیقت ہو جائے مگر ڈور کا اگلا سرا ڈھونڈنے کے لیے اسے ''گنجلوں'' سے کھیلنا پڑے گا، اپنا آپ اُلجھانا پڑے گا، پتا نہیں قادر علی نے کس کٹھن مرحلے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ابھی فی الحال اس بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

گاڑی قصرِ ماہ نور سے چند میٹر دور تھی کہ ماہ نور نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا شاپنگ بیگ فیض الحسن کے برابر والی خالی سیٹ پر رکھ دیا۔

''یہ تمہارے لیے خریدے ہیں، انہیں تم استعمال کرو گے۔'' اس کے ہاتھ سٹیئرنگ پر لرز گئے تھے۔ وہ ان کی قیمت جانتا تھا، اس کی ایک ماہ کی تنخواہ سے زیادہ رقم بنتی تھی۔

''مگر ماہ نور بی بی......'' وہ مزید کچھ نہ بولا تھا کہ ماہ نور بول پڑی۔

''اگر مگر کی گنجائش نہیں ہے فیض الحسن۔ یہ تمہارا حق ہے اور ماہ نور کبھی کسی کا حق نہیں رکھتی۔ صبح سے تم یونیفارم نہیں پہنو گے بلکہ اپنے سوٹ پر ایک سویٹر پہن کر آؤ گے۔''

''مگر ماہ نور بی بی...... یہ تو کافی مہنگے ہیں۔'' گاڑی اب محل میں داخل ہو گئی تھی اور اپنے مخصوص مقام کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

''اس دنیا میں سب سے مہنگا اور قیمتی انسان ہے اور اس سے بھی مہنگی دوستی اور اس سے بھی مہنگی محبت ہے۔'' گاڑی رک چکی تھی، ماہ نور جا چکی تھی، فیض الحسن کے دل کے تار چھڑ گئے تھے۔ وہ پیکٹ کو ہاتھ میں پکڑے گاڑی سے اترا اور اپنی سوچوں اور خیالات میں مگن اپنے کوارٹر کی جانب چل پڑا۔

اس نے اندر داخل ہوتے ہی کنڈی لگائی اور لفافے کو کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک سویٹر کو پکڑ کر چوم رہا تھا۔ وہ جرسی جسے دکان دار نے کہا تھا کہ ''صاحب پر سوٹ کرے گی۔'' اس نے کئی بار آنکھوں سے لگائی تھی۔ یہ اس کی ماہ نور نے خریدے تھے، پہلی بار کسی نے اس کے لیے محبت اور خلوص سے یہ چیزیں خریدی تھیں۔ وہ سو سو بار قربان ہو رہا تھا، دروازے پر دستک سن کر وہ چونکا۔ اس نے جلدی جلدی تمام چیزیں اپنے پلنگ کے نیچے اپنے چھوٹے سے ٹرنک میں رکھ دیں۔ دروازہ ایک بار پھر زور زور سے بجنے لگا، اس نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور دروازہ کھول دیا، سامنے ملکہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی اور وہ اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھلتے ہی ٹرے آگے کر دی۔

''سرکار! کھانا نوش فرمالیں۔'' فیض الحسن اس کی اس ادا پر ہنسنے لگا۔

''ملکہ جی!'' وہ اس کے ہاتھوں سے ٹرے لیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی آمد کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ایک بھوکے کا خیال کیا ہے، بس اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔''

''ایک بات تو بتاؤ سرکار!'' وہ اندر آ گئی۔ فیض الحسن نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ ''سرکار جی...... آپ پڑھے لکھے لگتے ہو، پھر یہ ڈرائیوری کیوں کرتے ہو؟''

''بیوقوف ہو تم بھی۔'' وہ ہاتھ دھو کر صاف کر رہا تھا۔ تولیہ اس نے ایک مخصوص جگہ پر لٹکایا اور بولا۔ ''پڑھے لکھے ہوں یا اَن پڑھ بات تو عزت کی روٹی کی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر عزت کی روٹی دے رہا ہے۔'' وہ کھانا شروع کرنے والا تھا۔ پھر ملکہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم کب سے اس گھر میں ملازمت کر رہی ہو؟''

''لوکرلو بات..... ! گھر ایسے ہوتے ہیں، یہ تو محل ہے۔ گھر تو ایسے ہوتے ہیں جس جگہ پر تم بیٹھے ہو۔ تمہیں پتا ہے کہ اس تمام جائیداد کی وارث ماہ نور بی بی ہیں۔ بڑے ملک صاحب فوت ہونے سے پہلے یہ محل ان کے نام کر گئے تھے۔ باقی زمینیں وغیرہ عنایت صاحب اور رحمٰن صاحب کے نام پر ہیں۔'' وہ خاموش ہوئی تو فیض الحسن کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے کھانا کھانے کے لیے اٹھنے والے ہاتھ رک گئے تھے۔

''اور ایک خاص بات بتاؤں تمہیں.....؟'' وہ رازدانہ لہجے میں بولی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ جو بات کرنے والی ہے بہت اہم ہے۔ ''کل..... یعنی آنے والی کل کو ماہ نور بی بی کو لڑکے والے دیکھنے آرہے ہیں۔'' فیض الحسن کو کسی بچھو نے ڈنک مار دیا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور پلنگ سے نیچے اُتر آیا۔ ملکہ اس کی اس حرکت پر حیران ہوگئی تھی۔ فیض الحسن کے چہرے پر اس خاص بات کو سن کر کئی رنگ اپنا کرب چھوڑ گئے تھے۔ دُکھ اور غم کی آمیزش نے اس کا چہرہ تاریک کر دیا تھا۔ ملکہ پتا نہیں اور کیا کہنے والی تھی اس کی کیفیت بھانپ کر باہر نکل گئی۔

''یہ سب ٹھیک نہیں ہے فیض الحسن!'' اس کے ضمیر نے کہا۔ ''کیوں اپنی اوقات بھول رہے ہو؟''

فیض الحسن نے اپنی وکالت آپ شروع کر دی۔ ''میں غریب ہوں اور وہ امیر ہے تو یہ میرا قصور ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ مجھے چودھریوں کے کمیوں کے گھر پیدا ہونا ہے۔ ذرا سوچو اگر میری جگہ وہ ہوتی، اس کی جگہ میں ہوتا تب تم کیا کہتے؟''

''میں تب بھی تمہیں ہی تنبیہ کرتا، تب بھی تمہارا اور ماہ نور کا اسٹیٹس تمہاری راہ میں رکاوٹ بنتا۔'' ضمیر نے کہا۔

میں اس رکاوٹ کو نہیں مانتا، میں کسی حیثیت کو بھی نہیں جانتا، میں محبت کرتا ہوں، میں تمہاری کسی بات میں نہیں آؤں گا۔ محبت کسی بھی فرق اور حیثیت کو نہیں مانتی۔ چلے جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں ہر مشکل اور ہر امتحان میں پورا اتروں گا۔ میں محبت کرتا ہوں، ماہ نور سے محبت کرتا ہوں۔'' اپنے ضمیر کے ساتھ جنگ کی وجہ سے اس کے ماتھے پر اتنی سردی کے باوجود بھی پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے مگر وہ جونہی مڑا۔ اس کے قدموں تلے سے واضح طور پر زمین کھسک گئی، اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے کیوں کہ ماہ نور نہ جانے کتنی دیر سے اس کے پیچھے کھلے ہوئے دروازے میں کھڑی تھی، اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ کچھ

بھی نہ بولنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ ''کیا ماہ نور نے سب کچھ سن لیا ہے؟'' اس کے دماغ میں یہ سوال آیا تو فیض الحسن خود کو گناہ گار تصور کرنے لگا۔

''ماہ نور بی بی..... آپ.....؟'' اس کی زبان اور ذہن اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ وہ اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ماہ نور اندر آچکی تھی۔ یہ لمحات اور بات اس کے لیے مزید حیران کن تھی کیوں کہ ایک امیرزادی کا ایک معمولی سے ڈرائیور میں اس قدر دلچسپی لینا اور پھر سرد رات کی تاریکی میں اس طرح اس کے کوارٹر میں چلے آنا۔ اس کے لیے تو حیران کن تھا ہی مگر تاریخ بدلنے کے لیے بھی اس وقت ماہ نور کا اس کے کوارٹر میں موجود ہونا بہت بڑی دلیل تھی محبت اور عشق نے اپنی حیثیت نہ دیکھی تھی۔

''جن سے محبت کی جاتی ہے، انہیں صرف ناموں سے پکارا جاتا ہے، عہدوں سے نہیں۔'' اس کے منہ سے اپنی محبت کا اعتراف سن کر فیض الحسن کو تھوڑا سا حوصلہ ہوا مگر وہ ابھی تک حیرت واستعجاب کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔

''آپ!..... بیٹھیے نا، پہلی مرتبہ میرے غریب خانہ پر تشریف لائی ہیں۔'' وہ نروس ہو رہا تھا۔'' ماہ نور چلتی ہوئی پلنگ پر بیٹھ گئی، فیض الحسن کھڑا تھا۔ ''تم بھی بیٹھو فیض الحسن۔''

''آپ کے برابر.....؟ مگر کیسے.....؟'' وہ کانپ کر رہ گیا۔ ماہ نور کے چہرے پر تقدس پھیلا ہوا تھا۔ ''یہ فرق اور امتیازی حیثیت محبت کرنے سے پہلے سوچنی تھی۔ اب تو میں اور تم برابر ہی ہو گئے ہیں۔ محبت تو انسانیت کی معراج کو بلند رکھنے کا درس دیتی ہے۔'' وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوگئی اور فیض الحسن کے بالکل سامنے برابر آ کر کھڑی ہوگئی، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''تم محبت میں عہدوں کو شامل کر کے انسانیت کی توہین کرنے کے مرتکب تو نہ بنو۔'' فیض الحسن کی دنیا اتھل پتھل ہونے لگی تھی، وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کا مجرم ہوں، میں آپ کو تاحیات نہ بتانا چاہتا تھا مگر اندر کا آدمی بڑا بے وفا ہے۔ اس نے میرا مان اور غرور سب خاک میں ملا دیا ہے، میں آپ کی پوجا کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو دل میں بٹھا کر ہر روز ہر لمحہ آپ کا دیدار کرنا چاہتا تھا مگر افسوس ہے کہ آپ کے سامنے برہنہ ہو گیا۔'' وہ کرب اور دُکھ سے بولا تھا۔

''فیض الحسن..... ! جانتے ہو، میں نے کئی دعاؤں کے بعد تمہیں پایا ہے، بہت سی منتوں اور مرادوں کے بعد تم مجھے ملے ہو، جب سے تم یہاں آئے ہو میرے دل نے تمہیں

پانے کی بہت آرزو کی ہے اور دیکھو میری آرزو بالکل سچی ہے۔ تم میرے سامنے کھڑے ہو، میں تمہیں چھو سکتی ہوں، دیکھ سکتی ہوں، تم سے باتیں کر سکتی ہوں، یہ میرے مخلص ہونے کی نشانی ہے اور اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔''

''میں یقیناً خوش قسمت ہوں کہ کوئی مجھے بھی چاہتا ہے مگر ایک ڈر اور انجانا سا خوف دل میں گھر کر گیا ہے۔'' وہ خلاؤں میں گھورتا ہوا بولا تو ماہ نور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی، وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

''حیثیت۔'' فیض الحسن نے کہا تو وہ بڑے دُکھ سے بولی۔

''روپیہ پیسہ اگر سب کچھ خرید سکتا تو محبت اور عشق بازاروں میں بکتا ہوتا، ہر کوئی ان دو چیزوں کو خریدنا تو درکنار ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا، جانتے ہو کیوں؟''

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ پھر بولی۔

''اس لیے کہ جو بھی چیز بازار میں بکنے کے لیے آ جاتی ہے، وہ اپنی اہمیت اور افادیت کھو دیتی ہے۔ بکنے والے کو پتا تھا کہ میں یوسفؑ ہوں مگر خریدنے والے نے اس کا مول ایک دھاگے کی انٹی لگایا تھا۔'' وہ غمگین ہو رہی تھی۔ ''ہم اپنی محبت کو روپیہ پیسہ میں کبھی بھی تولنے نہ دیں گے، تم دیکھنا فیض الحسن میں تمہیں پانے کی خاطر پُر آسائش، پُرسکون اور ہر سہولت کو ٹھوکر ماردوں گی مگر کبھی بھی تمہیں کھونے کا تصور نہیں کر سکتی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی مگر فیض الحسن کی بھوک اور نیند بھی ساتھ لے گئی۔

رات سرد اور تاریک ہوتی جا رہی تھی مگر فیض الحسن کی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے قادر علی آ گیا تھا جس نے کہا تھا کہ ماہ نور تمہاری منزل ہے مگر کٹھن اور مشکل امتحانات سے گزر کر اسے حاصل کر سکو گے۔ قادر علی کو کیسے علم ہوا کہ میں ماہ نور سے محبت کرتا ہوں؟

قادر علی کو شروع سے ہی اللہ تعالیٰ کے واحد اور لاشریک ہونے کی لگن نے اپنے ہالے میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ایک طرح سے وہ بھی فیض الحسن کے مالکوں کی نسل سے تھا مگر اس کا رویہ ہمیشہ اس سے اچھا رہا تھا۔ اب وہ کاسہ ہاتھ میں پکڑے در در پہ جا کر بھیگ مانگنے کی صدا لگا رہا تھا۔ وہ عشق الٰہی میں فقیر بن گیا تھا اور فیض الحسن سے کہہ گیا تھا کہ منزل تمہارے سامنے خود چل کر آ جائے گی۔ ابھی خود کو خود سے چھپاؤ فیض الحسن۔ وقت کا انتظار کرو، وقت خود فیصلہ کرے گا۔

ماہ نور نے اپنی دوستوں میں سے شمسہ سے خصوصی طور پر فیض الحسن کا ذکر کیا تھا مگر وہ اپنے ہی چکر میں پڑ گئی تھی۔ ابھی تو اس نے شمسہ سے لڑائی مول لی تھی۔ ابھی اس نے اپنے خاندانی وقار، نام اور مرتبے کو بھی قربان کرنا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ رحمٰن بھائی کسی صورت بھی فیض الحسن کو اپنا بہنوئی نہیں مانیں گے کیوں وہ انسان تو تھا مگر خاندانی بندہ نہ تھا اس کے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا۔ گاڑی، بنگلہ، بینک بیلنس نہ تھا۔ اس کی زمینیں اور کاروبار نہ تھا اور یہی اس کا سب سے بڑا جرم تھا۔

ماہ نور نے ایک پلان بنایا کہ وہ فیض الحسن کو گاڑیوں کا شوروم بنا کر دے گی۔ اس پر محنت سے وہ ایک دن ملک عبدالرحمٰن کے برابر آ کھڑا ہوگا اور اس طرح کسی کو بھی اس کی پسند پر اعتراض نہ ہوگا۔ اس نے اپنے پلان پر عمل کرنے کا جامع اور مضبوط لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔ بس اب فیض الحسن کو منانا باقی تھا۔

اگلی صبح فیض الحسن شلوار قمیص پر نئی جرسی پہنے ماہ نور کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی۔ اس نے ایک نگاہ اٹھا کر فیض الحسن کو دیکھا تھا اور اس کے کانوں میں دکاندار کے الفاظ گونج اٹھے۔ ''یہ جرسی صاحب پر سوٹ کرے گی۔'' وہ بہت سمارٹ اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ آرام سے چلتی ہوئی اپنی سیٹ سنبھال چکی تھی مگر فیض الحسن کے دوسری طرف سے آنے سے پہلے ہی ماں جی نے اسے پکارا۔

''فیض الحسن! کیا تمہاری یونیفارم دھونے والی ہے؟''

''نہیں ماں جی......!'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ماہ نور نے کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور بول پڑی۔ ''مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے سادہ لباس میں ہی ڈرائیونگ کا کہا ہے۔''

''اچھا......اچھا۔ تُو بہت پڑھ لکھ گئی ہے، اپنی مرضی کرتی ہے۔'' ماں جی اندر کی جانب چل پڑیں جب کہ فیض الحسن نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''فیض الحسن! گاڑی کی رفتار کم کر لو۔'' ماہ نور نے بڑی سڑک پر آتے ہی کہا تو اس نے بیک مرر سے دیکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔

''بہت خوبصورت لگ رہے ہو۔'' یہ پہلی تعریف تھی جو کسی خوبصورت لڑکی نے فیض الحسن کی کی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ سب آپ کی صحبت اور محبت کا فیضان ہے۔'' فیض الحسن نے کہا تو وہ ماہ نور حیرانگی

سے بولی۔

''کبھی کبھی تمہاری باتیں، سقراط، بقراط اور ارسطو جیسی لگتی ہیں مگر تم کہتے ہو کہ تم پڑھے لکھے بالکل نہیں ہو۔''

''میں ان لوگوں کا شناسا نہیں ہوں ماہ نور بی بی مگر میرا دل اور تجربہ کہتا ہے کہ علم اللہ کی عطا ہے، یہ ڈگریوں اور کاغذی اسناد کا محتاج نہیں ہوتا۔''

''فیض الحسن!''

''جی ماہ نور بی بی۔''

''میرا خیال ہے بلکہ میرا حکم ہے کہ مجھے ''بی بی'' نہ کہا کرو۔ اب تم میرے ملازم نہیں ہو۔''

''کیا مطلب بی بی؟'' اس نے گھبرا کر گاڑی سڑک کے درمیان ہی روک لی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ماہ نور کی طرف مڑ کے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ ''کیا آپ مجھے نوکری سے نکال رہی ہیں؟'' ماہ نور اس کے اس انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تو فیض الحسن کی حیرت مزید بڑھ گئی۔

''تمہاری سادگی نے پہلے دن سے آج تک ماہ نور کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ تمہارا عہدہ بڑھ گیا ہے فیض الحسن۔ اب تم میرے دل کے راجہ ہو، ماہ نور کے دل کی سلطنت، تمہاری حکمرانی کی منتظر ہے۔'' اس نے اشارے سے اسے گاڑی چلانے کا کہا۔ ''مجھے صرف ماہ نور کہا کرو۔''

''ماہ نور......؟'' وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا کیوں کہ ان کے پیچھے آنے والی گاڑیوں نے ہارن بجانا شروع کر دیئے تھے۔ ''صرف ماہ نور...... بی بی؟''

''تم مجھے بی بی کہتے ہو تو لگتا ہے کہ میں بوڑھی مائی ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تو فیض الحسن بھی ہنسنے لگا تھا۔ کالج کے سامنے اُتار کر وہ جانے لگا تو ماہ نور خلافِ توقع واپس مڑی اور فیض الحسن کو پیار کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ اس کے اس انداز پر ٹپٹا گیا۔

''آج بارہ بجے آ جانا، میں گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ چل دی فیض الحسن حیران تو بہت ہوا مگر اُلٹ ہوتے ہوئے نظام میں اس کو لطف محسوس ہونے لگا تھا۔ پہلے وہ ماہ نور کا انتظار کیا کرتا تھا مگر آج وہ اس کا انتظار کرے گی۔ وہ گاڑی کو سٹارٹ ہی کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں جانی پہچانی آواز پڑی۔

''جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔'' وہ قادر علی کو پہچان گیا تھا اس نے کھڑکی سے اپنا کاسہ اندر کر کے اپنا سوال دہرایا تھا مگر فیض الحسن دروازہ کھول کر باہر نکلا اور قادر علی کو گلے لگا لیا۔

''قادر علی! کٹھن راہوں پر چلنے سے پاؤں زخمی تو ہوتے ہی ہیں مگر اس طرح ہر کسی کے آگے اپنا کاسہ کرنے سے روح بھی گھائل ہو جاتی ہے۔ بس کر میرے یار...... واپس لوٹ جا......''

''میں نے بھیک مانگی ہے، خدا کی تلاش میں نکلنے والے فقیروں کو شیطانی مشورے نہیں دیا کرتے فیض الحسن!'' وہ ناراض لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فیض الحسن مزید کچھ بولتا وہ ایک بار پھر بول پڑا۔

''فیض الحسن! میں تو رب واحد کی محبت میں دربدر بھیک مانگ رہا ہوں۔ یہ اس کی طرف سے میرا امتحان ہے۔ میں کسی قابل نہیں کہ اس کی ڈالی ہوئی کسی آزمائش پر پورا اُتروں۔ میں تو گناہ گار ہوں، بس اس کا حکم آتا ہے، چل پڑتا ہوں مگر تب دیکھوں گا جب تم ایک انسان کی محبت میں خود کو بھول بھال کو فقیر بنو گے، انسانی محبت کے فقیر، میں تو اللہ کا فقیر ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا مگر فیض الحسن کے اندر کی دنیا کو ہلا کر رکھ گیا تھا۔ وہ کیا کہہ گیا تھا؟ اب اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔

قادر علی یقیناً ایک عظیم عاشق تھا۔ عشق الٰہی اور حُب الٰہی میں اپنے آپ کو تیاگ کر در در پر جا کر بھیک مانگنا ہی محبت تھی۔ فیض الحسن کی سمجھ میں یہ بات شاید آئی تھی یا نہیں مگر وہ لرز کر رہ گیا تھا۔ ''قادر علی! خداوند کریم تمہیں کامیابی دے۔'' اس کی بڑبڑاہٹ صرف وہی سن سکا تھا۔

☆=====☆=====☆

قادر علی کی ملاقات بہت دنوں بعد رانی سے ہوئی تھی۔ وہ سوکھ رہی تھی، اس کے چہرے کا رنگ بھی سیاہ ہو رہا تھا، قادر علی کے لیے اچنبھے کی بات تھی، وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یہ تمہاری حالت کیا سے کیا بن گئی ہے؟'' وہ اس وقت اس کے صحن میں کھڑی تھی۔ قادر علی ابھی واپس آیا ہی تھا۔ دن بھر جگہ جگہ گھومنے سے اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے مگر رانی دروازہ کھولتے ہی اندر داخل ہو گئی تھی۔

''قادر علی! میں نے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق روزِ محشر معاف فرما دے گا مگر حقوق العباد معاف نہیں کرے گا۔'' قادر علی سن کر لرز اُٹھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے

قریب تھیں۔ رانی کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟

''قادر علی! اب میں ریڈیو پر اسلامی پروگرام سنتی رہتی ہوں۔ میرے پتا جی نے مجھے اس پاداش میں تین ہفتوں تک کوٹھڑی میں بند رکھا، کھانا پانی بھی کم ہی دیا مگر میرے منہ سے میرے دل سے نکلنے والی صدا کو نہ روک سکا۔ قادر علی! مجھے اللہ سے ملواؤ، مجھے اللہ سے ملواؤ قادر علی اللہ، اللہ، اللہ!'' وہ یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ قادر علی کے جسم کو جھٹکے لگنے شروع ہو گئے تھے وہ اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا اور تیورا کر گر پڑا۔

☆=====☆=====☆

حصہ دوم

فیض الحسن پورے بارہ بجے کالج کے گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ وعدے کے مطابق ماہ نور اس کی منتظر تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ماہ نور نے حکم جاری کیا کہ گاڑی جناح پارک کی طرف موڑ لو۔ حکم کی تعمیل ہوئی تھی۔ گاڑی اپنی مقررہ جگہ پر رک گئی۔ دونوں گاڑی سے اترے اور گھاس پر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اور بھی جوڑے بیٹھے ہوئے تھے جو کہ دھوپ کی تمازت کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے سنہرے سپنے بننے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ اب ماہ نور اور فیض الحسن کو کوئی بھی مالکن اور ملازم نہ سمجھ سکتا تھا۔ فیض الحسن کا لباس بھی اسے گاڑی کا مالک ظاہر کر رہا تھا اور ماہ نور کا کزن یا پھر درست یا پھر خاوند۔ کسی کو بھی کوئی شک نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے دونوں ہی بے فکری سے بیٹھ گئے۔ فروٹ چاٹ کا آرڈر دے دیا گیا تھا۔ ماہ نور کی نسبت فیض الحسن خاصا نروس دکھائی دے رہا تھا۔

''فیض الحسن! زندگی اچھے اور باوقار انداز سے گزارنے کے لیے انسان کو باوقار اور قابلِ عزت کاروبار کرنا پڑتا ہے۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو یہ ظالم سماج تمہیں اپنے بے رحم قدموں کی ظالمانہ ٹھوکروں سے کچل دے گا۔ تمہاری حیثیت اور مقام تم سے انسان ہونے کا حق چھین لے گا۔'' وہ استعجاب سے ماہ نور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گہری گہری آنکھوں میں ڈوبنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے پھولوں کی پتیاں جھڑ رہی تھیں۔ وہ بڑی محویت سے ماہ نور کی گفتگو سن رہا تھا۔ ''میرا ہاتھ تھام کر زندگی بھر کا کر فیصلہ تو تم نے کر لیا ہے مگر میرے خاندان کی روایت اور وقار اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس میں شامل ہونے کے لیے تمہیں بھی ویسا ہی بننا پڑے گا۔''

''مگر کیسے؟'' وہ لجاجت سے بولا تو ماہ نور نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اس کی روح تک

میں کرنٹ دوڑ گیا۔

''میں تمہیں اس قابل بناؤں گی، اُن کے قد کے برابر تمہارا قد کروں گی۔'' وہ محبت سے بولی۔ ''میں تمہیں اس شہر کا ایک بڑا بزنس مین بناؤں گی۔'' فیض الحسن نے بے یقینی سے کہا۔

''کسی جادو کے زور سے؟''

''روپیہ سب سے بڑا جادو ہے جس کی جیب میں ہے وہ اس دنیا کا سب سے بڑا جادوگر ہے۔ ہر چیز اس کے تابع و مطیع ہے، ہر چیز کو وہ اپنی انگلیوں پر نچا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ انسانوں کو بھی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''خالی جیب والا جادوگر۔ اس دنیا میں کیسے زندگی بسر کرتا ہے؟'' وہ ماہ نور کی کسی بھی بات کو سمجھنا نہیں چاہتا تھا یا پھر جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

''میں اپنے حصے کی دولت اور سرمائے سے تمہیں اپنے بھائیوں کے برابر کھڑا کرواؤں گی۔'' ماہ نور کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور کھڑا ہو گیا۔ ماہ نور بھی کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کی طرف حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ شاید اسے ماہ نور کی بات کا جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے اور ماہ نور کے لیے یہ جان کنی کے لمحات تھے۔ اس سے ضبط نہ ہوا تو اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''فیض الحسن!'' وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''میری آنکھوں میں دیکھو۔''

''میں اپنی نظروں میں گر گیا ہوں ماہ نور بی بی!'' اس کے فقرے میں کرب اور دکھ نمایاں تھا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکی۔'' وہ اس کے اس انداز پر روہانسی ہو رہی تھی۔

''میں نے جب تک اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا تب تک میں بادشاہ تھا مگر آج میں فقیروں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہوں۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو ماہ نور مزید پریشان ہو گئی۔

''فیض الحسن! خدا کے لیے پہیلیاں مت بجھواؤ، میرا دل پھٹ جائے گا۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''آپ نے تو مجھے اپنے روپے اور پیسے کے جادو سے جیتے جی مار دیا ہے بی بی، مجھے

خدا کے لیے فیض الحسن ڈرائیور ہی رہنے دیں، اسی میں میری...... میری اپنی نظروں میں عزت ہے۔'' وہ آنکھیں صاف کرتا ہوا بولا، تو ماہ نور دُکھی انداز سے بولی۔

''میں تمہیں اب کبھی بھی کھونا نہیں چاہتی اور اس روپ اور عہدہ میں میرے بھائی تمہیں کبھی بھی قبول نہیں کریں گے۔''

''محبت اور عشق اگر عہدوں کا محتاج ہوتا تو انارکلی بھی کسی کنیز کی بیٹی نہ ہوتی۔ وہ بھی کسی بادشاہ کی شہزادی ہوتی اور پھر شہزادہ سلیم کے برابر کھڑی ہوتی مگر تاریخ گواہ ہے بی بی کہ انارکلی کا نام شہزادہ سلیم سے پہلے لیا جاتا ہے کیوں کہ اس کی محبت پُر خلوص اور دولت کی ہوس سے پاک تھی۔'' وہ اب ماہ نور کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

''میرا مقصد تمہاری توہین کرنا نہیں تھا، میری خود غرضی سمجھ لو کہ میں تمہیں کسی بھی قیمت پر خود سے جدا نہیں دیکھ سکتی۔'' فروٹ چاٹ والا پلیٹیں رکھ کر جا چکا تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر بیٹھ گئے تھے۔

''اپنی محبت پر بھروسہ رکھیے ماہ نور بی بی۔ فیض الحسن نے آپ کی دولت اور جائیداد سے محبت نہیں کی ہے بلکہ آپ کی صورت کا دیوانہ ہوا ہے۔ ویسے بھی محبت صرف پانے کا ہی نام نہیں ہے۔ محبت میں کھونا اور قربانی دینا ہی محبت کی معراج ہے۔'' فیض الحسن ماہ نور کی نظروں میں مزید بڑا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی عظمت اور اعلیٰ سوچ کی قائل ہو گئی تھی۔

''زندگی کی آخری سانس اور دل کی آخری دھڑکن تک میرے لبوں پر آپ کا ہی نام ہو گا۔ یہ میرا وعدہ ہے، محبت کی راہوں میں جتنے بھی کانٹے آئیں گے آپ مجھے خود سے ایک قدم آگے ہی پائیں گی۔ یہ ایک غریب ڈرائیور کا اپنی محبت پر قائم اعتماد ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر چاٹ کی پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی، وہ خاموشی سے چاٹ کھانے لگے۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ کو لڑکے والے دیکھنے آ رہے ہیں۔'' فیض الحسن نے کہا تو ماہ نور کا قہقہہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو اُن کی طرف متوجہ کر گیا۔ فیض الحسن حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ ''یہ تو میری چال تھی، ملکہ کو استعمال کیا تھا، بس مجھے شک تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں، یہی دیکھنے کے لیے ملکہ نے میری سکیم کے مطابق رشتے کی بات تمہارے ذہن میں بٹھا دی اور نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

''اگر آپ کی یہ شرارت میری جان لے لیتی تو......؟'' وہ اس کی ہنسی سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

"یہ کیا جان جانے کی باتیں شروع کر دیں ہیں۔ یاد رکھنا اب تمہاری جان میری امانت ہے اور یہ دل اب تمہاری امانت ہے۔" ماہ نور نے آخری فقرہ اپنے دل کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

"ایک وعدہ کرو کہ آئندہ تم مجھے ماہ نور بی بی نہیں کہو گے، صرف ماہ نور کہو گے۔" وہ اس ادا سے بولی تھی کہ فیض الحسن کو اس پر بے اختیار پیار آ گیا تھا۔ اس نے آنکھوں سے ہی ماہ نور کو چومنا شروع کر دیا تھا۔

☆=====☆=====☆

"نورانی اجالے سے نکلنے والے ہاتھ نے آگے بڑھ کر رانی کو تھام لیا تھا۔ اس کے ارد گرد نور ہی نور چھایا ہوا تھا۔ رانی اس نورانی ہیولے کی شکل نہ دیکھ سکی تھی۔ کیچڑ سے لتھڑی ہوئی رانی کو اپنی حالت کا خیال آیا تو اس کی نگاہ اپنے لتھڑے ہوئے وجود پر پڑی تو وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس کے جسم اور کپڑوں پر کیچڑ کا معمولی سا چھینٹا بھی نہ تھا۔ اس نے گھبرا کر نظریں اوپر اُٹھائیں تو حیرت دوچند ہو گئی۔ اب وہ اکیلی اُجاڑ اور بے آباد جگہ پر کھڑی تھی۔ اس کا حلق پیاس کی شدت سے کانٹا ہو رہا تھا۔ وہ چیخ و پکار کرنے لگی۔ مگر دور دور تک کوئی بھی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ وہ ایک جانب بھاگنے لگی اور کتنی ہی دور تک بھاگتی گئی۔ نامعلوم ساعتوں کے لیے، اس کی کوئی منزل اس کے سامنے نہ تھی مگر وہ پانی کی تلاش میں دیوانہ بھاگ رہی تھی۔ جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے رونا شروع کر دیا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے آنسوؤں کی سچائی کے نمکین قطرے آسمان والے کو پسند آ گئے۔ اس کے آنسو بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو گئے۔ دور سے ایک اونٹ سوار کو آتے دیکھا، اس اجاڑ اور بے آباد جنگل میں اونٹ کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگروؤں کی جھنکار اور گلے میں لٹکتے ہوئے ٹل کی آواز نے عجیب ماحول بنا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ آوازیں مل کر آنے والے مسافر کا استقبال کر رہی ہیں۔ وہ اونٹ سوار رانی کے پاس درخت کے نیچے پہنچا تو رانی اُسے دیکھ کر چیخ پڑی۔

"قادر علی...... قادر علی تم...... تم قادر علی ہو نا۔ مجھے اللہ کے نام پر پانی پلا دو۔ تمہیں تمہارے اللہ کا واسطہ قادر علی۔ مجھے پانی پلا دو، میں مر جاؤں گی قادر علی۔ اللہ کے لیے مجھے پانی پلا دو۔" اونٹ سوار جس نے قیمتی پوشاک زیب تن کر رکھی تھی۔ سر پر عمامہ اور ہاتھ میں پانی کی چھاگل تھی۔ اس کے عمامے کے ماتھے پر ایک بہت بڑا یاقوت چمک رہا تھا۔ اس نے

رانی کی فریاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی چھاگل اوپر سے اس کی طرف پھینک دی۔ پیاسی اور بے قرار رانی نے چھاگل کو منہ لگا کر غٹاغٹ پانی پینا شروع کر دیا۔ جب وہ سیر ہو کر پانی پی چکی تو دیکھا کہ قادر علی بمعہ اونٹ کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ ادھر اُدھر ڈھونڈنے لگی، وہ بے ساختہ پکارنے لگی۔

"اللہ میری مدد فرما، اللہ میری مدد فرما۔ اللہ تجھے تیرے پیاروں کا واسطہ میری مدد کر۔"

وہ یہ کہتی رہی۔ اس کی ماتا اور پتا پریشانی کے عالم میں اس کے سرہانے کھڑے اس کی دگرگوں کیفیت کو دیکھ رہے تھے اور اللہ کی وحدانیت اور جاہ و جلال سے پکارے جانے والے نام کو رانی کے منہ سے سن کر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں ان کا ساتھ چھوڑنے لگیں تو اس کی ماں نے رانی کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

"کلموہی، حرامزادی، اُٹھ جا!" وہ دونوں ہاتھوں سے رانی کو پیٹنے لگی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے ارد گرد کا ماحول دیکھا تو مزید گھبرا گئی۔ وہ جنگل، وہ اونٹ سوار، اس کی پیاس...... پیاس سے یاد آیا تو اس نے اپنے منہ میں پانی کا ذائقہ محسوس کیا۔ تب اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے گلے سے نیچے اپنی قمیص کو بھی پانی سے بھیگا ہوا دیکھا۔

"ماتا جی، پتا جی، وہ اونٹ والا کدھر گیا؟" وہ حیرانی سے بولی تو اس کے پتا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے رُخسار پر مار دیا۔

"حرامزادی، کتیا کی بچی! مجھے بیوقوف سمجھتی ہو۔" مُسلوں کے اللہ کو پکارتی ہو اور مجھے بے سروپا باتوں میں بہکا رہی ہو۔ میں کہتا ہوں اپنے لچھن ٹھیک کر لو رانی ورنہ......" وہ آگ اگلتا ہوا اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کر غصے سے آگ بگولا ہوتا ہوا چلا گیا۔

"ماتا یہ پتا جی کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ تھپڑ کھا کر بھی نہ سنبھلی تھی۔ بس اس کی لو تو ایک ہی طرف لگی ہوئی تھی۔

"رانی! میری بیٹی تجھے بھگوان کا واسطہ۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے؟ جس نے تمہیں اپنے دھرم سے بہکایا ہے۔" وہ اسے پکار رہی تھی۔ "میری بیٹی بتا دے، تیرے پتا جی اس کا کریا کرم کر دیں گے۔" وہ ہاتھ پر ہاتھ ایسے مار رہی تھی جیسے قصائی قیمہ کر رہا ہو۔

"آپ میری بات کا وشواش کریں......" وہ بات پوری نہ کر پائی تھی کہ لکشمی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"بکواس کرتی ہو تم، تو کسی قادر علی کا نام لے رہی تھی۔ بھگوان مجھے معاف کرے۔" وہ

کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی تھی۔ اس کے منہ سے قادر علی کا نام سن کر رانی سکتے کی حالت میں آ گئی۔

''بتاؤ یہ قادر علی کون ہے؟'' لکشمی نے نیا سوال کر دیا تھا۔ رانی نے سکھ کا سانس لیا کہ یہ لوگ تو کیا بلکہ محلہ کا کوئی بھی فرد اس ہیجڑے کا اصل نام نہ جانتا تھا جو آج کل فقیر بنا ہوا تھا۔ گویا کہ کوئی بھی قادر علی کے کردار یا اس کی شخصیت پر رانی کے حوالے سے شک نہ کر سکتا تھا مگر اس لمحہ ماں کو مطمئن کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

لکشمی اس کی چارپائی کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ سوچوں میں گم رانی کو شربت سے بھی شیریں پانی کا خیال آیا تو اس کی زبان نے فرحت اور ٹھنڈک محسوس کی۔ آج ہی قادر علی سے ملنا پڑے گا۔ وہ اپنی اس حالت کا ذمہ دار قادر علی کو ٹھہرانے لگی۔ اس کی نظریں طاق میں رکھے ہوئے ہنومان کے مجسمے پر پڑیں تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے اس مٹی کے بت سے مرادیں مانگنے والے کتنے بیوقوف اور جاہل ہیں۔ کیا یہ اپنے ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی اُڑا سکتا ہے، خود کو سنوار سکتا ہے۔ یہ کیسا بھگوان ہے جو اپنی صفائی ستھرائی کے لیے انسانوں کا محتاج ہے۔ اس پر پڑی ہوئی گرد اگر انسان صاف نہ کرے تو کئی کئی سال یونہی گزر جائیں۔ اتنے پڑھے لکھے اور تہذیب کا پرچار کرنے والے ہندو بھی اس توہم پرستی کا شکار تھے مگر یہ اللہ کے رنگ تھے، اللہ کی قدرت تھی۔ پرانے وقتوں میں آگ، پانی، درختوں اور پتھروں کو پوجنے والے بھی رزق کھاتے اور اپنے اپنے خداؤں کے گُن گاتے تھے مگر وہ سب بھی اللہ کی رضا اور مرضی سے ہوتا تھا۔ کسی کو نظر نہ آنے والے اللہ نے اس دنیا کو عجیب اور انوکھے کھیل میں اُلجھایا ہوا ہے۔ کوئی اس کی راہ پر چلنا چاہے تو کڑے امتحان اور آزمائشیں اس کی راہ میں کانٹوں کے ہار لیے اس کے استقبال کے لیے منتظر ہوتی ہیں مگر ان آزمائشوں اور کڑے امتحانات سے گزرنے کے بعد جب وہ شخص اللہ کی پہچان پا لیتا ہے تو پھر اس پر اسرارِ خداوندی عیاں ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہتا۔ پھر وہ اللہ والا بن جاتا ہے۔ اللہ کا ولی، اللہ کا دوست، حبیب اللہ اور رفیق اللہ بن جاتا ہے۔

یہ تمام باتیں اس نے ریڈیو سے سنی تھیں۔ اب اس کے دل و دماغ میں ان کی بازگشت گونج رہی تھی۔ اس کا یہ ارادہ اور پختہ ہو گیا کہ وہ ہر امتحان اور کڑی آزمائش سے گزر کر اللہ کو پانے کی کوشش کرے گی۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن کی میٹھی اور پیاری آواز نے چڑیوں کو چہچہانا بھلا دیا تھا۔ ماہ نور نماز کے بعد کھڑکی میں کھڑی کلامِ الٰہی سے مستفید ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور کان ان الفاظ کو سن کر رونگٹے کھڑے کر رہے تھے جو فیض الحسن کی زبان سے ترجمۂ قرآن کی صورت میں ادا ہو رہے تھے۔ وہ پُرسکون اور مطمئن تھی، خلافِ توقع اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو اس کی نظریں گھڑی پر پڑیں، صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ اس سے پہلے کبھی بھی کسی نے اس کے دروازے پر دستک نہ دی تھی۔ وہ حیرت زدہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ایک بار پھر دستک ہوئی اور اس بار ماں جی کی آواز بھی سنائی دی۔

''مانو بیٹی!'' اس نے جلدی سے دروازہ کھولا تو سامنے ماں جی کھڑی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور ماں جی اندر چلی آئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی اُن کے کانوں میں فیض الحسن کی آواز پڑی جو خوش الحانی سے قرآنِ کریم پڑھ رہا تھا، وہ بھی کھڑکی کے پاس چلی آئیں اور تلاوتِ قرآن کریم سے روح کو منور کرنے لگیں۔ ''اللہ مجھے معاف فرمائے۔'' اُن کی زبان سے نکلا۔ مانو نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اُنہیں روکنا چاہتی تھیں مگر آنسو بے اختیار بہہ نکلے اور ماں جی کا دامن بھگونے لگے۔

''تمہارے بابا جان کی آواز میں یہی شیرینی اور محبت شامل ہوتی تھی۔'' اُنہوں نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''میری بچی میں تمہیں جگانے آئی تھی کہ نماز کی پابندی کرو، صبح کی نماز چہروں پر نور بخشتی ہے۔'' وہ ماہ نور کی طرف مڑیں۔ ''اگلے ہفتے ہم سب لوگ خان پور جائیں گے، تمہارے تایازاد کی شادی ہے اور......'' وہ خاموش ہوئیں تو ماہ نور کی بے چینی بڑھ گئی۔

''اور کیا ماں جی......؟'' وہ تڑپ کر بولی۔

''اور تم جنید میاں کو بھی دیکھ لینا جو کہ تمہارا تایازاد ہے۔'' ماں جی نے کہا تو ماہ نور کی پیشانی پر حیرت کی لکیریں واضح ہو گئیں۔

''مگر میں خصوصی طور پر جنید کو ہی کیوں دیکھوں؟''

''لو پگلیوں جیسی باتیں کر رہی ہے، بچپن سے لے کر اب تک اسی کے نام سے تو منسوب رہی ہو تم، تمہارا منگیتر ہے وہ۔'' ماں جی نے بم کا دھماکا کر دیا۔ وہ خود تو چلی گئیں مگر ماہ نور کو عجیب سے مخمصوں میں ڈال گئیں۔

''میرا منگیتر ہے اور مجھے پتا بھی نہیں۔ یہ اچانک منگیتر کہاں سے آ گیا؟'' وہ روہانسے انداز میں ایک بار پھر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ فیض الحسن کی خوش الحانی اس کے دل میں اُترنے لگی۔ قرآن کریم کے میٹھے الفاظ اس کی روح کو فرحت واطمینان بخشنے لگے۔ اس کی توجہ وقتی طور پر جنید سے ہٹ گئی۔ وہ فیض الحسن کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کی عظمت کے گُن گانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ فیض الحسن نے اس کی دولت سے نہیں بلکہ اس کی روح سے محبت کی ہے۔ وہ عظیم ہے، کیا جنید ایسا ہے؟ یہ تو جا کر ہی پتا چلے گا وہ جنید اور فیض الحسن کا موازنہ کرے گی اس نے سوچا اور کھڑکی سے ہٹ گئی کیوں کہ پرندوں کے چہچہانے کی آواز نے اسے بتا دیا تھا کہ فیض الحسن نے تلاوت ختم کر لی ہے۔ وہ آنے والے دنوں کے متعلق سوچ کر پریشان ہونے لگی۔

''اگر رحمٰن بھائی میری شادی زبردستی کسی جگہ کر دیں تو تم کیا کرو گے فیض الحسن؟'' اس نے کالج جاتے ہوئے راستے میں فیض الحسن سے پوچھا تو وہ ہنسنے لگا۔

''آپ کیا کریں گی؟'' وہ شریر لبوں سے مسکرا رہا تھا۔

''میں تو اس سے شادی کر لوں گی۔'' اس کے انداز میں بھی شرارت چھپی ہوئی تھی۔

''میں زبردستی اور چھینا جھپٹی کا قائل نہیں ہوں۔ محبت اور شادی دل کی آرزو پر ہوتی ہے مگر یہ دونوں چیزیں ہی ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی شادی رکوا سکوں۔''

''مگر کیوں؟'' وہ ادا سے بولی تو فیض الحسن نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرے سکون کو برباد کر کے، میری نیندیں اجاڑ کر کے، میرا دل چرا کر ایک لڑکی چلی جائے وہ بھی کسی غیر کے ساتھ اور میں دیکھتا رہوں، ایسا ناممکن ہے۔''

مگر تم تو کہتے ہو کہ محبت صرف پانے کا ہی نام نہیں ہے، قربانی دینے کا نام بھی محبت ہے۔''

''محبت یہ سکھاتی ہے کہ آخری دم تک اس کا انتظار کرو، میں اگر قربانی دوں گا تو تمہارا زندگی کی آخری سانس ٹوٹنے تک انتظار کروں گا۔'' اس نے پہلی بار ماہ نور کو ''آپ کا'' کی بجائے ''تمہارا'' کہا تو ماہ نور کو اچھا لگا۔

''میری طرف سے بھی دل میں کوئی میل نہ رکھنا فیض الحسن۔ مانو اب بھی تمہاری ہے

اور تا حیات تمہاری رہے گی۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولی تو کالج کا گیٹ آ چکا تھا۔ وہ اُتری اور فیض الحسن کو مڑ کر دیکھنے کے بعد کالج میں داخل ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

دونوں بھابیاں اور بچے ماں جی اور رحمٰن بھائی کے ساتھ چلے گئے تھے۔ اب گھر میں اکیلی ماہ نور ہی رہ گئی تھی جس نے تعلیم کا بہانہ بنا کر دو دن بعد آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کسی کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا، ماڈرن لوگ تھے، پڑھا لکھا ماحول اور پھر اپر کلاس سے تعلق انہیں کبھی بھی اپنے ڈرائیور پر شک کی اجازت نہ دیتا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر اپنی بیٹی پر اندھا اعتماد اور پھر ملک عبدالرحمٰن کی دھاک، اثر و رسوخ غرض کہ ہر چیز اُن کی فیور میں تھی۔

تاریک اور سرد رات نے سیاہی اور کہر کی چادر اوڑھ کر آہستہ آہستہ دن کے اُجالے کی طلب میں اپنا سفر شروع کر رکھا تھا۔ آج محل میں ماہ نور اکیلی تھی، چوکیدار شیر خان اپنے گیٹ پر بنے ہوئے کیبن میں اونگھنے اور جاگنے کی کوشش میں مصروف تھا، ملکہ اور راجو بھی دوسرے ملازموں کی طرح چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔

ماہ نور کی رگ رگ میں فیض الحسن کا پیار نشہ بن کر دوڑ رہا تھا۔ وہ ہر پل اور ہر لمحہ فیض الحسن کو اپنے ساتھ محسوس کرتی تھی۔ اسے ہر پل ایک دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی اس کے فیض الحسن کو اس سے چھین نہ لے۔ اس نے ابھی اور اسی وقت فیض الحسن کو ایک بار پھر آزمانے کی سنگین کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے کمرے سے بے دھڑک ہو کر نکلی۔ وہ اپنے گھر میں بے فکری سے ٹہل رہی تھی۔ اس نے پہلی بار گھر میں عجیب سا ہولناک سکون دیکھا تھا، واقعی گھر مکینوں سے ہی اچھے لگتے ہیں۔

اس کے انگ انگ میں مستی اور چاہت کا سرور رینگ رہا تھا۔ وہ اپنے عظیم الشان محل سے نکل کر آہستہ آہستہ سرونٹ کوارٹر کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی منزل فیض الحسن کا کوارٹر تھا۔

کہر اور سردی نے اس کی ہڈیوں تک میں ٹھنڈک پہنچا دی تھی۔ اس کے بدن پر لپٹی ہوئی گرم اونی شال بھی ٹھنڈک کو روکنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے بغیر اِدھر اُدھر دیکھے ہی فیض الحسن کے کوارٹر کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ تین چار مرتبہ کسی قسم کی کوئی بھی آواز نہ سن کر وہ جھلا گئی۔ اس نے زور سے دروازے پر لات ماری، کھڑکا ہوا، دور سے شیر خان کی چنگھاڑ سنائی دی۔

''خبردار ہلنا نہیں، ام گولی مار دے گا۔'' ماہ نور گھبرا گئی مگر اس کی تسلی تبھی ہوئی جب شیر

خان عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کھڑاک کی وجہ سے فیض الحسن نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سردی سے کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو فیض الحسن کو اچنبھا ہوا۔ اس وقت اور اتنی سردی میں ایک مالکن اپنے غلام کے دروازے پر ''اللہ خیر کرے'' اس نے سوچا اور دروازہ کھلا ہی رہنے دیا مگر اس کی حیرت دوچند ہوگئی جب ماہ نور نے اُٹھ کر کنڈی لگا دی۔ فیض الحسن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آج موسم اور مالکن کی نیت یقیناً خراب تھی مگر وہ ایماندار تھا، اس نے اپنے ضمیر اور اندر کے فیض الحسن کو زندہ رکھنا تھا۔ اس نے یک دم ہی بہت سے فیصلے کر لیے تھے۔ عشق اور محبت کی پاکیزگی کو قائم رکھنے کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ محبت اور عقیدت کا امتحان تھا، ہوس اور پاکیزگی کی کٹھن آزمائش تھی۔ قادر علی اس موقع پر بری طرح یاد آیا تھا جس نے کہا تھا کہ ''ابھی بہت سی کٹھن آزمائشیں تمہاری منزل کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔'' وہ زمین پر بیٹھ گیا تو ماہ نور بھی پلنگ سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے آج اور ابھی محسوس کیا تھا کہ زمین اور آسمان میں کیا فرق ہوتا ہے؟

ملازم اور غریب لوگ ٹھنڈی اور گرم زمین کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں مگر امیر لوگوں کے نرم و گداز بستروں پر اوڑھنے بچھونے الگ الگ ہوتے ہیں۔

''مانو بی بی آپ اس وقت؟'' فیض الحسن نیند کی خماری سے نکل آیا تھا۔ اسے ہوش آ گیا تھا کہ وہ کس جگہ اور کون سے مقام پر ہے۔ اس کی کروڑوں روپے کی مالک مالکن زمین پر اس کے برابر بیٹھی تھی۔ یہ محبت تھی یا پھر اس کی کوئی ''ضرورت'' فیض الحسن کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''نہیں...... میں مانو کی روح ہوں۔'' ماہ نور کا انداز عجیب ہسٹریائی تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے فیض الحسن کو ڈرانے کی کوشش کی، وہ مسکرانے لگا۔

''اتنی سردی میں مانو کی روح بلکہ بدروح مجھ غریب سے کیا لینے آئی ہے؟'' اس نے کانپنے کی شاندار اداکاری کی تو مانو بھی مسکرانے لگی۔

''مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو فیض الحسن؟'' یہ غیر متوقع سوال انتہائی سنجیدہ انداز میں مانو کی زبان سے ادا ہوا تو فیض الحسن چونک کر رہ گیا۔ وہ مانو سے مزید تھوڑا سا پرے ہو کر بیٹھ گیا، عورت پر شیطان کا غلبہ بہت جلد طاری ہوتا ہے۔ تنہائی میں خوبصورت عورتیں شیطان کی چالوں میں سے کسی بھی چال کا آسانی سے شکار بن جاتی ہیں۔

''یہ کیا بے تکا سوال ہے مانو بی بی۔'' وہ چڑتے ہوئے بولا، دراصل وہ دل سے چاہتا

تھا کہ وہ اس وقت یہاں سے چلی جائے۔

''صرف مانو......'' وہ انگلی کھڑی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں مالکن بن کر نہیں بلکہ اپنے پیار کے پجاری کے پاس داسی بن کر آئی ہوں، پیار کی بھیک مانگنے کے لیے، اس لیے صرف مانو'' اس کی آواز سے محبت کی خماری جھلک رہی تھی۔ فیض الحسن کو بہت محتاط رہنے کے علاوہ اس لمحہ اس کی ہر بات بھی ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''جی...... مانو...... میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ محبت کو ناپنے اور تولنے والا کوئی آلہ ابھی تک کسی بھی عاشق نے ایجاد یا تخلیق نہیں کیا ہے۔''

''پھر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' وہ اس کی طرف کھسک گئی۔ کمرے میں زیرو واٹ کے بلب کی سبز روشنی میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ یہ لمحہ اور وقت اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کا نہ تھا بلکہ شیطان کے کاری وار سے بچنے کے لیے اس سے نگاہیں چرانے کی ساعتیں تھیں۔ لہٰذا وہ کونے میں ایک طرف مزید کھسک گیا۔ یہ بات ماہ نور نے بھی نوٹ کر لی تھی۔

''میں بڑے بڑے دعوے تو نہیں کرتا مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اگر اس محبت نے قربانی مانگی تو تم سے پہلے فیض الحسن اپنی جان دے گا اور یہ میری پاکیزہ محبت کو میرا حقیر سا تحفہ ہوگا۔'' وہ دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ ادا کر رہا تھا اور ماہ نور اس کی ادائیگی میں کھو گئی تھی مگر وہ اپنے مشن سے غافل نہیں تھی۔ اس نے موقع غنیمت جان کر فیض الحسن کو قمیص کے گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا وہ اس کے بالکل قریب ہو گیا تھا بلکہ ایک دوسرے کی سانسیں بھی محسوس کرنے لگے تھے۔

فیض الحسن کے لیے ماہ نور کا یہ انوکھا اور پُراسرار روپ تھا جو اسے گھناؤنا بھی لگا۔ وہ مزید پیچھے نہ کھسک سکتا تھا کیوں کہ چھوٹے سے کوارٹر کی دیواروں نے آج اسے زنداں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ماہ نور اس پر گر گئی، اس کے جذبات دل میں ہلچل مچا رہے تھے۔

''ماہ نور...... مہربانی کرو، یہاں سے چلی جاؤ۔''

''نہیں...... فیض الحسن...... میری پیاسی محبت تمہاری چاہت کا رس پینے کے لیے بے قرار ہو رہی ہے۔'' ماہ نور کی نشہ میں ڈوبی ہوئی پُرخمار آواز نے فیض الحسن کو اندر تک بیدار کر دیا تھا۔ شیطان اپنا جال کس رہا تھا مگر ایک طرف اس کے جال میں پھنسنے والا ایک قرآنِ کریم کا قاری تھا اور دوسری محبت اور توجہ سے تلاوتِ قرآنِ کریم سننے والی سامع تھی۔ دونوں ہی اپنی

محبت اور ایمان کی پاکیزگی کو جانچنے کے لیے ایک دوسرے کا امتحان لینے والے تھے۔

''چٹاخ.....!'' تھپڑ کی آواز نے ماحول اور کمرے کو گرما کر رکھ دیا تھا۔ فیض الحسن کے سخت اور مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں ماہ نور کے نرم و نازک گالوں پر اپنا نشان بنا گئی تھیں۔ وہ اتنا زوردار تھپڑ کھا کر پلنگ سے جا کر ٹکرائی تھی۔ اس کا سر پلنگ کے پائے سے لگا تھا، اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے فیض الحسن کی طرف فخر سے دیکھا وہ بھی حیرانگی سے اپنے ہاتھوں کو نظریں جھکائے دیکھ رہا تھا۔ وہ ماہ نور کے چہرے کے تاثرات و تفخر نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی نے ڈیرہ جما لیا تھا۔

''میں مانتا ہوں کہ دنیا کے اس ذلیل بازار میں ہر چیز بکتی ہے۔ دولت مند اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بڑے بڑے درندوں کو اپنا غلام بنا کر پنجرے میں بند رکھتا ہے۔'' اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ آنکھیں برسنے لگی تھیں، وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا دوبارہ بولا۔

''مگر تاریخ گواہ ہے کبھی بھی کوئی امیر کسی غریب کے پیار اور محبت کو دولت یا اپنی ہوس سے حاصل نہیں کر سکا۔ غریب بیوقوف ہے، اپنے دل پر اختیار کھو دیتا ہے۔ محبت جیسی نادانی اس کی غلطی بن جاتی ہے۔ میں بھی غریب ہوں، نادانی میں محبت جیسی غلطی کر بیٹھا۔ اپنی بساط سے بڑی غلطی، اپنی اوقات بھول گیا تھا، آپ کے برابر چلنے لگا تھا، بیٹھنے لگا تھا، آپ کے دل میں میری نہ جانے کیا اہمیت ہے مگر میں نے آپ کو ہمیشہ عقیدت و احترام کا مقام دیا ہے۔ میری پاکیزہ محبت کو جانچنے کے لیے آپ نے غلط پیمانے اور جھوٹی کسوٹی کا انتخاب کیا ہے۔ جسے ہوس اور جسم کی بھوک مٹانے کا متبادل بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ میں اپنی محبت کو ماپنے کے لیے غلط پیمانے یا ترازو کا استعمال نہیں کر سکتا۔ میں بہت غریب ہوں اور گناہ گار بھی کیوں کہ غریب کی محبت جرم اور گناہ کا درجہ رکھتی ہے۔ میں نے آپ کی دولت اور آپ کے پُرکشش جسم سے محبت نہیں کی۔ آپ کی روح میں سمانے کی کوشش کی تھی۔ آپ کو خدا کے بعد پوجنے کی کوشش کی تھی۔ بس یہی میرا جرم ہے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہاں سے رُخصت ہو جاؤں گا۔'' اس نے نظریں اُٹھا کر ماہ نور کے سامنے ہاتھ تو جوڑ دیئے مگر اس کے ماتھے سے بہنے والے خون اور اس کے لبوں پر تفخرانہ مسکان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ جلدی سے اپنی قمیص پھاڑ کر اس کے ماتھے پر باندھنے لگا۔ وہ شرمندہ اور خجل سا ہو رہا تھا، ماہ نور نے اس کی شرمندگی محسوس کر لی تھی۔

''فیض الحسن! میری طرف دیکھو۔'' وہ آگے بڑھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''نظریں جھکا کر نہیں بلکہ فخر سے گردن اونچی کر کے میری طرف دیکھو۔'' اس نے فیض الحسن کو کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ ''میں تم پر، تمہاری محبت پر فخر کرتی ہوں اور مجھے اپنی پسند پر غرور ہے۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچائی جاننے کی کوشش کرو۔'' اس نے فیض الحسن کی جھکی ہوئی نظریں اپنے دل میں کدال کی طرح چبھتی ہوئی محسوس کی تھیں کیوں کہ امتحان اور محبت کو پاکیزگی اور ہوس کی کسوٹی پر پرکھنے کی اس نے دوسری غلطی کی تھی۔ پہلی غلطی اس نے فیض الحسن کو دولت کا لالچ دے کر کی تھی۔ وہ اس میں بھی بخوبی کامیاب ہوا تھا اور اب جب کہ آزمائش کی آڑ میں وہ خود تو جذبات کے دھارے میں بہہ گئی تھی مگر فیض الحسن نے اس کے چہرے پر تھپڑ مار کر اپنا قد اونچا کر لیا تھا اور ماہ نور خود کو ذلت کے گڑھے میں گری ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور نے اپنا سر آہستگی سے اس کے چوڑے چکلے سینے سے ٹکا دیا۔

''فیض الحسن! ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اسے چاہے اور اس قدر چاہے کہ دنیا کی کوئی بھی کسوٹی یا کوئی بھی پیمانہ اس کی محبت اور چاہت کو جانچ نہ سکے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں تمہاری محبت کو پرکھنے کے لیے جذبات کی رو میں بہکنے والی تھی۔ اگر میرا انتخاب غلط ہوتا یا تمہاری جگہ کوئی کم ظرف ہوتا تو یقیناً ناقابلِ تلافی نقصان کی ذمہ دار میں خود ہی ہوتی مگر فیض الحسن، تم میری سوچ اور توقع سے بھی عظیم ہو۔ میں تمہاری عظمت کو دل کی گہرائیوں سے سلام کرتی ہوں۔'' وہ سامنے کھڑی ہو کر باقاعدہ فوجی انداز میں سلیوٹ کرنے لگی مگر فیض الحسن کے لبوں پر مسکان نہ آ سکی یہ لمحہ ماہ نور کے لیے لمحہ فکریہ تھا۔

''فیض الحسن! میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا اعتبار کرو، میں نے تمہیں اور تمہاری محبت کی پاکیزگی کو جانچنے کے لیے غلط طریقہ ضرور اختیار کیا ہے مگر میں اپنی ہی نظروں میں گر گئی ہوں۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں، سچی اور دلی محبت..... تم مجھے ہر طرح سے آزما سکتے ہو۔ میری جان بھی تمہارے لیے حاضر ہے۔ بتاؤ فیض الحسن مجھے کیا کرنا ہوگا؟ تمہیں اپنی بے لوث اور مخلص محبت کا یقین دلانے کے لیے.....؟'' وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس کا دیوتا ناراض ہو گیا تھا، اس نے تو فیض الحسن کو اپنے دل کا مسیحا سمجھا تھا مگر وہ ''کانچ کا مسیحا'' تھا۔ کسی بھی آزمائش اور امتحان کی ہلکی سی ٹھوکر اس کو چُور چُور کر سکتی تھی یا پھر کر گئی تھی۔ ماہ نور سمجھ نہ پا رہی تھی کہ اب وہ دیوتا کو کس طرح یقین دلائے۔

"بیگم صاحبہ!" وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا مگر اس کے اندر بھرا ہوا زہر ان دو لفظوں کی صورت میں اس کی زبان سے ادا ہوا تو ماہ تڑپ کر رہ گئی۔

"فیض الحسن پلیز! میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں، میرا اعتبار کرو، میں نے تمہیں آزمانے کی غلطی کی ہے مگر میری نظروں میں تم عظیم ترین انسان ہو۔" اسی وقت اذانِ فجر کی آواز خاموش فضا میں گونجنے لگی۔

"تمہیں یقین نہیں آتا فیض الحسن، میں اس عظیم قدرت اور اعلیٰ و ارفع شان والے اللہ کی قسم کھاتی ہوں میں تم سے سچی اور پاکیزہ محبت کرتی ہوں۔ میرا اعتبار کرو، میری آزمائش کا طریقہ کار غلط تھا۔ مجھے اس پُرنور صبح کی قسم اور تمہیں اس عظیم و مقدس کتاب کی قسم جس کی تلاوت جب تم من کی گہرائی سے کرتے ہو تو پرندے بھی خاموشی سے سنتے ہیں۔ میں بھی سنتی ہوں، تمہیں اس مقدس کتاب کی قسم جس کی تلاوت کرتے وقت تم نہیں بلکہ تمہارے اندر سے بولنے والا عظیم فیض الحسن اس تمام ماحول کو مسحور کر دیتا ہے۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھی اور کمرے میں بنے ہوئے طاق سے قرآن کریم کو آنکھوں اور ہونٹوں سے بوسہ دے کر اُٹھا لیا۔

فیض الحسن حیرانگی سے گنگ کھڑا تھا۔ یہ ایلیٹ فیملی کی امیرزادی، ایک غریب کی محبت میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر مقدس کتاب کو گواہ بنا رہی تھی۔ فیض الحسن کانپ کر رہ گیا، اسے ماہ نور کی محبت کا پختہ یقین تھا مگر وہ کسی بھی ایسی آزمائش کو غلط سمجھتا تھا جو محبت کی پاکیزگی اور سچائی پر شک کا حرف بن جائے مگر اب قرآنِ کریم اُٹھا کر ماہ نور تو اپنی بے گناہی اور سچی محبت کی گواہی دے رہی تھی لیکن فیض الحسن سرتاپا لرز گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس کے ہاتھوں سے قرآن کریم لے لیا، نہایت ادب و احترام سے چوم کر اس نے اس خزانۂ آخرت کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ڈنگرے......!" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تھا مگر یہ لفظ ماہ نور کے لیے پہلی بار بولا گیا تھا اس لیے وہ اسے سمجھنے سے قاصر رہی، اس کی نظروں میں استفہامیہ انداز تھا۔

"ڈنگرے...... پاگلے، بیوقوفے، اپنی دنیاوی محبت کی پرکھ اور جانچ کے لیے اتنی مقدس اور عظیم کتاب کو درمیان میں نہیں لاتے، مجھے تو ویسے ہی تمہاری محبت کا یقین ہے مگر آج تمہاری حرکت نے مجھے رُلا بھی دیا ہے اور ہلا بھی دیا ہے۔ میرے دل میں کوئی میل نہیں ہے۔ میرا یقین کرو مانو بلی!" ماہ نور کے منہ سے سکون و اطمینان کی سانس خارج ہوئی تو وہ

دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ماہ نور آگے بڑھ کر اس کے سینے سے چمٹ گئی، ان دونوں کے درمیان ان کی محبت کا عظیم گواہ اپنی شان و شوکت سے فیض الحسن کے ہاتھوں میں سمٹا اس کے سینے سے لگا ہوا تھا اور اس کے بعد کسی بھی دُنیاوی گواہ کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

مگر محبت کرنے والے ہمیشہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ انہیں کوئی دیکھ نہیں رہا مگر ہمیشہ کہیں نہ کہیں سے اس ظالم سماج کی دو ظالمانہ آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہوتی ہیں، اب بھی ایسا ہی تھا، شیر خان مانو کی چیخ چیخ کر بولنے کی آواز سن کر چپکے سے فیض الحسن کے کوارٹر کے باہر چلا آیا تھا۔ وہ دبے پاؤں آیا تھا۔ اس نے ان دونوں کی تمام گفتگو سن لی تھی۔ اس کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ فیض الحسن کی عظمت کا دل سے قائل تھا مگر لالچ اور مالکوں سے وفاداری کا وعدہ اس پٹھان کو ان کی شکایت کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ وہ دانت پیستا ہوا اپنی جگہ پر واپس آیا تھا۔

☆=====☆=====☆

موسم کی سختی اور حالات نے قادر علی کو اندرونی طور پر مزید مضبوط کر دیا تھا۔ وہ گرمی سردی کی پروا کیے بغیر ننگے پاؤں ہی بازاروں اور گلیوں میں بھیک مانگا کرتا تھا۔ اب بھی سردی اپنے جوبن پر تھی۔ رات ہونے کو تھی، دن کے اُجالے کو سورج کے غروب ہونے کے بعد شام کے اندھیرے نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ اتنی سردی میں اکثر کاروبار سرِ شام ہی بند ہو جایا کرتے تھے۔ قادر علی نے اپنے گھر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ وہ اپنا کام بھی کرتا جا رہا تھا اور گھر کی طرف بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی صدا گلیوں میں گونج رہی تھی۔ کتے بھی کوئی محفوظ کونا کھدرا دیکھ کر سردی کی وجہ سے دُبکے بیٹھے تھے۔ ویسے بھی آج تک اس پر کئی دوسرے فقیروں کی طرح کسی بھی کتے نے بھونکنے یا غرانے کی جرأت و ہمت نہ کی تھی۔

"جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔" اس کی آواز سن کر ایک گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ اس دروازہ کو کراس کر کے گلی میں آگے جا چکا تھا۔

"بابا جی! روٹی لے لو......" کسی بچے کی آواز نے اسے واپس آنے پر مجبور کیا تو وہ واپس اس کھلے ہوئے دروازے کے آگے بیٹھ گیا۔ بچہ اندر چلا گیا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چنگیر تھی۔ جس کو کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس نے وہ چنگیر قادر علی کے سامنے رکھی اور خود بھی اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ قادر علی نے کپڑا اٹھایا تو اس کی روح فنا ہوگئی۔ چنگیر میں کئی دن کی سوکھی ہوئی روٹی کے

ٹکڑے تھے جن پر کائی جم چکی تھی اور وہ کھانے کے قابل نہ تھی۔

اس نے بچے کی طرف غصے سے دیکھا مگر دوسرے لمحے ہی اس کی آنکھیں جھک گئیں کیوں کہ بچہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر معصومیت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قادر علی کو تمام معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

''اللہ کو خوش کرنے کے لیے اس کی مخلوق کی خوشی کو مدنظر رکھنا ہی اللہ کی خوشنودی پانے کا راز ہے۔ حقوق اللہ کی تلافی ہو جائے گی مگر حقوق العباد کی تفتیش باقاعدہ ہوگی۔ اس کی تلافی ناممکن ہے۔'' مرشد کی آواز نے قادر علی کے اندر گونجنا شروع کر دیا۔ اس نے دن بھر کی کمائی اپنی جیبوں اور کشکول سے نکال کر اس بچے کے سامنے ڈھیر کر دی۔

''یہ کس مد میں مجھے دے رہے ہو بابا؟'' قادر علی اس ننھے بچے کے سوال پر حیران رہ گیا۔

''یہ خیرات نہیں ہے، نہ ہی کوئی احسان ہے بلکہ خدا خوفی ہے۔ میرا ضمیر گوارہ نہیں کرتا کہ میں پیٹ بھر کر کھانا کھاؤں اور اس گھر میں کئی دنوں سے چولہا نہ جلا ہو، وہ آج بھی بھوکے سوئے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے تمام سکے بچے کی طرف ہاتھ سے بڑھا دیئے۔

''مگر میرے گھر جیسے تو کئی گھر ہیں، کیا آپ ہر گھر کی مدد کریں گے؟'' بچے نے دوسرا اہم سوال کر دیا تھا، قادر علی لرز اُٹھا، اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

''میں حقیر اور پُرتقصیر اتنی سکت نہیں رکھتا کہ کسی کی مدد کروں۔ بس میں تو خود اس رحمت والے پروردگار کی مدد کا طلب گار ہوں۔ میں تو خود اس کی عنایتوں اور مہربانیوں کا فقیر ہوں۔ اگر وہ میری ڈیوٹی لگا دے اور اپنی رحمت و محبت کا ساتھ عنایت فرما دے تو میں اس کی مرضی سے ایسے ہر گھر کی مدد کر سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر قادر علی اُٹھا اور بغیر صدا لگائے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ اسے مختلف خیالات اور سوچوں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ گمنام اور انجانی گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے محلّہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنی گلی میں داخل ہوتے اس کی نظر گلی کی نکڑ پر کھڑی گاڑی پر پڑی۔ گاڑی شاندار اور نئی تھی، ابھی اس پر نمبر بھی نہیں لگا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ تین یا چار لاکھ کی گاڑی ایک انسان کو آرام دہ سفر مہیا کر سکتی ہے۔ اپنی سہولت اور فائدہ کے لیے امیر لوگ گاڑیاں اور بنگلے خریدتے ہیں مگر ان جیسے لوگوں اور اس جیسی بستی میں بسنے والے غریبوں کو ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہے۔ ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔

وہ دُکھ اور تاسف سے سوچتا ہوا دروازے تک پہنچا تھا مگر حیرت کی انتہا نہ رہی جب گھر

میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر صحن میں ماں جی اور ابا جی پر پڑی۔ وہ حیرت و استعجاب سے کھڑا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ ماں جی نے اپنے لال کو اس حالت میں دیکھا تو تڑپ کر بھاگتی ہوئی آئی اور قادر علی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ابا جی بھی چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ماں جی کی آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی تھی۔ ماں بیٹے کا ملاپ کئی سالوں بعد ہو رہا تھا، لاکھوں میں کھیلنے والا زمیندار بھی اس وقت جذبات اور اولاد کی محبت کے ہاتھوں مجبور اور بے بس فقیر نظر آ رہا تھا۔ باپ کا اُونچا شملہ اسے رونے نہ دے رہا تھا مگر اس کے آنسو اندر ہی اندر دل پر گر رہے تھے۔ وہ زمینوں کا مالک، گاؤں کا چودھری تھا، اس کا بیٹا فقیر بن کر اپنا پیٹ پال رہا تھا۔ ہاتھوں میں کاسہ اور پھٹے پرانے کپڑوں اور ننگے پاؤں نے قادر علی کی حالت بدتر کر دی تھی۔

مگر وہ اس حال میں جی جان سے خوش تھا۔ اس نے آہستگی سے ماں جی کو خود سے الگ کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ ٹھنڈی زمین پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ دن بھر قدم قدم چل کر قادر علی کے پاؤں اور ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ اس کے منہ سے کراہ یا اُف تک کی آواز نہ نکلی تھی۔

''آپ کو کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟'' اس نے پہلا سوال ماں سے کیا۔ اُنہوں نے خاموشی سے نظریں دروازے کی جانب کیں تو قادر علی نے اُن کی نظروں کے زاویے سے دروازے میں کھڑے ہوئے اپنے ساتھی پپو کو پہچان لیا۔

اس کے ہونٹوں پر کربناک مسکراہٹ رینگ گئی، پپو بھی اندر آ چکا تھا۔ قادر علی کی آنکھیں موتیوں سے بھر گئی تھیں، وہ جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے بولا تھا۔

''اس فقیر کی کٹیا میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں، مجھے معاف کر دینا۔'' قادر علی کی آواز میں ٹھہراؤ اور گہرا پن تھا۔ ماں جی کے آنسو اور اُن کی آنکھیں قادر علی کے دل میں چھید کر رہی تھیں مگر ان راستوں پر رشتوں کی قربانی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ وہ ماں جی سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔

''میرے پتر!'' یہ ابا جی تھے جنہوں نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔ ''چل گھر چلتے ہیں، حویلی تیرے بنا اداس ہے، گاؤں کا ایک ایک منظر تیری راہ دیکھ رہا ہے، اس بڑھاپے میں مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ چل میرا پُتر، غصہ تھوک دے، لے دیکھ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ابا جی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے مگر قادر علی نے توجہ نہ کی

تھی۔

''مان جا قادر علی! تیرا ابا تیرے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہے، دیکھ میں تیری ماں ہوں مجھے اور مت تڑپا۔ جن راستوں پر تم چل رہے ہو، وہ نیکی اور بھلائی کے ضرور ہیں مگر ان کی منزلیں، ٹھوکروں، بے رحمی اور کانٹوں کی رہگزر سے ملتی ہیں۔ اپنے گھر کے عیش چھوڑ کر اس دنیا میں ذلیل ہو رہے ہو۔ ہر کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو، تمہیں شرم محسوس نہیں ہوتی قادر علی؟'' ماں جی کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو قادر علی نے انتہائی دُکھ اور تاسف سے ان کی طرف دیکھا۔

''اللہ سے اس کی محبت پانے کے لیے در در کی گدائی کرتا ہوں، پتا نہیں کس رنگ اور روپ میں کون سے مقام پر وہ مجھے اپنی محبت کی خیرات دے دے، اس میں شرم کیسی؟'' کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔ ''گھنگرو باندھ لیے تو ناچنے میں شرم کیسی؟''

''حبِ الٰہی دل میں بسالی تو اسے ڈھونڈنے میں شرم کیسی؟'' وہ خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

''قادر علی! میرے یار چل میرے ساتھ ہم کوئی اچھا سا کاروبار کر لیں گے۔'' اس بار پپو نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ قادر علی نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

''تم نہیں جانتے آج میں نے کتنا نفع کمایا ہے۔ یہ میرا اور میرے سوہنے اللہ کا معاملہ ہے۔ بس میرا اللہ میرے اس کاروبار میں نفع اور برکت ڈالتا رہے۔ میں اس کے حکم سے اس کی مخلوق کی خدمت کرتا رہوں۔''

چوہدری صاحب کا پارہ ہائی ہو گیا تھا، وہ شدتِ غصہ سے کانپتے ہوئے بولے۔

''قادر علی! اللہ اللہ کا پرچار کر مگر والدین کے حقوق بھی تم پر قرض ہیں۔''

''میں آپ کے حقوق و فرائض سے سرتابی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور نہ ہی میری اتنی جرأت ہے کہ آپ کے حکم کی عدولی کروں مگر میرا فرض، میری نوکری، میری ڈیوٹی نے مجھے خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا ہے۔ میں خود کو بھول گیا ہوں۔ باقی رشتے ناطے میری سمجھ سے بالاتر ہیں، مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کا گناہ گار ہوں مگر میں اللہ کی رسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' قادر علی نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ اب اس نے اپنی آنکھیں اور ہونٹ بند کر لیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس کے سر پر ممتا بھرا پیار کا ہاتھ پھرا۔ جو اپنی مٹھاس اور لمس اس کے

گھنے بالوں میں چھوڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے والدین اور پپو جانے لگے ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند رکھا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے اس جگہ کو دیکھا جہاں چند لمحے پہلے ماں جی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے اس جگہ کو سجدہ کر کے چوم لیا گویا کہ ماں کے قدموں کو چوما ہے۔

''مجھے معاف کر دینا ماں جی! میں اب کبھی آپ کا قادرا نہیں بن سکوں گا۔'' اس کی آنکھوں نے آنسو برسانا شروع کر دیے تھے۔ وہ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ بس اسی جگہ پر سو گیا جس جگہ پر ماں جی کے قدم تھے۔

وہ سردی کی بے نیازی اور موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر آنکھیں موند کر لیٹ گیا اس کی آنکھ گہری نیند نے بند کر دی تھی۔ چند ہی لمحات گزرے تھے کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ رانی تھی جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''یہ کیا بیوقوفی ہے رانی؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''قادر علی! میری نیند اجاڑ کر، مجھے اللہ کی لو لگا کر خود خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہو۔ یہ لمحات اور ساعتیں اللہ کی یاد سے تمہیں کس طرح غافل کر رہی ہیں؟'' وہ چیخ رہی تھی اور قادر علی کو ڈر تھا کہ کہیں محلہ دار نہ اکٹھے ہو جائیں اور قادر علی کی رہی سہی کسر بھی بے عزتی کی صورت میں نکل جائے۔

''خاموش ہو جاؤ رانی، شور مچانے سے اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔'' وہ پوری طرح جاگ گیا تھا۔

''مجھے بتاؤ قادر علی وہ صحرا کیا تھا، اونٹ کی سواری پر تم نے کون سا ایسا مشروب مجھے پلایا تھا کہ اس کی لذت اور شیرینی میں آج بھی اور ابھی تک اپنے حلق میں محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ قادر علی وہ سب کیا تھا؟'' اس نے قادر علی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا مگر اس کی حیرت بجا تھی کیوں کہ وہ رانی کی کسی بھی بات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''مجھے پہیلیاں مت بجھواؤ رانی! کھل کر صاف صاف کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔ رانی نے خواب میں دیکھا جانے والا تمام واقعہ من و عن بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ قادر علی کی حیرت اور بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ رونے لگا۔

''میرے معبود! میں تیری قدرت کے قربان جاؤں۔ قادر علی کے لیے اتنا بڑا انعام.....؟'' وہ بات پوری کیے بغیر ہی رونے لگا تھا رانی اس کی کیفیت پر حیران تھی۔

”رانی...... رانی...... خدا کی قسم، تم میرے لیے مبارک ثابت ہوئی ہو، میں تمہیں مرشد کے توسط سے اللہ سے ملاؤں گا۔ جلد ہی بہت جلد۔ بس رانی دعا کرو، دعا کرو کہ مرشد سرکار سے ملاقات ہوجائے۔“ اس کی آواز میں جوش تھا۔

”یہ مرشد کیا ہوتا ہے؟“ رانی کے سوال پر اس نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے دھلا ہوا نکھرا نکھرا حسن اس پر معصومیت اور خوبصورت آنکھوں میں چھلکنے والی اداسی نے قادر علی کو بہت متاثر کیا تھا۔ ”مجھے بتاؤ قادر علی! یہ مرشد کیا کام کرتا ہے۔“

”غور سے سنو رانی! میں اپنی ناقص معلومات کے باوجود تمہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔“ وہ زمین پر بیٹھ گئے، دونوں ہی موسم کی شدت سے بے نیاز نظر آرہے تھے۔ قادر علی رانی کو اللہ کی راہ پر لانے کے لیے مرشد کے کردار کے متعلق الفاظ جمع کر رہا تھا۔ بالآخر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولنا شروع ہوا۔

”ہمارے دینِ اسلام کی بنیاد کلمہ طیبہ ہے۔ جس کا ترجمہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم فرمادی۔ اُن صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی بھی نبی نہیں آئے گا۔ انبیاء کرام کے بعد محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیغمبری اور پیامبری کا سلسلہ رک گیا۔ چودہ سو سال پہلے رک جانے والا سلسلہ آج تک کیسے جاری ہے؟ یہ سب کچھ آخری نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور آل اولاد سے چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک اور برگزیدہ بندے رب تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچار کرتے ہوئے گاؤں گاؤں، شہر شہر، گلی گلی جا کر اپنا فرض اور اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ اللہ کے یہی نیک بندے جنہیں خداوند کریم نے بہت سے انعام و اکرام سے نوازا ہے ہم تک اسلام کو پہنچا کر اپنا کام کر رہے ہیں۔ نیکی اور سچائی کے راستے پر چلنے کے لیے ایک اللہ کے برگزیدہ بندے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسے ہم لوگ بیعت کر کے اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں اور وہ مرشد ہمیں حق و سچ اور باطل و کفر کے درمیان قرآنِ حکیم اور اللہ کے حکم کے مطابق فرق بتاتے ہیں۔ مجھ جیسے ناسمجھ اور جاہل لوگ اللہ کے ان نیک بندوں سے رہنمائی حاصل کر کے رب کریم کو ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ کسی کو بھی دکھائی نہ دینے والا کائنات کے ہر ذرے اور ہر رنگ میں نظر آتا ہے۔ گردن اور نگاہیں جھکا کر دیکھو رانی...... تمہیں وہ اپنی شاہ رگ سے بھی قریب ترین ملے گا۔“ قادر علی کی باتیں رانی کے حلق میں مٹھاس اور آنسوؤں کی حلاوت گھول رہی تھیں۔

”مرشد کب آئیں گے قادر علی؟“ وہ بے صبری سے بولی۔

”ان کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت کہاں ڈیوٹی کر رہے ہیں؟ یہ میں نہیں جانتا مگر تم نے جو خواب بیان کیا ہے وہ مجھے بھی بے چین کر رہا ہے۔ میں اس کی تعبیر سننے کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں، مرشد سرکار دیدار سے فیض یابی فرمائیں۔“ آخری فقرہ اُس نے دروازے کی طرف دیکھ کر ادا کیا تو رانی بھی دروازے کی طرف دیکھنے لگی جیسے کہ کسی جادو کے تحت ابھی مرشد آجائیں گے مگر وہ قادر علی کی التجا کے پابند نہ تھے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل میں کہیں اور اپنا فرض نبھا رہے تھے۔

”اب تم جاؤ رانی، مرشد آئیں گے تو میں تمہیں بلالوں گا۔“ قادر علی کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

”قادر علی! مجھے لارا نہ لگانا، میں دلی طور پر اپنے دین دھرم کو چھوڑ چکی ہوں۔ اب اسلام کو اپنے دل میں بسا کر اپنی آخرت سنوارنا چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر رانی باہر نکل گئی۔ سردی نے اپنا جوبن دکھانا شروع کر دیا تھا۔ قادر علی کو خنکی محسوس ہونے لگی تو وہ اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ماں جی اور ابا جی نے اسے دین کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی تھی مگر قادر علی جس راہ پر چل نکلا تھا۔ ان راہوں پر دولت کے پھول نہیں بلکہ کانٹوں کی رہ گزر ہی بھلی لگتی تھی۔

اس نے نلکا چلا کر تازہ پانی نکالا اور وضو کرنا شروع کر دیا۔ وہ بڑے خضوع کے ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اب بھی وہ جائے نماز پر قیام کی حالت میں تھا کہ اس کا جسم خوفِ الٰہی سے کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیت اللہ گھوم رہا تھا۔ حاجی طواف کر رہے تھے مگر وہ ایسے کھڑا تھا کہ جیسے سمندر کے کنارے پر کوئی پیاسا کھڑا ہو۔ اس کی آنکھیں برسنے لگیں، وہ رکوع کے بعد سجدہ کی حالت میں پہنچا تو دل نے قادر علی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ قادر علی کو اور ہی دنیا میں لے گیا تھا۔ اس کا وجود اس کا جسم اپنے گھر میں سجدہ ریز تھا مگر قادر علی کی دنیا رب تعالیٰ کے گھر پہنچنے کے بعد فخر اور غرور سے روشن ہو گئی تھی۔ اس کی گردن اس کی آنکھیں اس عظیم اور بہت بڑے گھر کو دیکھنے کے لیے بار بار اُٹھتیں مگر رب تعالیٰ کی ہیبت اور اللہ کی وحدانیت کا جوش و جذبہ نگاہوں کو خیرہ کر دیتا، گردن کو جھکا دیتا، دل کو آنسو برسانے پر مجبور کر دیتا۔ قادر علی نے جی بھر کر غلافِ کعبہ کو چومنا شروع کر دیا، طواف کرتے ہوئے اس کی زبان بھی متحرک تھی۔ اس کی آواز بھی دوسرے حجاج کرام کی آواز کے ساتھ گونجنے لگی۔ اس نے اپنے جسم پر احرام کی چادروں کو بندھے ہوئے دیکھا، کئی بار

انہیں آنکھوں سے چوما۔ اس کی متحرک زبان با آواز بلند پکار رہی تھی۔

"لَبَّیکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیکَ"

وہ اونچی اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا اور آنسوؤں کے نذرانے رب کریم کی بارگاہ میں بطور تحفہ پیش کر رہا تھا۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا، ہچکیاں لے رہا تھا، روتے ہوئے خانہ کعبہ پر نگاہ پڑی تو وہ بھاگ کر سیاہ غلاف میں لپٹے ہوئے اللہ کے گھر کی طرف بڑھا، راستے میں حاجیوں سے ٹکراتا ہوا وہ غلافِ کعبہ کو ایک بار پھر چومنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ غلافِ کعبہ سے لپٹا ہوا دل کی زبان میں قادرِ کریم سے اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔ کسی نے پیچھے سے پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مرشد کو دیکھ کر حیرت سے اس کی چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی۔

"قادر علی! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری آزمائشیں ختم کر دی ہیں۔ جاؤ اب جا کر اس کی مخلوق کی خدمت کرو۔" مرشد کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ ان کی آنکھیں بھی نور برسا رہی تھیں۔ قادر علی اتنے نور کی تاب نہ لا سکا نظریں جھکا کر بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"مرشد میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں اب مدینے جانا چاہتا ہوں۔"

"اللہ کی رحمت سے تم نے ایک خاص مقام پا لیا ہے۔ کوئی بھی اللہ رب العزت کی وحدانیت کے پرچار سے متاثر ہو کر تمہارے پاس آئے، اسے خالی مت لوٹانا۔" مرشد خاموش ہوئے تو قادر علی بول پڑا۔

"مرشد سرکار! میں فقیر کسی کو کیا دے سکتا ہوں؟ دینے والی تو اس عظیم اور بابرکت خدا کی عظیم ذات ہے۔" وہ بیت اللہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"یہ لو قادر علی! اپنی جھولی پھیلاؤ۔" مرشد نے دونوں ہاتھ کی مٹھی بھر کر قادر علی کے احرام کی جھولی میں ڈالی تو قادر علی حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

"سرکار! یہ تو......" وہ آگے کچھ نہ بول سکا۔

"ہاں قادر علی! یہ وہی سکے ہیں جو آج تم نے کسی بچے کو دیئے تھے۔ بس وہی تمہاری آخری آزمائش تھی۔" یہ کہہ کر مرشد آگے بڑھ کر طواف کرنے والے لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئے۔ قادر علی مرشد کے پیچھے لپکا مگر حاجیوں کے بحرِ بے کراں میں ایک شخص کو ڈھونڈنا بڑا معانی رکھتا تھا۔ قادر علی وہیں کھڑا ہو کر رونے لگا۔ اس نے ہاتھ اٹھائے اور رب کریم کے مقدس گھر کی طرف دیکھ کر متحرک ہونٹوں سے دعائیں مانگنے لگا۔

ہجوم بہت زیادہ تھا۔ قادر علی کو دھکا لگا تو وہ آنکھیں کھول کر اپنے اِردگرد دیکھنے لگا۔ منظر ہی بدل گیا تھا، وہ اپنے صحن میں جائے نماز پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ آنسوؤں نے جائے نماز پر سجدہ کی جگہ کو بھگو دیا تھا۔ مرشد سرکار، خانہ کعبہ، احرام، حاجی سب کچھ خواب تھا مگر وہ سکے حقیقت بن کر خواب کو جھٹلا رہے تھے۔ اس کے جائے نماز پر سکے پڑے ہوئے تھے۔ جو آج رات وہ ایک غریب بچے کو دے کر آیا تھا مگر وہی تمام سکے مرشد نے صحنِ حرم میں اس کے احرام کی چادر میں ڈال دیئے تھے۔ اب وہ اس کے گھر اس کی جائے نماز پر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے تمام سکے اٹھائے اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ روئے جا رہا تھا۔ یقیناً اس کی توقع اور استطاعت سے بڑھ کر رب کریم نے اسے عطا کیا تھا۔

☆=====☆=====☆

شادی کا فنکشن کیا تھا امیر لوگوں نے دولت کا شو کروایا تھا۔ فیض الحسن اپنے لیے مخصوص کردہ کوارٹر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسے ملک رحمٰن کا بلاوا آیا تھا۔ اب وہ ملک رحمٰن کے ساتھ اپنی گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔

"تم گاڑی لے کر چلے جاؤ، مانو ہمارے ساتھ کل کو آ جائے گی، گھر کا خیال رکھنا۔" ملک رحمٰن رعونت بھرے لہجے میں یہ کہہ کر ایک طرف چل دیے تھے جب کہ فیض الحسن گم صم کھڑا رہ گیا تھا۔ آتے ہوئے اس نے اور مانو نے پروگرام بنایا تھا کہ وہ دونوں ہی شادی والے گھر سے ایک دن پہلے آ جائیں گے اور فیض الحسن اسے اپنے بھائی منظر علی اور صفدر حسین سے ملوانے لے جائے گا مگر اس کے پروگرام پر ہی نہیں اس کے ارمانوں پر بھی اوس پڑ گئی تھی۔ "حکمِ حاکم مرگِ مفاجات" اسے وہاں سے جانا ہی تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے گیئر لگانا چاہتا تھا کہ مانو آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اداس اور بجھی بجھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آتے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ فیض الحسن نے گاڑی بند کر دی اور پیچھے مڑ کر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"روتی ہوئی تم ذرا بھی اچھی نہیں لگتی ہو۔" وہ اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیتا کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے اور مانو بدنام نہ ہو جائے۔

"فیض الحسن! ماں جی اور رحمٰن بھائی میری منگنی کر رہے ہیں۔" مانو نے بغیر کسی بھی تمہید کے فیض الحسن کے سر پر بم پھوڑ دیا تھا۔ کچھ لمحہ پہلے والا شوخ فیض الحسن یک دم بجھ گیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا قہقہہ گاڑی میں گونجا تو ماہ نور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ڈنگر! تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہاری اس بیوقوفانہ شرارت کو سمجھتا نہیں ہوں۔ ہر بار مجھے ہی بیوقوف اور ڈنگر بناتی ہو، مگر اس بار نہیں مانو بلی۔ اس بار فیضو ڈنگر نہیں بنے گا۔'' اس کی آواز میں وہی شوخی تھی مگر اس کے انداز نے مانو کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے، پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فیض الحسن کی سمجھ میں کچھ کچھ تو معاملہ آ رہا تھا مگر وہ اس کی تفصیل مانو سے سننا چاہتا تھا۔

''مانو! دیکھو...... میری طرف دیکھو......'' اب وہ مکمل طور پر پیچھے کی طرف مڑ گیا تھا۔ ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو کر اس نے مانو کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں تھیں جو کہ فیض الحسن کو سچائی جاننے کے لیے مدد دے رہی تھیں مگر دل انجانے خوف سے اس حقیقت اور سچائی کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھا۔

''تعلیم مکمل ہوتے ہی میری شادی جنید کے ساتھ طے کر دی جائے گی۔ میں مر جاؤں گی فیض الحسن مگر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ میں یہ منگنی نہیں کرواؤں گی۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔ فیض الحسن کے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا۔

''مانو! میں نے کہا تھا نا کہ محبت صرف پانے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ قربان ہو جانا ہی محبت کی معراج ہے۔'' وہ اپنا کرب چھپاتے ہوئے مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔

''ابھی تو آزمائش کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا ہے، تمہارے قدم لڑکھڑانے نہیں چاہئیں مانو۔''

''مگر فیض الحسن! میں یہ منگنی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ اپنی بات پر بضد تھی۔

''جنید سے نہیں کرنا چاہتی یا پھر ابھی نہیں کرنا چاہتی؟''

''میں ابھی منگنی کرنا چاہتی ہوں اور شادی بھی ابھی اور اسی وقت مگر جنید سے نہیں بلکہ تم سے۔''

''اپنی خاندانی روایات اور بڑوں کے فیصلوں کو جھٹلا پاؤ گی؟''

''مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے، میں تمہاری ہوں اور بس تمہاری ہی رہوں گی۔ ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔'' وہ سنجیدہ ہو رہی تھی مگر اس لمحہ اس کو ٹالنا اور سمجھانا ضروری تھا۔ کوئی ایسا کام کرنا چاہیے تھا کہ اس کے خاندان کی عزت پر بھی حرف نہ آئے اور محبت کی لاج بھی رہ جائے مگر فیض الحسن کو کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

''دیکھو مانو! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو، یہ میں جانتا ہوں مگر مجھ پر کتنا اعتبار کرتی ہو یہ

میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''فیض الحسن پلیز میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں، میں زہر کھا کر جان دے دوں گی مگر کسی کو بھی اپنی محبت کی راہ میں حائل نہیں ہونے دوں گی۔''

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔'' وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''میں اپنی ذات سے بھی زیادہ تم پر اعتماد کرتی ہوں اگر ایسا نہ ہوتا تو اکیلی سینکڑوں کلومیٹر کا سفر تمہارے ساتھ نہ کرتی۔'' وہ اب رو دھو کر خاموش ہو چکی تھی۔

''جنید سے منگنی کروالو۔''

''کیا......؟'' اس کی ''کیا'' میں حیرت اور غصے کا ملا جلا تاثر تھا۔

''مجھ پر اعتماد ہے نا؟''

''میں تمہاری کوئی دلیل نہیں سننا چاہتی، میں ابھی تمہارے ساتھ گھر جاؤں گی۔ وہاں سے زیور اور اپنے حصے کی تمام رقم لے کر ہم یہ شہر یہ صوبہ ہی چھوڑ دیں گے اور خوش و خرم زندگی کی ابتدا کریں گے۔''

''مانو......'' وہ چیخ کر بولا تو مانو سہم گئی۔ ''تم بار بار یہ بھول جاتی ہو کہ میں نے تم سے پیار کیا ہے۔ تمہاری دولت اور جسم سے نہیں، میں لالچی یا ہوس پرست نہیں ہوں کہ تم نے کہا اور میں چل پڑوں۔ تمہیں مجھ پر اعتماد ہو یا نہ ہو مگر مجھے اپنی محبت پر اندھا اعتبار ہے۔ میں تمہیں اپنی محبت کے بل بوتے پر حاصل کروں گا۔ یہ منگنی شنگنی میری محبت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے فیض!'' وہ کانپ کر رہ گئی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں، ہم اپنی محبت کو بے مثال بنائیں گے۔ میں بھی تمہارے بغیر زندگی کا تصور گناہ سمجھتا ہوں مگر تمہیں پانے کے لیے میں کسی بھی توہین آمیز راستے کا سہارا نہیں لینا چاہتا۔ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جو کل کو ہمارے اوپر یا ہماری آنے والی نسلوں کے اوپر بدنامی کا لیبل بن کر چپک جائے۔ میرا اعتبار کرو اور جاؤ جا کر منگنی کرواؤ۔'' یہ کہہ کر فیض الحسن نے منہ آگے کی طرف کر لیا۔ ماہ نور سہمی ہوئی گاڑی سے نکلی تھی۔ اس کے اترتے ہی فیض الحسن نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ اس حویلی کے در و دیوار سے خوف کھا رہا تھا۔ یہ قاتل در و دیوار اس سے اس کی محبت چھیننے کے لیے اپنے پُراسرار اور خوفناک پنجے بڑھائے اس کے دل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

طرح طرح کے وسوسوں اور خیالات نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"اگر ماہ نور اس کی نہ بنی تو وہ کسی کی نہ بننے دے گا۔"

"کیا کرو گے؟" کوئی اس کے اندر سے بولا۔

"میں اس دنیا کو آگ لگا دوں گا۔" اس نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہوتا تو دنیا کئی بار جل چکی ہوتی۔ مجنوں، فرہاد، مہینوال اور رانجھا اسے آگ لگا چکے ہوتے۔"

"وہ سب کتابی اور خیالات کے ہیرو تھے، ان کا عشق محض کاغذوں تک ہی محدود تھا مگر میں اپنے عشق کو اپنے خون سے صفحۂ قرطاس پر بکھیروں گا۔ میں مرنے سے پہلے ایک لازوال اور ناقابلِ فراموش مثال دنیا کے لیے چھوڑ جاؤں گا۔ میں ایسے ہی مانو کو کسی اور کی نہیں ہونے دوں گا، نہیں ہونے دوں گا۔" اس کے جوش اور جذبے کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بہت تیز اور خطرناک ہو گئی تھی مگر فیض الحسن ہر قسم کے خطرات سے بے نیاز واپس قصرِ ماہ نور کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ گاڑی اس کے مضبوط ہاتھوں میں کھلونے کی طرح اس کے اشاروں کے مطابق چل رہی تھی۔

اب شہر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا اور ویسے بھی رات ہونے کو تھی۔ اس نے گاڑی ایک جگہ روک کر اپنے آپ کو ٹھنڈا کیا۔ اس نے گاڑی سے اُتر کر ٹھنڈی اور سرد ہوا کے جھونکوں کو اپنے گرم وجود اور ابنارمل ہوتے ہوئے دماغ کو چھو کر گزرنے دیا۔ ٹھنڈی ہوا نے اسے کافی حد تک سکون اور راحت بخشی تھی۔

اس نے گاڑی منظر علی کے گھر کی طرف موڑ لی، کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے فرمانبردار بھتیجے اور بھائی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ صفدر حسین بھی خلافِ توقع خاموش تھا اور منظر علی بھی بجھا بجھا دکھائی دے رہا تھا۔

"فیض الحسن! مجھ پر ایک احسان کرو گے۔" منظر علی نے کھانے سے فراغت پانے کے بعد بستر میں لیٹتے ہوئے کہا تو فیض الحسن چونک کر رہ گیا۔

"کھل کر بات کرو منظر علی! میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔" منظر علی صفدر حسین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں مگر منظر علی پُرسکون تھا۔

"فیض الحسن! زندگی جیسی بے وفا کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کی دوستی کے کاندھوں پر انسان اپنے پاؤں رکھ کر اپنے قد کو اونچا کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ جب انسان کے

جذبات اور رشتوں کی بلند عمارت تعمیر ہو جاتی ہے تو اس نامراد زندگی کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوتی ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر الفاظ ادا کر رہا تھا۔ جیسے کوئی تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے بہت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے، ویسا ہی منظر علی کا حال تھا۔

"اس کی بنیادوں پر تعمیر ہونے والی رشتوں اور محبتوں کی مضبوط عمارت ڈولنے لگتی ہے۔ زندگی کے پاؤں اُکھڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ انسانی وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ زلزلے کی آمد سے پہلے ہی یہ کمزور اور ناقص میٹریل سے بنی ہوئی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔" اس کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ فیض الحسن ہونقوں کی طرح نہ سمجھ میں آنے والی باتیں سن رہا تھا۔

"میں گاؤں کا رہنے والا ان پڑھ اور جاہل بندہ ہوں منظر علی۔ میرے صبر کا اور زیادہ امتحان مت لے، جو بھی بات ہے کھل کر بتا دے میرے یار، اس سے پہلے کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے۔" فیض الحسن کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

"مجھے خون کا کینسر ہے فیض الحسن!" منظر علی کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل کر اس کے دل میں اُتر گئے تھے۔ فیض الحسن اپنی جگہ پر جامد و ساکت ہو گیا تھا۔ بس اس کی آنکھیں ہی حرکت کر رہی تھیں۔

وہ اپنی آنکھوں کے متحرک ڈھیلوں کی مدد سے صفدر حسین کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جس پر ابھی سے یتیمی برس رہی تھی۔ زرد چہرے سے خوشیوں کا رنگ غائب ہو چکا تھا۔ یاقوتی ہونٹوں سے محبتوں بھرے قہقہے فنا ہو گئے تھے۔ خواہشوں اور امنگوں بھری آنکھوں میں یاسیت اور اداسی کی خوفناک بلائیں قبضہ کر چکی تھیں۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے صفدر حسین کے لیے باپ کی موت ایک بہت بڑا دھچکا ثابت ہونے والی تھی۔ فیض الحسن اُٹھ کر اس کے پاس گیا اور اسے گود میں لے کر آنسوؤں کی جھڑیاں لگا دیں۔

"مجھے زندگی کا قرض اتارنے کے لیے فرشتۂ اجل سے یاری نبھانی ہو گی۔" منظر علی دوبارہ بولا۔ "میں نے زندگی میں دو عشق کیے ہیں۔" دونوں ہی منظر علی کی طرف دیکھنے لگے۔

"ایک اپنے فن سے اور دوسرا صفدر حسین کی ماں سے مگر افسوس کہ کاتبِ تقدیر کی مرضی سے دونوں ہی ادھورے رہ گئے مگر میں نے اپنا فن صفدر حسین میں مکمل طور پر منتقل کر دیا ہے۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بعد صفدر حسین کے سر پر ہاتھ رکھو۔ اس کی تعلیم اور دیکھ بھال کا ذمہ میں تمہارے سر ڈال رہا ہوں، فیض الحسن میرے بیٹے کا خیال رکھنا۔"

''منظر علی! میرا تم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ تقدیر مجھ سے پہلے ہی میرے سہارے چھین چکی ہے۔'' اس کی آواز شدتِ غم سے پھٹنے لگی تھی جب کہ صفدر حسین ہچکیاں لینے لگا تھا۔

''میں تمہارا علاج کرواؤں گا، میں ملک صاحب سے بہت سارے روپے اُدھار مانگ لوں گا مگر منظر علی تمہیں اس طرح نہیں مرنے دوں گا۔ تم تو میرے محسن ہو، میں تمہارے لیے اپنی جان کی بولی بھی لگوا دوں گا۔''

''بس کرو فیض الحسن!'' منظر علی ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم خلوص اور محبت سے بھرپور جذبات رکھتے ہو اور میں ان جذبات کا احترام کرتا ہوں۔ بس میرے پاس وقت کم ہے، ڈاکٹروں نے ایک ہفتے کا وقت دیا ہے۔''

''یہ ڈاکٹر اللہ کے شریک تو نہیں بن سکتے۔ زندگی موت تو اس سوہنے رب کے ہاتھ میں ہے۔'' فیض الحسن جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے صفدر حسین کو گود میں لے کر پیار سے سہلانا شروع کر دیا۔ منظر علی کے لبوں پر دردناک مسکراہٹ کی لکیر بن گئی۔ وہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھا رہا پھر منظر علی سے اجازت لے کر قصرِ ماہ نور کی جانب بڑھ گیا۔ اب اسٹیئرنگ کی گرفت ڈھیلی تھی۔ وہ ایسے جا رہا تھا جیسے کوئی جواری جوئے کے اڈے پر اپنی سب سے قیمتی چیز ہار کر جا رہا ہو۔ تقدیر نے اس کے ساتھ مذاق کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے ماہ نور کی منگنی اور پھر دوسرے حملے میں منظر علی کی جدائی۔ اسے قادر علی یاد آ رہا تھا جس نے کہا تھا کہ بہت سی کٹھن راہیں طے کرنے کے بعد اپنی منزل پا سکو گے۔

اگلے دن فیض الحسن معمول کے مطابق جاگا تھا۔ اس نے نماز کی ادائیگی کے بعد حسبِ معمول قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کر دی۔

''ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' اس کے آنسوؤں نے صبر کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ اس نے قرآنِ کریم کو بند کر کے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ وہ منظر علی کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگا تھا۔ اس نے قرآنِ حکیم کو مخصوص جگہ پر رکھا اور گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ شیر خان اونگھ رہا تھا، وہ رات بھر جاگا بھی تھا اور سویا بھی۔ کیونکہ مالک گھر پر نہ تھے، وہ بھی بےفکری سے اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ فیض الحسن نے اسے جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''شیر خان! میرا بھائی سخت بیمار ہے، اسے ہسپتال لے کر جانا ہے، میں جا رہا ہوں مگر ملک صاحب آئیں تو انہیں بتا دینا۔'' وہ یہ کہہ کر جانے لگا تو شیر خان کی نیند میں ڈوبی ہوئی

آواز نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔

''اور ماہ نور بی بی نے پوچھا تو......'' اس کے انداز میں طنز تھا جو فیض الحسن نے محسوس کر لیا تھا۔

''ماہ نور بی بی نے آج کون سا کالج جانا ہے، میں آ جاؤں گا۔'' وہ یہ کہہ کر پیدل ہی گھر سے نکل پڑا۔ شیر خان کے ہونٹوں اور آنکھوں میں شیطانی رقص کی جھلک نمایاں تھی۔

فیض الحسن بس کے ذریعے منظر علی کے گھر پہنچا تھا مگر بہت سے لوگوں کو اس کے گھر کے سامنے جمع دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی تھی۔ صفدر حسین کی چیخ و پکار اسے دور سے ہی سنائی دے رہی تھی وہ بار بار ایک ہی فقرہ ادا کر رہا تھا۔

''میرے چاچے کو بلا دو، میرے چاچے کو بلا دو۔'' فیض الحسن دوڑتا ہوا مجمع کو چیر کر صفدر حسین تک پہنچا تھا۔

لوگوں کو اپنے فن سے محظوظ کرنے والا لازوال فنکار میٹھی نیند سو رہا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر زندگی سے بچھڑنے کی وجہ سے ایک دردناک لکیر مسکراہٹ کی صورت میں پھیل گئی تھی۔ فیض الحسن نے آگے بڑھ کر صفدر حسین کو گود میں بھر لیا۔ وہ دیوانوں کی طرح فیض الحسن کی طرف دیکھنے لگا تھا، پھر وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

منظر علی کو لحد میں اتارتے وقت ایک بار پھر صفدر حسین نے آنسوؤں کو امڈ امڈ کر آنکھوں سے باہر نکلنے دیا تھا۔ اس نے باپ کا آخری دیدار بڑے دکھ اور کرب سے کیا تھا۔ منظر علی کو دفنانے کے بعد محلّہ دار اُن کے گھر افسوس کے لیے آ رہے تھے۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ فیض الحسن منظر علی کا بھائی ہے۔ وہ رات دُکھوں کی سنگین رات تھی۔ صفدر حسین اور فیض الحسن نے آنکھوں میں ہی کاٹ دی تھی۔ دن چڑھے صفدر حسین کی آنکھ لگ گئی تھی۔ قادر علی بھی اُن کے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ نماز کی ادائیگی سے فراغت پا کر زمین پر بیٹھا تسبیح ہاتھ میں پکڑے اللہ کی وحدانیت بیان کر رہا تھا۔ فیض الحسن کو جاگتا دیکھ کر اس نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ فیض الحسن سوجی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے پاس زمین پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

قادر علی نے کچھ پڑھ کر صفدر حسین کی طرف پھونک ماری اور ہاتھ اپنے چہرے پر مل کر بولا۔

''فیض الحسن! زندگی دُکھوں اور پریشانیوں کا گھر ہے۔ اس میں کسی نے بھی بیٹھ نہیں

رہنا۔ اب صفدر حسین کی ذمہ داری تمہارے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ ہمت اور جواں مردی سے حالات کا مقابلہ کرنا۔ آنے والا دور تمہارے لیے کٹھن اور مشکلات کا دور ہوگا مگر اللہ کی رحمت اور اس کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔ جیت سچ کی ہوگی، فتح تمہارے قدم چومے گی۔ ہر کڑے امتحان میں مَیں تمہارے ساتھ ہوں گا مگر مختلف اشکال میں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں محفوظ اور اپنی پناہ میں رکھے گا۔'' وہ اب آسمان کی طرف دیکھنے لگا تھا، پھر اس کے ہونٹ متحرک ہوئے۔

''بہت طویل فاصلہ ہے، طویل جدائی ہے، وقت اپنے آپ کو دہرائے گا، دشمن منہ کی کھائے گا۔'' وہ ایسے بول رہا تھا جیسے کسی سے نہیں بلکہ خود سے ہی باتیں کر رہا ہو۔ فیض الحسن اس کی باتیں توجہ اور غور سے سن رہا تھا۔

''اس کی مقدس کتاب کو اسی ثبات اور توجہ سے پڑھتے رہو، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ فیض الحسن اس کی باتوں پر غور کرنے لگا تھا۔ ''کون سی مشکل تھی جو ابھی آنے والی تھی، وہ کن نامساعد حالات کی جانب اشارہ کر رہا تھا؟ اور اسے کیسے یقین تھا، وہ کیسے جانتا تھا کہ میں قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہوں؟'' وہ خود ہی بڑبڑا کر خاموش ہوگیا تھا۔ وہ باہر کی جانب چل پڑا، باہر نکلا تو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لوگ قطار در قطار بیٹھے قرآن خوانی کر رہے تھے۔ قادر علی بھی ان میں موجود تھا، فیض الحسن نے دوبارہ اندر جا کر صفدر حسین کو جگایا اور دونوں ہی وضو کر کے باہر نکلے تو حیرت سے فیض الحسن کی سٹی گم ہوگئی تھی۔ اب وہاں پر سوائے قادر علی کے کوئی بھی نہ تھا۔ بس چند محلّہ دار تھے جو فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اُٹھا کر ربِ کریم سے مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کر رہے تھے۔ اس نے حیرت بھری آنکھوں سے قادر علی کی طرف دیکھا تو اس نے سر اُٹھا کر اوپر آسمان کی جانب اشارہ کیا کہ اللہ ہی جانتا ہے یہ معاملہ بھی اللہ کا ہے۔

فیض الحسن حیران و پریشان قادر علی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ملک عبدالرحمٰن ایک طرف سے چلے آ رہے ہیں، وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ملک صاحب نے اپنے جوتے اتارے اور اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ملک صاحب کو سلام کیا اور وہیں بیٹھ گئے۔

''میں نے منظر علی کا اخبار میں پڑھا ہے۔'' ملک صاحب کے لہجے میں رعونت اور دبدبہ تھا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ ایک اچھا فنکار اس ملک سے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔'' انہوں نے صفدر حسین کو پاس بلا کر افسوس اور پیار کیا اور دعائے مغفرت کی۔

قادر علی اس پُرغرور شخص کو دیکھ کر خاموش رہا تھا۔

''میری ضرورت پڑے تو مجھے کہنا بیٹا!'' وہ صفدر حسین سے مخاطب تھے۔ ''مجھے تمہاری خدمت کر کے دلی خوشی ہوگی۔ منظر علی بہت بڑا فنکار تھا اور میں اس کا بہت بڑا پرستار۔ مجھے بہت یاد آتا رہے گا۔'' وہ صفدر حسین کے سر پر پیار دیتے ہوئے بولے۔ اب وہ فیض الحسن کی طرف مڑے اور اپنے لہجے کو برقرار رکھا۔

''تسلی سے فارغ ہو کر گھر پہنچنا فیض الحسن، مجھے تم سے اہم بات کرنی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلے گئے مگر فیض الحسن کی دھڑکنیں تیز کر گئے۔ پتا نہیں کون سی اہم بات ہوگی جو اس کے لیے نیا امتحان بن کر ملک رحمٰن کی زبان سے نکلی تھی۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے فیض الحسن؟'' وہ قادر علی کی آواز پر چونک پڑا تھا۔ یہ قادر علی کیا چیز ہے؟ اس نے سوچا مگر وہ جان اور سمجھ نہ سکا۔

''پہلی آزمائش ہے، عشق تو کان چھدوا دیتا ہے، پاؤں شل کر دیتا ہے، ہمت نہ ہارنا۔'' یہ باتیں قادر علی کر رہا تھا مگر فیض الحسن کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ صفدر حسین ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی شوخی اور شرارت بھری مسکراہٹ اور زندگی سے بھرپور قہقہے اس کے باپ کے ساتھ ہی دفن ہوگئے تھے۔

فیض الحسن نے اسے اپنی گود میں لٹایا ہوا تھا۔ وہ مغموم اور اداسی کی تصویر بنا خلاؤں میں ہی گھور رہا تھا جیسے کہ اپنے باپ کو نیلے آسمان پر تلاش کر رہا ہو مگر جانے والے خلاؤں یا آسمانوں کو گھورنے سے واپس تو نہیں آ جاتے۔ بس ہمیں ہی ان کے پاس جانا ہوتا ہے۔ صفدر حسین اللہ کی رضا پر راضی تھا، قادر علی پھر بولا۔

''فیض الحسن! میں چند دن تمہارے ساتھ اس گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔'' فیض الحسن نے اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

''تمہارے لیے اس گھر کا ایک ایک کونا بھی حاضر ہے قادر علی۔ جتنے دن چاہے رہ لو، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ صفدر حسین کے پاس تم ہی رہا کرو۔''

''نہیں فیض الحسن! ہم فقیر لوگ ایک جگہ پر ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہماری ڈیوٹیاں سخت اور وقت کی پابندی کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ بس چند دن پھر میں خود ہی چلا جاؤں گا۔''

''چاچا! بھوک لگی ہے۔'' صفدر حسین نے کہا تو فیض الحسن کو شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ صبح سے ناشتہ کے بغیر ہی وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ فیض الحسن کچھ منگواتا یا

بندوبست کرتا۔ ایک طرف سے ایک خوبصورت معصوم سا بچہ ہاتھ میں تھال پکڑے ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ بچے کے سر پر سفید رنگ کی خوبصورت ٹوپی تھی۔ اس کے چہرے سے متاثر کن نور پھوٹ رہا تھا۔ اس نے پاس آ کر تھال ان کے آگے رکھا اور کوئی بھی بات کیے بغیر واپس لوٹ گیا۔

مزیدار اور لذیذ کھانا ان کی بھوک مٹا رہا تھا مگر قادر علی کا کردار فیض الحسن کے لیے پراسرار ہوتا جا رہا تھا۔

''جتنا زیادہ سوچو گے، اتنا ہی الجھو گے۔'' قادر علی کا اشارہ فیض الحسن کی طرف تھا۔ جس سے وہ گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ قادر علی اس کے لیے معمہ بنتا جا رہا تھا مگر اس لمحہ اس کا ساتھ اس کے لیے عطیۂ خداوندی تھا۔

''مجھے زیادہ کرید میں نہیں پڑنا چاہیے۔'' بس اس نے یہی سوچ کر ذہن میں آنے والی سوچوں کو جھٹک دیا۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن اس وقت قصرِ ماہ نور کے لان میں کھڑا تھا۔ اس کے سامنے اور اردگرد رحمٰن فیملی کے تمام لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ملک رحمٰن نے اس طرح اس کو بلایا تھا یہ بات ماہ نور کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن دل ڈر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی طوفان آنے والا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ گھر میں کوئی ملازم نہ تھا۔ فیض الحسن کی آنکھیں زیادہ جاگنے اور زیادہ رونے کی وجہ سے سوج گئی تھیں۔ ماہ نور نے منگنی کے بعد ابھی تک اس سے کوئی بھی بات نہیں کی تھی کیونکہ انہیں منظر علی کی موت کی وجہ سے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ گھر کے تمام فرد ملک عبدالرحمٰن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جن کے چہرے پر کسی گہری سوچ کے آثار بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو رہے تھے۔

''اپنی اوقات سے زیادہ اونچا اُڑنے والے کسی نہ کسی عقاب کا شکار بن جاتے ہیں۔'' ملک رحمٰن نے اُٹھ کر فیض الحسن کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہنا شروع کر دیا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا کیا مقصد تھا اور یہ بات صرف اس کے لیے تھی یا پھر کسی اور کے لیے اور اگر کسی اور کے لیے تھی تو کس کے لیے؟ وہ اس بات کا فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ملک رحمٰن کی آواز نے سب گھر والوں کے ساتھ ساتھ فیض الحسن کے پاؤں تلے سے بھی زمین کھینچ لی۔

''فیض الحسن! تم نے ماہ نور کے کمرے سے جو تیس ہزار روپے چوری کیے ہیں، وہ کہاں

ہیں؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بات کو کیا سمجھے، مذاق یا پھر کچھ اور؟

''میں آپ کی بات سمجھا نہیں صاحب!'' فیض الحسن کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ تقدیر ایک اور کٹھن امتحان لے کر آ گئی تھی۔

''نہ میں فارسی بول رہا ہوں اور نہ ہی ایسی انوکھی بات جو تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔'' ملک رحمٰن کا رویہ اور لہجہ سخت و سرد ہو رہا تھا۔

اُن کی بیوی، ماں جی، ملک عنایت، ان کی بیوی اور ماہ نور حیرانگی سے اُن دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ماہ نور کے تو ہاتھوں نے کانپنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے، وہ فیض الحسن کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

''آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کھل کر کہیں صاحب، میں جاہل سا بندہ ہوں، پہیلیاں نہیں بوجھ سکتا۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''جس رات تم اکیلے خان پور سے آئے تھے۔ اس رات تم نے ماہ نور کے کمرے سے رقم چوری کی اور صبح ہوتے ہی تم اپنے بھائی کی بیماری کا کہہ کر چلے گئے، شیر خان اکیلا تھا۔ تم نے اتنی نیچ اور گھٹیا حرکت کیوں کی؟'' ملک رحمٰن نے زہر اگلا تو ماہ نور اپنی نشست سے بے اختیار اٹھ کر کھڑی ہو گئی مگر فیض الحسن اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''بھیا! یہ بھی تو ہوسکتا ہے چوری شیر خان نے ہی کی ہو؟'' ماہ نور نے ڈرتے ڈرتے آواز نکالی تو سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''کیونکہ فیض الحسن کے جانے کے بعد اور آنے سے پہلے شیر خان اکیلا تھا۔''

ملک رحمٰن ماہ نور کی طرف مڑے تو سب کے دل دہل گئے۔ ماں جی کسی ان جانے خطرے کے پیش نظر اٹھ کر ماہ نور اور ملک رحمٰن کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔

''تم اس کی وکالت کیوں کر رہی ہو؟'' وہ مشکوک انداز میں بولے تو ماہ نور سٹپٹا گئی۔

''میں سچ کی وکالت کر رہی ہوں۔'' اس کا انداز ابھی بھی سہما ہوا تھا۔

''شیر خان بھی تو سچا ہوسکتا ہے۔'' ایک اور زہریلا تیر آیا۔

''سچے لوگ میدان سے بھاگا نہیں کرتے اگر وہ سچا تھا تو پھر آج کدھر گیا؟'' اس نے ہمت کر کے پہلی بار بڑے بھائی کی بات کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔ سبھی اس کے حوصلے اور ہمت پر حیران تھے۔ خود ملک عبدالرحمٰن بھی ششدر رہ گئے۔

''میں ایک ڈرائیور کے لیے تمہاری اس وکالت کو کیا معنی دوں؟'' ان کا لہجہ سخت ہو

گیا۔

''بات ڈرائیور یا چوکیدار کی نہیں ہے.....'' اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ماں جی نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''خاموش ہو جا مانو! کیوں بھول رہی ہو کہ باپ کے بعد رحمٰن نے تمہاری پرورش کی ہے۔ تمہارے ہونٹوں پر آنے والی ہر خواہش کو عملی جامہ پہنایا ہے، تمہیں شرم آنی چاہیے مانو۔''

''اسے بولنے دیجیے ماں جی! اس کے منہ میں زبان حالات نے نہیں بلکہ اس جاہل اور دو ٹکے کے ملازم کے عشق نے دی ہے۔'' ملک رحمٰن کیا بولے تھے، تمام افراد مع فیض الحسن اپنی اپنی جگہوں پر ساکت و جامد ہو گئے تھے۔ ہوائیں ساکت ہو گئی تھیں، وقت ٹھہر گیا تھا، بات نے پلٹا کھا کر بازی اور امتحان عشق کے سر پر ڈال دیا تھا۔

''پوچھیے اس سے ماں جی! پوچھیے، کیا یہ اس گھٹیا اور ذلیل انسان سے پیار کی پینگیں نہیں بڑھا رہی؟''

''کیا اس خاندان کی عزت اور وقار کو داؤ پر نہیں لگا رہی؟''

''خود مخمل اور نرم و نازک انداز سے پلنے والی میری اس بہن نے ایک ملازم کی صورت میں میری عزت پر ٹاٹ کا پیوند نہیں لگانا چاہا۔''

''کون سی کمی رہ گئی تھی ماہ نور؟'' وہ اب باقاعدہ رونے لگے تھے۔ ملک عنایت نے اٹھ کر بھائی کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر پُرسہ دیا۔ فیض الحسن چور اور مجرم بن کر ایک جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ ماہ نور کے بدن میں تو جیسے لہو ہی نہ تھا، دونوں بھابیاں بھی پریشان تھیں۔ وہ فیض الحسن کو نفرت اور حقارت کی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ''میں نے تمہاری غربت پر ترس کھایا مگر تم نے میری عزت کی طرف اپنے نوکیلے اور ہوس زدہ ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی۔'' فیض الحسن کو نفرت کی آگ جھلسا رہی تھی۔ ماہ نور کو بھی چپ لگ گئی تھی۔

''دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ اگر اک پل بھی رُکے تو گولی مار دوں گا۔'' وہ مزید برہم ہو گئے تھے مگر فیض الحسن اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ ملک رحمٰن پھر گرج کر بولے۔

''چہرے پر معصومیت سجا کر، میری عزت کا قتل کرنے آئے تھے۔ تم جیسے لوگ گندی نالیوں میں پرورش پاتے ہیں اور وہیں ان کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ میں نے سنگین غلطی کی

تھی جو نالی کی اینٹ اپنے محل میں لے آیا۔ تمہاری ماں نے اگر حلال کھایا ہوتا تو آج تم میرے ساتھ حرام زدگی نہیں کرتے۔''

''بس.....بس.....ملک عبدالرحمٰن بس!'' فیض الحسن ہاتھ اٹھا کر بولا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ ''اگر میری ماں کی حُرمت کو گالی دو گے تو یاد رکھنا میں ملازم سے بیٹا بن جاؤں گا اور کوئی بھی بیٹا اپنی ماں کو دی گئی گالی برداشت نہیں کر سکتا۔ یاد رکھنا!'' فیض الحسن کی انگلی اٹھی ہوئی تھی۔ اسے احساس ہوا تو اس نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا۔ وہ ان سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا، ماہ نور کے چہرے پر سناٹا تھا۔

''میں ایسے ہی نہیں چلا جاؤں گا، تمہارے تیس ہزار روپے میں نے نہیں چرائے۔ میرا خون میرا ضمیر اتنا گندہ نہیں کہ کاغذ کے چند ٹکڑوں پر اپنا آپ بیچ ڈالے..... میں نے ماہ نور سے عشق کیا ہے۔ اس کے لیے ہر سزا سہنے کے لیے تیار ہوں مگر یاد رکھنا ملک عبدالرحمٰن اگر تم مجھے کاٹ بھی دو گے نا تو میرا اک اک ریشہ ماہ نور کے عشق میں تڑپتا رہے گا اور میں اپنی ماہ نور کو کبھی بھی تم جیسے جلاد کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔'' وہ آگے بڑھ گیا اور ماں جی کے سامنے جا کھڑا ہو گیا۔

''مجھے معاف کرنا ماں جی، میں کم ذات اور گھٹیا انسان ضرور ہوں مگر آپ کی بیٹی میرے ساتھ سکھی رہے گی، اس بات کی ضمانت دیتا ہوں۔''

''تڑاخ'' ایک تھپڑ فیض الحسن کا رخسار سرخ کر گیا۔ ''اپنی اوقات اور حیثیت دیکھ کر بات کرو تم ہمارے ملازم ہو۔ تمہیں تو ہمارا مشکور ہونا چاہیے کہ تمہیں دو وقت کی روٹی دی، تمہیں کام دیا مگر تم..... افسوس کہ تم نے اپنی حرکت اور ذلالت سے اس گھر کی ہر اینٹ کو داغدار کرنے کی کوشش کی۔'' ماں جی کی غصیلی آنکھیں اور زبان انگارے برسا رہی تھی۔

''میں نے باپ کے بعد مانو کو بہت لاڈ پیار سے پالا ہے مگر اس کا یہ ناز' یہ مانگ پوری کرنے سے پہلے میں خود کو گولی مار لوں گی یا پھر مانو کو کاٹ کر کتوں کے آگے پھینک دوں گی مگر تمہارے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ نہیں دوں گی۔ اپنی منحوس اور گندی صورت لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' ماں جی نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

وہ ماہ نور کی طرف بڑھا تو ملک عبدالرحمٰن نے اسے پیچھے سے کھینچ کر زمین پر گرا دیا اور اس پر لاتوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دی۔ وہ خاموشی سے مار کھا رہا تھا مگر ماہ نور چیخ و پکار کر کے اپنے بھائی کو روک رہی تھی۔ وہ فیض الحسن پر لیٹ گئی تو ملک عبدالرحمٰن نے اسے بالوں سے

پکڑ کر اٹھایا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔

''آج تک تم نے میرے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے مگر آج تم نے خاندان کی عزت داؤ پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہ غلطی میں کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں اس کی ہڈی پسلی توڑ کر چوراہے پر پھینک دوں گا۔ پھر تم دیکھنا یہ بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔'' اس نے ماہ نور کے بال چھوڑ دیے اور ایک جھٹکا دے کر پرے پھینک دیا۔ وہ زمین پر گری ہوئی تھی فیض الحسن درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔

''میں مر جاؤں گی بھیا مگر فیض الحسن کی ہی رہوں گی۔'' اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

اب عشق پر قربان ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ قربانی کا یہی لمحہ تھا۔ اس نے بھاگ کر فیض الحسن کو اٹھایا تو گھر کے تمام افراد کا خون کھولنے لگا۔

''عنایت علی! مانو کو اندر لے جاؤ اور کمرے میں بند کر دو۔ میں اس حرام زادے کی تکہ بوٹی کرتا ہوں۔ اس بے شرم کو اتنی بھی حیا نہیں ہے کہ بڑے بھائی کے سامنے برملا اپنے عشق کا اظہار کر رہی ہے، لے جاؤ اسے۔'' ملک رحمٰن نے عنایت علی سے کہا تو وہ مانو کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ہر بار زمینوں پر جانے سے پہلے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر جایا کرتے تھے مگر اب فیصلہ بڑے بھائی نے سنایا تھا۔ ملک رحمٰن ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔ عنایت علی آگے بڑھے اور بڑی آہستگی سے ماہ نور کو فیض الحسن سے جدا کرنا چاہا مگر اس نے فیض الحسن کو نہ چھوڑا۔

''مانو...... میری جان، میری طرف دیکھو، اِدھر دیکھو۔'' ملک عنایت علی بہن کی منت سماجت کر رہے تھے۔ ''اسے چھوڑ دو، اسے چھوڑ دو، یہ تمہارے قابل نہیں ہے۔'' مانو نے بھائی کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے اعتماد اور پیار جھلکتا ہوا نظر آیا۔ عنایت علی نے پلکیں جھکا کر مانو کو عجیب سی تسلی دی تو اس نے فیض الحسن کو چھوڑ دیا جو اب ملک رحمٰن کی لاتوں اور ٹھڈوں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

گھر کے باقی افراد مانو کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔ وہ بار بار مڑ کر فیض الحسن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی رو رو کر سوج گئی تھیں۔

''عنایت علی! پولیس کو فون کرو۔'' رحمٰن بھائی کا نیا حکم سن کر عنایت علی چونک گئے۔

''میں تو کہتا ہوں بھائی صاحب کہ اس ذلیل کے ساتھ بہت ہو چکی ہے۔ آپ پولیس تک اس معاملے کو نہ ہی پہنچائیں تو بہتر ہے۔''

''مجھے مشورہ دینے سے پہلے یہ ضرور سوچا کرو، میں جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں۔ اس پر چوری کا کیس چلے گا، پولیس اس کی ''خدمت'' کرے گی۔ اس کی ہڈیوں سے عشق گودا بن کر بہہ نکلے گا۔''

پھر چند منٹوں بعد ہی پولیس بے ہوش فیض الحسن کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر لے گئی۔

☆=====☆=====☆

ٹھنڈی ہوا نے سرِ شام ہی سردی بڑھا دی تھی جب کہ رانی چھت پر کھوئی ہوئی بیٹھی تھی۔ آج تین چار دن ہو گئے تھے قادر علی کا کچھ پتا نہ تھا۔ اس کے گھر کے دروازے پر تالہ پڑا ہوا تھا۔ رانی افسردہ بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کی ماتا لکشمی تھی۔ وہ ماتا کی طرف بے تاثر سے انداز میں دیکھنے لگی۔

لکشمی اور رام داس کو اپنی جوان بیٹی کی فکر لگی رہتی تھی۔ وہ آج کل بہت اداس اور مغموم رہتے تھے مگر ساتھ ساتھ وہ کسی جوتشی یا پنڈت کو بھی تلاش کر رہے تھے۔ جو ان کی نظر میں رانی کا علاج کر سکے۔ اب بھی ایک گیانی پنڈت کو اس کا باپ پکڑ کر لایا تھا۔ اس نے رانی کو ٹھیک کرنے کے بہت سے دعوے کیے تھے۔ لکشمی رانی کو پچکار کر نیچے لائی تھی۔ پنڈت کو دیکھ کر رانی کی تیوری چڑھ گئی۔ اس نے آج اٹل فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دے گی۔ اس روز روز کی چخ چخ سے تو جان چھوٹے گی۔ وہ چلتی ہوئی پنڈت کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ پنڈت نے زمین پر ہی اپنا ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ پنڈت رانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''بھگوان کی کرپا سے سب کچھ سپھل ہو جائے گا۔ بس ناری کو ایک بار میرے مندر لے کر آؤ۔'' اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ رانی ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ کھلتا ہوا گورا رنگ اور جسم کے متناسب نشیب و فراز رانی کی دل کشی میں اضافہ کر رہے تھے۔ پنڈت نے رانی کو دیکھتے ہی ایک نظر میں تاڑ لیا تھا کہ یہ لڑکی گھر والوں کو پریشان کر رہی ہے اور گھر والے اس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کریں گے۔ اس نے رانی کے اپنے سامنے بیٹھتے ہی مندر لانے کا عندیہ دے دیا تھا۔

''کیا تمہارا بھگوان اپنی کرپا یہاں نہیں کر سکتا؟'' رانی کے منہ سے تیکھا اور تیز و تند جواب سن کر پنڈت کے ہوش ٹھکانے آ رہے تھے مگر رام داس نے اسے جھڑک دیا۔

''کمینی، کتیا خاموش رہ تجھے پنڈت مہاراج سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔''

"تم خاموش رہو رام داس! ہم اس لڑکی کو بھگوان کی کرپا یہیں بیٹھے بیٹھے بھی دکھا سکتے ہیں۔" پنڈت مہاراج نے رام داس کو ہاتھ اٹھا کر خاموش کرا دیا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ رانی کی حالت ابتر ہونے لگی تو اس نے محسوس کیا کہ پنڈت اپنے جادوئی الفاظ کے ذریعے اس کے دماغ پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے "اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو" کا وِرد کرنا شروع کر دیا۔ ابھی چند مرتبہ ہی پڑھا تھا کہ اس کا دل و دماغ ہر قسم کے بوجھ سے آزاد ہو کر ہلکا پھلکا ہو گیا۔ رانی نے آنکھیں کھول کر پنڈت کی طرف دیکھا اور لبوں پر مسکان سجا کر بولی۔

"آج اپنے بھگوان کو اِدھر ہی بلوا لو مہاراج کیوں کہ آپ سے تو کچھ ہونے والا نہیں ہے۔"

پنڈت کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے کلمات نے الٹا اثر کیا تھا۔ وہ پڑھتا جا رہا تھا مگر رانی کے ہونٹ بھی متحرک تھے۔ پنڈت کی پیشانی پر رنگ سے کھنچے نقشے نے پسینے کی وجہ سے اپنا رنگ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر پڑھنا بند کر دیا اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔

رام داس اور لکشمی حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ کبھی رانی کو اور کبھی پنڈت کو دیکھ رہے تھے مگر پنڈت کی دوڑ نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ حقیقت میں وہ دونوں ہی گھبرائے ہوئے تھے اور وہ رانی سے آنکھیں چرا رہے تھے۔

"ان مٹی کے خداؤں کو چھوڑ دو پتا جی! یہ تمہیں نہ کوئی فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" رانی کی آواز نے ان کی آنکھیں کھول دیں مگر رام داس کی آنکھیں تو غضب ناک ہو رہی تھیں۔

"تُو اپنی زبان کو بند رکھے گی یا کاٹ کر پھینک دوں۔" وہ انتہائی غصے میں تھا۔ "رانی کی ماں، اس کتیا کی زبان پر نہ جانے کیا شبد تھے کہ مہاراج بھاگ گئے۔ پوچھ اس کمینی سے کہ کیا پڑھ رہی تھی؟" رام داس اس بار اپنی پتنی سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کا غصہ بدستور ناک پر چڑھا ہوا تھا، لکشمی بڑے پیار سے رانی کو پچکارنے لگی۔

"دیکھو رانی بیٹی! یہ ہمارے پُرکھوں کا دھرم ہے، ہمیں جو کچھ بھی ملتا ہے بھگوان کی کرپا سے ہی ملتا ہے۔ بس کر دے بیٹی باز آ جا، تجھے کسی مُسلے نے بہکایا ہے۔ یہ اللہ واللہ کچھ نہیں

ہوتا۔ جو نظر ہی نہ آوے اس کی پوجا کیسی؟"

"بس کرو ماتا جی!" وہ لکشمی کو جھڑک کر بولی تو وہ سہم گئی۔ "جو نظر نہ آئے وہی خدا ہوتا ہے، اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے، اپنے من میں دیکھو، دل کی آنکھوں سے جھانکو، تمہیں وہ اپنی شہ رگ سے بھی قریب ملے گا۔"

"تمہارا بیڑہ غرق ہو گیا ہے، جب سے گھر میں تم نے یہ ڈراما شروع کیا ہے۔ رزق کی کمی ہو گئی ہے۔ بھگوان ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ رام رام بھگوان مجھے معاف کرے۔"

رام داس بولا تو رانی اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے پاس جا کر اپنے باپ کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا تو حیرت سے رام داس کی چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر دور ہو گیا۔ لکشمی بھی اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رک گئی تھی جب کہ رانی مسکرا کر ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ ان کے ذہن میں اس وقت رانی کے بارے میں ایک ہی خیال پختہ ہو چکا ہے کہ رانی پر کسی زبردست آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے اور اس کی توقع کے عین مطابق وہی ہوا جس کی اسے امید تھی۔ اس کا باپ سہما ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک اس کے گال پر تھا۔ وہ رانی سے دور ہوتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا۔ "تجھ پر کسی گندی آتما کا سایہ ہو گیا ہے۔ تم اپنے حواس میں نہیں ہو، تم نے اپنے باپ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔" وہ سہما ہوا ڈرے ڈرے انداز میں یہ الفاظ ادا کر رہا تھا۔

شاید رانی نے ہاتھ زور سے لگا دیا تھا۔ وہ باپ کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"جس طرح تمہارے گال پر پڑنے والے تھپڑ کی درد تمہیں اندر تک محسوس ہوئی ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔ بالکل اسی طرح اللہ بھی ہر جگہ موجود ہے مگر دکھائی تب دے گا جب دل کی گہرائی سے اسے محسوس کرو گے، اسے تسلیم کرو گے، جس طرح تمہیں اپنے گال کا درد بغیر دکھائی دیے محسوس ہو رہا ہے۔" وہ سہمے ہوئے رام داس کو چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چھت پر چلی گئی۔ حالانکہ سردی بڑھ گئی تھی مگر اس کی نظریں قادر علی کے مکان کی طرف لگی ہوئی تھیں جس پر ہنوز تالا پڑا ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

اتنی سخت سردی میں فیض الحسن کو برف کے بلاک پر کھڑا کیا گیا تھا۔ وہ شدتِ کرب سے نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ داروغہ نے اسے برف سے اتار کر زمین پر لٹا دیا تھا۔ آج مسلسل

دو دن سے اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک ہو رہا تھا۔ اسے سونے نہ دیا جاتا تھا۔ کبھی کوئی آفیسر اس کے دونوں پاؤں پر ڈنڈا رکھ کر اپنے پورے وزن سے کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی اسے بید کی چھڑی سے پیٹا جاتا تھا۔ کبھی ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔

''وہ تیس ہزار روپے کون سی ماں کو دیے ہیں؟'' فیض الحسن اس ایک سوال کا جواب کئی سو بار ''میں نے چوری نہیں کی'' کہہ کر دے چکا تھا۔ اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ایک اعلیٰ افسر نے اس کی حالت دیکھ کر اسے برف سے اتارنے کا حکم دیا تھا۔

''اگر یہ مر گیا تو سمجھو ہم بھی مر گئے۔'' وہ اپنے ماتحتوں کو جھاڑ پلا رہا تھا۔

''اب دو روز تک اس پر کوئی تشدد نہ کرنا، مجھے لگ رہا ہے کہ یہ اللہ کو پیارا ہونے والا ہے، کہیں تمہارے گلے نہ پڑ جائے۔'' وہ یہ آرڈر کر کے باہر نکل گیا تھا۔ فیض الحسن نے نیم بے ہوشی میں ہی دیکھا کہ ماہ نور چلی آ رہی ہے۔ وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش میں دماغ پر زور دے رہا تھا مگر پھر اس کے ذہن نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا، اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔

اگلی صبح اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو اپنی کوٹھری میں ہی پایا۔ اس کا جسم درد کی شدت سے پھوڑا بنا ہوا تھا۔ سپاہی نے حوالات کا دروازہ کھولا اور اسے باہر نکلنے کے لیے کہا۔ وہ حیرانگی سے اپنی رہائی کے احکامات سن رہا تھا۔ تھانیدار نے اس سے ایک کاغذ پر انگوٹھا لگوایا اور جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے ضمانت دینے والے کا نام پوچھنا بھی گوارا نہ کیا۔ بس اپنے شل ہوتے ہوئے جسم کو لے کر تھانے کے مین گیٹ سے باہر نکلا تو وہی گاڑی کھڑی تھی جو فیض الحسن پرسوں تک ڈرائیو کرتا رہا تھا مگر اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ماہ نور نہیں بلکہ ملک عنایت بیٹھے ہوئے تھے۔ فیض الحسن کو انہوں نے اشارے سے اپنے پاس بلایا وہ ان کی جانب بڑھنے لگا۔

گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر وہ ملک عنایت کے کہنے کے مطابق بیٹھ گیا۔ گاڑی نامعلوم مقام کی جانب چل پڑی۔ سفر خاموشی سے کٹا تھا مگر جس جگہ گاڑی رکی تھی۔ وہ جگہ اجاڑ اور بے آباد تھی۔ فیض الحسن حیرت و استعجاب سے اس جگہ کو دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی گاڑی سے نہ نکلا تھا۔ ملک عنایت کی آواز نے فیض الحسن کی حیرانگی کو توڑا۔

''اس بنجر اور بے آباد زمین کو کہاں تک دیکھ سکتے ہو فیض الحسن؟''

''میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا جناب!'' اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

''یہاں سے دور وہاں تک'' وہ انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے دور تک نگاہیں لے گئے تھے۔

''جہاں تک نظر کام کرتی ہے وہاں تک بلکہ وہاں سے بھی آگے ہماری زمین ہے۔ اتنے وسائل اور روپیہ پیسہ استعمال کر کے بھی ہم اسے قابلِ کاشت نہیں بنا سکے۔'' وہ تاسف اور دکھ سے بولے۔ ''سمجھ رہے ہو یا نہیں؟''

''سمجھ رہا ہوں جناب۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا تھا۔

''تو پھر یہ بھی سمجھ لو کہ جس طرح اس بنجر زمین پر بہت سارا خلوص اور بہت سارا روپیہ استعمال کر کے بھی ایک انچ تک سبزہ یا ہریالی نہیں اُگ سکی۔ بالکل اسی طرح ملک عبدالرحمٰن کا دل بھی ہے۔ بنجر، اجاڑ، بے آباد، اس پر کسی بھی قسم کے خلوص، پیار، محبت اور چاہت کا کوئی بھی اثر نہیں ہو گا کیونکہ وہ ہمارا بھائی ہے اور ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔'' وہ کچھ لمحہ کے لیے خاموش ہوئے تو فیض الحسن بول پڑا۔

''ان باتوں سے میرا تو کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق ہے اور بہت گہرا تعلق ہے فیض الحسن!'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولے تو وہ متوجہ ہو گیا۔ ''جس طرح ہمارا اس زمین سے تعلق ہے بالکل اسی طرح ہمارا تعلق اپنی بہن سے بھی ہے۔ ہم اس زمین پر اپنا دھن اور دولت لٹا سکتے ہیں مگر اپنی بہن کی خوشیوں پر اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔'' وہ آبدیدہ ہو گئے تھے۔ ''مگر بدقسمتی سے میرے ہاتھ میں اس کی خوشیاں نہیں ہیں۔ میں اسے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ دیکھو میرے دونوں ہاتھ ہی خالی ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ فیض الحسن کی طرف بڑھا دیے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر قمیص میں جذب ہونے لگے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ مانو تم سے پیار کرتی ہے اور تم بھی اس پر جان نثار کرتے ہو مگر تمہارا کچھ بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ جیسا وہ کہتی ہے تم نہیں چاہتے اور جیسا تم کہتے ہو وہ نہیں کرنا چاہتی۔ فیض الحسن میں نے تمہاری ضمانت کرا دی ہے۔ اس جگہ کو چھوڑ کر چلے جاؤ ورنہ رحمٰن بھائی تمہیں قتل کروا دیں گے۔ یہ مانو کی تم سے درخواست ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ہماری مانو بھی زندہ نہیں رہے گی اور اگر مانو کو کچھ ہو گیا تو پھر یہ

گھر بھی باقی نہیں بچے گا، کچھ نہیں بچے گا، کچھ کرنا چاہتے ہو تو جلدی سے کرلو کیوں کہ مانو کی منگنی ہو چکی ہے اور اگلے ماہ اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔'' انہوں نے فیض الحسن کو ایک مشہور چوراہے پر اتارا اور گاڑی آگے بڑھا دی مگر وہ تو گنگ ہو گیا تھا۔ اگلے ماہ مانو کی شادی؟ وہ سرتاپا لرز کر رہ گیا۔ اس کی جیب بالکل خالی تھی۔ وہ منظر علی کے گھر کی جانب چل پڑا۔

پریشانیوں اور آزمائشوں کے امتحانوں سے گزرنے کے لیے اسے حوصلے اور ہمت کے ہتھیاروں سے لیس ہونا تھا۔ وہ قادر علی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا، صفدر حسین کی رائے لینا چاہتا تھا۔ گھر میں ہُو کا عالم تھا، منظر علی کی وفات کے بعد فیض الحسن آج واپس گھر آیا تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا مگر صفدر حسین کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ گھر کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا تھا۔ فیض الحسن خدشوں میں گھرا ہوا تھا کہ اوپر سے صفدر حسین کی آواز آئی۔

''اوپر آ جاؤ چاچا!''

وہ اوپر گیا تو ناشتہ دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی۔ ندیدوں کی طرح اپنی بھوک مٹانے کے لیے ناشتہ پر ٹوٹ پڑا۔ صفدر حسین اس کے لیے اور ناشتہ بنا کر لایا۔ چائے نے اس کے جسم میں حرارت بھر دی تھی۔ اس کا بدن تھکاوٹ سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ اس کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ اس کی کراہیں نکلنے لگیں تو صفدر حسین چونک پڑا۔

''کیا بات ہے چاچا، طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

فیض الحسن اسے اپنی کہانی بیان کرنے لگا۔ وہ ہونہار بچہ بڑے انہماک اور محویت سے اس کی داستان سن رہا تھا۔ فیض الحسن نے قمیص اٹھا کر اپنے جسم پر پولیس تشدد کے نشانات دِکھائے تو وہ تڑپ گیا۔

''آؤ نیچے چلتے ہیں، میں تمہارے زخموں پر دوائی لگاتا ہوں۔ تم آرام کرو، پھر اس ملک کے بچے سے بھی نپٹ لیں گے۔''

اس کی بات سن کر فیض الحسن مسکرانے لگا۔ ''تم کیا کرو گے؟'' وہ سیڑھیاں اُتر کر کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔

''ڈنگر ہی ہے، میں کیا کروں گا؟'' وہ فیض الحسن کے انداز سے بولا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔ ''تم دیکھنا کہ تمہارا یہ جگری یار کیا کرتا ہے، بس ایک بار چاچی کی فوٹو دکھا دے پھر میرا کمال دیکھنا۔''

''فوٹو تو میرے پاس نہیں ہے اور میرا سامان بھی ابھی تک ان کے محل میں پڑا ہوا ہے۔ میری ماہ نور کی محبت کی نشانیاں سویٹر اور جرسیاں بھی وہیں موجود ہیں۔'' وہ دُکھ سے بولا تو صفدر حسین مسکرانے لگا۔

''تحفے اور نشانیاں تو بے جان چیزیں ہیں۔ محبت تو جان داروں سے کرنی چاہیے اور یاد بھی انہیں کرنا چاہیے جو تحفے اور نشانیاں دیتے ہیں۔'' وہ کوئی بام اٹھا لایا تھا۔ فیض الحسن کو الٹا لٹا کر اس کی کمر پر ملنے لگا۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا تھا مگر بام نے اسے بڑا سکون پہنچایا تھا۔ اب اس کی آنکھیں نیند سے بوجھ ہو رہی تھیں۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر ماہ نور اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ صفدر حسین دور کھڑا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو صفدر حسین دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا تھا۔

اگلی صبح معمول کے مطابق طلوع ہوئی تھی مگر فیض الحسن کے لیے صدموں اور دُکھوں کی صبح تھی۔ وہ صدموں سے دوچار چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ صفدر حسین نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا، گھر کی دیکھ بھال اور پھر اخراجات کا مسئلہ تھا۔ اب وہ اپنے چاچا اور چاچا اس کا آسرا تھا۔ فیض الحسن نے رات کو چھپ چھپ کر قصرِ ماہ نور جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس ارادہ سے اس نے صفدر حسین کو بے خبر رکھا تھا۔ جیسے تیسے کر کے دوپہر کٹ گئی تھی، پھر شام بھی گہری ہوتی گئی، رات کی بڑھتی ہوئی سردی نے بھی فیض الحسن کا ساتھ دیا تھا، وہ گھر سے نکلا تو صفدر حسین گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس نے اس پر کمبل ٹھیک کیا اور باہر نکل کر گیٹ کو باہر سے تالا لگا دیا۔ قادر علی کا کوئی پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیوں چلا گیا تھا؟

فیض الحسن بس کے ذریعے ان محلوں کی کالونی تک پہنچا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات محفوظ تھی کہ اگر شیر خان نے اس سے کوئی انتقام لیا ہے تو پھر ماہ نور نے شیر خان کو بھی وہاں نہ رہنے دیا ہوگا۔ اسے بھی نکال باہر کیا گیا ہوگا۔ وہ گیٹ سے جانے کی بجائے پچھلی دیوار پھلانگ کر جائے تو بہتر ہوگا کیونکہ سرونٹ کوارٹروں کی طرف سے دیوار اتنی اونچی نہ تھی۔ وہ با آسانی پھلانگ سکتا تھا اور پھر ماہ نور کے کمرے کی کھڑکی بھی اسی طرف کھلتی تھی۔ سخت سردی اور رات کی تاریکی فیض الحسن کا ساتھ دے رہی تھی۔ مقدر کی یاوری تھی کہ اس محل میں کوئی کتا نہ تھا۔ ورنہ وہ بھونک بھونک کر سبھی کو جگا کر اپنی وفاداری ثابت کر دیتا۔

فیض الحسن کے دیکھے جانے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس نے دیوار کے پاس پہنچ کر اپنے جوتے اتارے تو سردی کی تیز لہر نے اس کے وجود کو جھنجھنا کر رکھ دیا مگر اس وقت اس کی ذات

پر موسم کی کسی بھی زیادتی کا اثر نہ ہو رہا تھا۔ بس دیدار کی بھوک نے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اچھل کر اپنے ہاتھ دیوار پر جما دیے اور اپنے جسم کو اوپر اٹھاتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا۔ وہ اندر کی طرف چھلانگ مار کر کچھ دیر گھاس پر بیٹھا رہا۔ وہ اپنی چھلانگ کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا مگر محل والے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اندھیرے کی وجہ سے اندر کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تو وہ سمجھ گیا کہ اندر کا ماحول جوں کا توں ہی ہے جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر زیرو واٹ کا بلب روشن کیا تو دل ڈر بھی رہا تھا کہ اگر کوئی لائٹ جلتی دیکھ کر آ گیا تو کیا ہوگا۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا، ایک گٹھڑی میں باندھا اور لائٹ بجھا کر گٹھڑی سمیت باہر نکل آیا۔

اتنی دیر میں اس نے دیکھ اور سمجھ لیا تھا کہ ابھی تک گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں رکھا گیا تھا۔ واپسی کے لیے یہ راستہ بھی محفوظ تھا مگر فی الحال تو معاملہ ماہ نور کے کمرے تک پہنچنے کا تھا۔ اس نے غور سے ماہ نور کے کمرے کی جانب دیکھا تو دبیز اور گہرے رنگ کے پردوں کے پیچھے اسے کمرے کی لائٹ جلتی ہوئی نظر آئی۔

وہ سمجھ گیا کہ ماہ نور جاگ رہی ہے۔ وہ بھلا کیسے سو سکتی تھی۔ اس نے ایک بہت بڑا رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ عمارت کے اندرونی حصے سے اس کمرے تک جانے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر عمارت کا مین گیٹ جو کہ لکڑی کا دیو ہیکل دروازہ تھا وہ بند تھا۔ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ سردی نے جسم میں کپکپاہٹ طاری کر دی تھی مگر آج وہ خالی واپس نہ جانا چاہتا تھا۔ ملک عبدالرحمٰن نے اس پر تیس ہزار روپوں کا جھوٹا الزام لگا کر اسے پولیس کے حوالے کر کے بہت بڑا جرم کیا تھا۔ وہ اس جرم کی سزا ملک عبدالرحمٰن کو دینا چاہتا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی محبت کے بل بوتے پر مانو کو پانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اب اس نے دوسرا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، وہ مانو کو بھگا کر لے جائے گا اور نکاح کر کے اسے پھر یہیں چھوڑ جائے گا، پھر ملک عبدالرحمٰن کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔

وہ چلتا ہوا پورچ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ پورچ میں ایک لکڑی کی سیڑھی پڑی ہوئی تھی۔ جو اسے باآسانی مانو کے کمرے تک لے جا سکتی تھی۔ اس نے احتیاط سے وہ سیڑھی اٹھائی اور دبے قدموں چلتا ہوا بڑے دروازے کے سامنے سے گزرتا ہوا اپنے کوارٹر تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے احتیاط اور آہستگی سے وہ سیڑھی اپنے کوارٹر کی دیوار کے

ساتھ لگائی اور بالکل دبے قدموں اس پر چڑھنے لگا۔ اب وہ محل کی بالکونی میں تھا۔ جو گھوم کر مانو کے کمرے تک جاتی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ اس جگہ تک پہنچا تھا، بالکنی میں کم واٹ کے دو بلب روشن تھے۔ وہ کمروں کے آگے سے گزرنے لگا تھا اگر ملک عبدالرحمٰن اسے اس وقت وہاں دیکھ لیتے تو یقیناً ایک گولی اس کے سینے میں اتار دیتے اور فیض الحسن کے لیے ایک گولی ہی کافی تھی۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ماہ نور کے کمرے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ اس نے دروازے پر زور دیا تو وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دھیرے سے دستک دی تو اس کا رُواں رُواں کانپ اٹھا کیوں کہ اس کے سامنے اور اردگرد دروازے تھے جو یقیناً گھر کے باقی مکینوں کی مکین گاہیں تھیں۔ اگر دستک سن کر کوئی اور دروازہ کھل گیا تو اس کا کیا بنے گا؟

وہ آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے کوئی بلی کسی چیز سے کھیل رہی ہو۔ بالکنی کیا تھی ایک راہداری بنی ہوئی تھی اگر کوئی اور آ جاتا تو وہ بالکل نہیں بھاگ سکتا تھا اگر ماہ نور جاگ رہی تھی تو اسے دروازہ کھولنا چاہیے تھا۔ پانچویں بار اس نے زور سے دستک دی۔ اس بار دروازہ دھیرے سے کھلا مگر ماہ نور نے باہر نہ جھانکا تھا۔ فیض الحسن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو فیض الحسن کو دیکھ کر حیرت واستعجاب سے ماہ نور کی آنکھیں اور منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر دوڑائی تو رات کا پچھلا پہر گزر رہا تھا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور فیض الحسن اس کے کمرے میں اس کے سامنے حقیقت میں موجود تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے لگ گئی۔

آنکھوں نے برسات جاری کر دی تھی۔ دھڑکنوں نے دھڑکنوں سے ملنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے رہے، پھر ماہ نور کو اچانک جھٹکا لگا۔ وہ فیض الحسن سے الگ ہوئی اور اس نے فوراً دروازے کی کنڈی چڑھا دی، دونوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے فیض الحسن!؟'' وہ اس کے ہاتھوں کو چوم رہی تھی۔ آنکھیں رو رہی تھیں۔

''دنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہے کہ جہاں میں جاؤں اور تمہیں بھول جاؤں۔ حوالات میں بھی تمہیں یاد رکھا، مار کھاتے ہوئے بھی تمہارا کومل سا چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا'' اس نے دونوں ہاتھوں سے مانو کا چہرہ تھام لیا تھا۔ جس پر مردنی اور افسردگی نے

ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

''مانو! میں نے رقم چوری نہیں کی!'' وہ تڑپ کر اس کے سینے سے آ لگی۔

''میں جانتی ہوں اور یہ بھی مانتی ہوں کہ اتنی معمولی سی رقم کے لیے تم اپنی مانو کو نہیں چھوڑ سکتے۔'' وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ دبیز پردوں کی وجہ سے باتیں سنے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔

''مجھے یہاں سے لے چلو فیض، میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ میں اس کھڑکی سے کود کر جان دے دوں گی۔''

''اب یہ جان میری ہے، تم اس کی حفاظت کی ذمہ دار ہو۔ میں تمہیں لینے ہی تو آیا ہوں مگر ابھی نہیں، تھوڑا سا انتظار کرو مانو!''

''میں مزید انتظار نہیں کر سکتی، تمہیں دیکھے بنا قرار نہیں آتا۔'' وہ ضدی بچے کی طرح ضد کرنے لگی تھی۔

''اچھا! سوچ کر بتاؤ، اس گھر میں کون تمہارا ساتھ دے سکتا ہے؟'' وہ یہ سوال سن کر سوچ میں پڑ گئی۔

''ماں جی؟'' فیض الحسن نے پھر سوال کیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بھابیاں؟''

''نہیں......''

''عنایت بھائی؟'' فیض الحسن کی آنکھوں میں یقین تھا، تبھی تو مانو کا سر بھی اثبات میں ہل گیا۔

''مگر تم کیا کرنے جا رہے ہو......؟'' مانو کے سوال میں تشویش تھی۔

''تم عنایت بھائی کو دو دن بعد اس پتا پر بھیج دینا۔'' فیض الحسن نے اپنی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس پر منظر علی کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔

''مگر ایک بات یاد رکھنا مانو۔'' وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ ''عنایت بھائی کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ تم بھی میرے بغیر زندگی کو گناہ اور جرم تصور کرتی ہو۔''

''زندگی کیسی بھی گزرے گی مگر ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے یہ میرا وعدہ ہے۔''

''اب میں چلتا ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑا تو مانو کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا مگر ابھی اسی وقت فیض الحسن کا جانا بہت ضروری تھا۔ ورنہ فجر کی اذان سے ماں جی کی آنکھ کھل سکتی تھی

وہ اس کے گلے سے لگ گئی۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر وہ اس سے الگ ہوئی۔ وہ دھیرے سے باہر نکلا تو مانو نے بھی راہداری میں اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا۔ وہ فیض الحسن کے ساتھ ساتھ چل پڑی تھی۔ دونوں ہی ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف محبت سے دیکھا اور فیض الحسن نیچے اُتر گیا۔ لکڑی کی سیڑھی بدستور اپنی جگہ پر موجود تھی۔ نیچے آنے کے بعد اس نے سیڑھی کو اٹھایا اور پورچ کی جانب بڑھ گیا۔ سیڑھی اپنی جگہ رکھنے کے بعد وہ دبے پاؤں اپنے کوارٹر کی طرف آیا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر اندازے سے اپنی کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائی اور دیوار کے باہر پھینک دی۔ پھر اسی انداز سے جمپ لگا کر دیوار پر چڑھا اور باہر کودنے سے پہلے ماہ نور کے کمرے کی جانب دیکھا تو وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ فیض الحسن نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے جوتے وہیں موجود تھے۔ اس نے جوتے پہن کر گٹھڑی اٹھائی اور پُرسکون انداز میں اس کالونی سے باہر جانے والی سڑک پر چل پڑا جب کہ ماہ نور نے فیض الحسن کو بخیریت واپس جاتے دیکھ کر سکون کی سانس لی۔ اسے اپنی محبت اور فیض الحسن پر بڑا پیار آ رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اداس ہو گئی۔

طرح طرح کے خیالات کی یلغار نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس نے وضو کر کے نمازِ فجر ادا کی اور جائے نماز پر بیٹھ کر اللہ کے حضور اپنے ہاتھ اُٹھا دیے۔

''میرے معبود! اگر میری محبت میں سچائی ہے تو پھر اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ سے مجھے اپنے محبوب سے ملا دے۔ تجھے تیرے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ۔'' اس دعا کے علاوہ اسے فی الحال کچھ بھی یاد نہ تھا، وہ انہی الفاظ کو بار بار دہرا رہی تھی۔

فیض الحسن جب گھر پہنچا تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ وہ صفدر حسین کے بیدار ہونے سے پہلے پہلے گھر جانا چاہتا تھا اور جب وہ تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو صفدر حسین کو پُرسکون انداز میں سوتے دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ نماز کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے وضو کر کے قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی۔ بڑی محبت اور خوش الحانی سے وہ تلاوتِ قرآن کریم میں محو تھا۔

اب عنایت بھائی کو قائل کرنے کے لیے اس کے پاس ٹھوس دلائل ہونے چاہئیں تھے۔ اس کام کے سلسلہ میں اسے قادر علی کی ضرورت تھی مگر وہ ایسا غائب ہوا تھا کہ مڑ کر خبر نہ لی تھی۔ وہ اللہ والا بندہ تھا کوئی نہ کوئی اچھا اور نیک مشورہ ہی دیتا۔

عنایت بھائی نے اس کی ضمانت کرا کے اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا مگر وہ بھی تو ملک

رحمٰن کا بھائی تھا۔ قصرِ ماہ نور کا مکین تھا، دولت مند اور صاحبِ حیثیت تھا۔ پھر اس نے ایک کمی کمین کی ضمانت کیوں کروائی، کیا وہ چاہتا ہے کہ فیض الحسن اور ماہ نور ایک ہو جائیں؟

یہ اس کی سوچ تھی۔ اصل بات تو ان سے ملنے کے بعد ہی سامنے آنے والی تھی۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ تھکان اور رت جگے نے اس کی آنکھوں کو بوجھل کر دیا تھا۔ وہ نیند کی وادی میں کھو گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

قادر علی اس وقت اپنے گھر میں مرشد کے سامنے دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ مرشد نے نگاہ اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ اس میں ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی، انہوں نے سر کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ جھجکتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

''بیٹھو۔'' مرشد کے کہنے پر وہ بھی قادر علی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ قادر علی نے آنکھیں اٹھا کر نہ دیکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ رانی آ گئی ہے۔ اس نے مرشد سے رانی کے متعلق بات کی تھی۔ انہوں نے رانی سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو قادر علی نے رانی کو بتا دیا کہ دو دن بعد مرشد آنے والے ہیں۔ وہ فرطِ جذبات سے اپنی دھڑکنوں پر قابو پا رہی تھی۔ اب بھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دوسری بار نگاہ اٹھا کر مرشد کو نہ دیکھ سکی۔ رعب اور احترام نے اس کی آنکھیں جھکا دی تھیں۔ وہ مرشد کے چہرے پر نورانی ہالے کو دیکھنے کی تاب نہ رکھتی تھی۔

''کیا قادر علی کے عشق میں مبتلا ہو کر مسلمان ہونا چاہتی ہو؟'' مرشد نے پہلا سوال کیا تو رانی کا جسم کانپنے لگا تھا۔ ان کی آواز میں رعب اور دبدبہ تھا۔ پُر جلال لہجہ تھا مگر ان کی بات کا جواب دینا ضروری تھا۔

''نہیں سرکار!'' وہ اپنی دانست میں بہترین الفاظ بولنے والی تھی۔ ''میں اس رب کو دیکھنا چاہتی ہوں جس کو قادر علی سجدے کرتا ہے، جس کو آپ سجدے کرتے ہیں۔''

''مگر وہ تو کسی کو بھی نظر نہیں آتا۔'' مرشد نے کہا تو رانی ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

''میں نے سنا ہے کہ ڈھونڈنے سے وہ مل جاتا ہے۔''

''کیسے ڈھونڈو گی؟''

''آپ کے توسط سے۔''

''مجھے گناہ گار مت کرو، میں تو تمہیں اس کے راستے پر ڈال دوں گا، اسے راضی کرنا، اس کی تلاش تمہارا کام ہے۔'' مرشد خاموش ہو گئے تو رانی بولی۔

''سرکار! میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ اللہ کی وحدانیت سے متاثر ہو کر، اس کے سامنے روزانہ کئی کئی بار جھکنے والے سروں کو دیکھ کر، دن کے بعد رات اور رات کے بعد نکلنے والے دن کو دیکھ کر، سمندر میں پہاڑوں کی طرح کھڑے جہازوں کو دیکھ کر، پتھر میں موجود اس کیڑے کو رزق کھاتا دیکھ کر جس تک پہنچنے والے سبز پتے کو کسی بھی راستے کے بغیر وہ اس کیڑے تک پہنچاتا ہے۔ اتنی وسیع کائنات کا نظام قرآن کریم کے مطابق چلتا دیکھ کر میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں اور یہ بات اللہ جانتا ہے کہ اس میں میری کوئی نفسانی خواہش یا دنیاوی عشق شامل نہیں ہے بلکہ اس کی ذاتِ واحد پر اعتماد ہی مجھے اس مذہب کی طرف راغب کرتا ہے۔''

''اللہ تمہارے ایمان کی حفاظت فرمائے گا۔ وہ بڑا بے نیاز ہے، وہ اپنی رحمت سے تمہاری نیت اور ارادوں کو جانتا ہے، جاؤ جا کر وضو کر لو۔'' انہوں نے رانی سے کہا تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔ مرشد اس کی پریشانی بھانپ گئے تھے، انہوں نے قادر علی سے کہا تو وہ رانی کو صحن میں لگے ہوئے نلکے پر لے گیا اور وضو کرنے کا طریقہ بتانے لگا۔ اچھی طرح باوضو ہونے کے بعد رانی کو اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

''اسلام ایک دین ہے، مذہب نہیں ہے، مکمل ضابطہ حیات ہے۔ زندگی گزارنے کے مکمل طریقے اللہ تعالیٰ نے ایک مقدس کتاب میں قلم بند کر دیے ہیں اور وہ کتاب اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کر کے دین اسلام کے ساتھ ساتھ انبیاء کرام کا سلسلہ بھی بند کر دیا۔ یہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے پیامبر ہوتے ہیں، یہ وہی کچھ کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی ان تک پہنچاتا ہے۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرانِ اسلام نے اللہ کی وحدانیت کی گواہی دی اور کفار کو اسی کے سیدھے راستے پر چلنے کی دعوت دی مگر نامراد ہمیشہ کے لیے ہی نامراد رہے۔ انہوں نے اس دعوتِ کامل کو جھٹلایا اور برائی اور بدی کے راستے پر چل کر اپنے اپنے خدا بنا لیے جو کہ سراسر جھوٹ اور غلط ہے۔ جو لوگ اللہ کی ذات کے سوا کسی بت، درخت، آگ، پتھر، سورج، چاند اور مخلوق میں سے کسی کی عبادت کرتے ہیں وہ سراسر جہنمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے بعد کوئی بھی نبی نہیں آئے گا کیوں کہ آپ صلی اللہ

علیہ وسلم خاتم النبین ہیں۔ دین اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں۔ کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ ان کے بغیر اسلام مکمل نہیں ہوتا۔ تمہیں چیدہ چیدہ اور خصوصی باتیں بتا دی ہیں۔ باقی کسی بھی معاملے میں رہنمائی کی ضرورت ہو تو قادر علی سے پوچھ لینا اور قرآن حکیم سے راہنمائی لینا۔ ان شاء اللہ کبھی بھی خطا نہیں کھاؤ گی۔"

مرشد سرکار نے رانی کو چیدہ چیدہ باتیں بتائیں تو اس کے دل کے بند کواڑ کھلنے لگے۔ وہ عرصہ سے بند ان کواڑوں میں زنگ کو جگہ دے چکی تھی مگر دین اسلام کی روشن شمع نے یک دم اجالا کر کے تمام زنگ جلا دیا تھا، اس کے دل کی دنیا روشن ہو رہی تھی۔

مرشد نے اسے کلمہ طیبہ پڑھایا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ سمجھایا۔ ایمان کی صفات اور اللہ کی وحدانیت کے متعلق بہت سی مفید باتیں بتاتے ہوئے مسلمان کیا۔ اب رانی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی تھی، وہ مسلمان ہو گئی تھی، اس کے ذہن اور دل سے گناہوں کا بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ خود کو پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔

"مرشد!" قادر علی بولا تو وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "اس کے تمام گھر والے ہندو ہیں، کیا یہ ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہے گی؟ اور کیا ان کے برتنوں میں ہی کھائے پیئے گی؟ اور پھر اللہ کی عبادت کرے گی تو کیا اس کے گھر والے برداشت کریں گے؟"

"تمہاری باتوں میں وزن ہے قادر علی مگر چند دنوں کی بات ہے، تم دیکھنا اللہ بڑا ہی بے نیاز ہے۔ خود بخود ہی اس کے گھر والے اس کے اس طرزِ عمل کو اپنانے پر مجبور ہو جائیں گے ان شاء اللہ۔" مرشد نے فرمایا اور رانی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اب تمہارا نام رانی نہیں بلکہ فاطمہ ہے۔ آج سے تم رانی کے نام سے کبھی بھی پکار نہیں سنو گی بلکہ رانی پکارنے والے کو اپنا نام فاطمہ بتاؤ گی۔ تم دیکھنا اس نام کی برکت اور وسیلہ سے اللہ تم پر کتنی مہربانی فرمائے گا۔ قادر علی! اپنے دوست کی مدد کرو، وہ تمہارا منتظر ہے۔" مرشد یہ کہہ کر اٹھے اور باہر نکل گئے۔

"تمہیں مبارک ہو فاطمہ، اللہ تعالیٰ تمہیں اس دینِ کامل پر چلنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔" قادر علی نے کہا تو فاطمہ نے سر جھکا لیا۔

"قادر علی! نماز کیسے پڑھتے ہیں؟" اس کا پہلا سوال تھا۔ وہ خاصی نروس ہو رہی تھی۔

"میں ان شاء اللہ تمہیں قرآن حکیم کے مطابق سب کچھ بتاؤں گا۔ فی الحال تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کرتی رہو، سجدوں میں پڑ کر اس سے اپنے ایمان کی سلامتی مانگتی رہو۔" دو

ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ دونوں کی نظریں اس جانب اٹھ گئیں تو فاطمہ کی روح فنا ہو گئی تھی۔ اس کا باپ اور بھائی خونخوار آنکھوں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔

"کمینی، کتیا، ذلیل، حرامزادی میں اب سمجھا کہ تیرے دل سے اللہ اللہ کی آوازیں کیوں نکلتی ہیں؟" اس کا باپ غصے سے آگے بڑھا تو قادر علی فاطمہ کے آگے کھڑا ہو گیا۔

"رام داس! اب یہ مسلمان ہو گئی ہے۔" قادر علی نے اتنا کہا تھا کہ اس کے باپ نے حیرت سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ جس کا سر جھکا ہوا تھا مگر دوسری طرف سے اس کے بھائی نے قادر علی کے پیچھے سے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو اس کی چیخ نکل گئی، وہ گر گئی تھی مگر وہ اسے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا تھا۔

"تجھ سے تو بعد میں نپٹ لوں گا، اب دیکھنا کہ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔" وہ انتہائی غصے میں فاطمہ کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا مگر اس کا باپ وہیں گنگ کھڑا رہ گیا تھا۔

"قادر علی! تم سچ کہہ رہے ہو یا میرے صبر کا امتحان لے رہے ہو؟" رام داس کو ابھی تک یقین نہ آ رہا تھا کہ قادر علی نے کیا کہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں رام داس!" قادر علی نے کہا تو رام داس نے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

فاطمہ کی چیخوں سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ اس کے بھائی نے اس پر ڈنڈوں اور لاتوں کی بارش کر دی تھی۔ وہ یک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی گئی اور اپنے بھائی کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"اب اگر مجھ پر حملہ کیا تو یاد رکھنا اس محلّہ میں ہم مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور تم چند ہو مسل کر رکھ دیں گے تمہیں۔ اب اپنے ہاتھوں اور زبانوں کو قابو میں رکھنا کیوں کہ میں اب رانی نہیں بلکہ فاطمہ بن گئی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چلی گئی۔ رام داس، لکشمی اور ان کا بیٹا حیران کھڑے رہ گئے تھے، پھر نہ جانے کیا اس کے من میں سمائی کہ وہ بھاگ کر قادر علی کے مکان میں آ گیا۔ قادر علی مرشد کے فرمان کے مطابق فیض الحسن کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہندو جوان راجہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ان دونوں بہن بھائی کے نام رانی اور راجہ رکھے گئے تھے۔ رانی تو اب فاطمہ بن گئی تھی جب کہ راجہ ابھی ایمان کی دولت سے محروم تھا۔ وہ خطرناک عزائم لے کر قادر علی کے گھر آیا تھا۔ اس نے اپنی آستین سے تیز دھار

چھرا نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں خون اگل رہی تھیں۔ وہ غصے اور انتقام کی شدت سے آگے بڑھا مگر قادر علی نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو راجہ کے پاؤں زمین نے جکڑ لیے۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلنے کے قابل نہ رہا تھا۔ غصے اور انتقام کی کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ پوری کوشش کر رہا تھا مگر اس کے پاؤں کے علاوہ پورا جسم متحرک تھا۔ اس کی پریشانی اور خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اب وہ رونے لگا تھا۔

''قادر علی! مجھ پر جادو کر رہے ہو؟'' اس کی آواز میں خوف تھا۔

''نہیں راجہ!'' قادر علی کی آواز میں محبت اور مٹھاس تھی۔ ''یہ کوئی جادو نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور تم پر نفسیاتی اثر ہے، میں نے تمہارے قدم نہیں جکڑے بلکہ تم اپنے کمزور اعتقاد کی بدولت اپنے ہی دھرم کے قیدی بن گئے ہو۔'' قادر علی کا یہ کہنا تھا کہ راجہ کو اپنے پاؤں آزاد محسوس ہوئے، وہ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ قادر علی سے کیا کہے؟ بس وہ اپنی بے بسی اور گھبراہٹ کو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

''اگر اب مجھ پر کسی نے ہاتھ اٹھایا تو میں امام صاحب کو بتا دوں گی اور پھر تمہارا اس محلہ میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔'' فاطمہ نے اندر سے کنڈی لگائی تھی اور وہ کھڑکی سے باتیں کر رہی تھی۔ لکشمی اور رام داس پریشان بیٹھے تھے۔ راجہ نے اپنی بات سنا کر ان کی پریشانی مزید بڑھا دی تھی۔

''میں بھی کہوں کہ اس کمبخت پر کون سا جادو چل رہا ہے۔ یہ نہیں پتا کہ ہمسائے میں ہی عشق کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ وہ کلموہا، کبھی ہیجڑا بن جاتا ہے اور کبھی فقیر بن کر بھیک مانگنے لگتا ہے۔ یہ ان مُسلوں کے ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔'' لکشمی قادر علی کو صلواتیں سنا رہی تھی۔

''اب اس کا کیا کریں لکشمی؟'' رام داس غمگین ہو کر بولا تھا مگر لکشمی کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''کرنا کیا ہے، اس کتیا کو اس مُسلے کے دروازے پر باندھ دو۔ اب ہمارا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' لکشمی نے فیصلہ سنایا تو فاطمہ نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ اس کے چہرے پر عزم تھا کچھ کر دکھانے کا حوصلہ اور جوش نظر آ رہا تھا۔ وہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھی اور چوکھٹ میں کھڑی ہوگئی۔

''دیکھ لو!'' یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں خالی ہاتھ ان کے آگے بڑھا دیے۔ ''میں اس گھر سے خالی ہاتھ جا رہی ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا ہے لکشمی! کہ میرا اب تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اب قادر علی کے گھر میں ہی رہوں گی۔'' یہ کہہ کر فاطمہ نے اپنی چوکھٹ چھوڑ دی اور

باہر گلی میں غائب ہوگئی تھی۔ اس گھر کو اس آنگن کو اس نے اللہ کی محبت میں پل بھر میں چھوڑ دیا تھا اور اللہ اپنی راہ میں قربانی دینے والوں کو دوست اور محبوب رکھتا ہے۔

لکشمی اور رام داس نے بین کرنے شروع کر دیے تھے جب کہ راجہ گنگ ہو کر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ساری اکڑفوں نکل گئی تھی۔ ان لوگوں کے بین سن کر محلّہ دار اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ کسی کو بھی کچھ بتانے سے گریز کر رہے تھے کیوں کہ اس محلّہ میں مسلمانوں کی ننانوے فیصد آبادی تھی مگر پھر بھی بہت اصرار پر لکشمی نے روتے ہوئے بتایا کہ ''قادر علی ہیجڑے فقیر نے ہماری رانی کو مسلمان کر دیا ہے۔''

لوگوں کو اس کے رونے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی مگر اکٹھے ہونے والے نوجوانوں نے یہ سن کر پُرجوش انداز میں ''نعرہ تکبیر'' بلند کیا۔ جس سے ان کے دل دہل گئے۔ وہ رو دھو کر خاموشی سے اندر آ کر بیٹھ گئے جب کہ فاطمہ کو مبارک بادیں دے رہے تھے۔ قادر علی تو گھر پر نہ تھا، محلّے کے امیر کبیر لوگوں نے فاطمہ کو روٹی اور کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا بلکہ ہر روز کھانا بھی پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی۔

اس کی آنکھوں سے شکرانے کے سجدے ٹپک رہے تھے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اسے اس مذہب کو اپنانے کے بعد اتنی محبت اور خلوص ملے گا۔ اسے مرشد کی بات یاد آ رہی تھی۔ ''اس نام کے صدقہ سے تم دیکھنا اللہ تم پر کتنی مہربانی کرے گا۔''

☆=====☆=====☆

''اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ شادی کے معاملہ میں لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے کی بابت پوچھ لینا چاہیے۔ اس معاملہ میں زبردستی نہیں کرنی چاہیے اگر لڑکی راضی ہے اور اس کے گھر کا کوئی اہم فرد اس معاملہ میں وکیل بننے کو تیار ہے تو میں تمہاری ہر طرح کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی رحمت سے۔'' قادر علی اس وقت فیض الحسن اور صفدر حسین کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تینوں اس وقت صفدر حسین کے گھر میں تھے۔ فیض الحسن نے قادر علی کو تمام بات سنا دی تھی۔

''قادر علی! اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خاص کرم نوازی ہے کہ اس رحمٰن و رحیم نے تمہیں اپنے عشق کی سند عطا کی ہے۔ اس نے تمہیں اس کام کے قابل سمجھا اور چنا۔ میں بدنصیب ہوں کہ دنیاوی عشق نے مجھے چن لیا۔'' فیض الحسن کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

نمازِ ظہر کی اذان سن کر قادر علی نے خود بھی وضو کیا اور انہیں بھی وضو کی تلقین کی۔ ان

تینوں نے مل کر نماز ادا کی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے گن گائے۔ اب انہیں ملک عنایت کا انتظار تھا، آج اور اس وقت ہی ان کو پہنچنا تھا۔

''قادر علی! تم میرے بڑے ہو اور میری جگہ تم نے بات کرنی ہے۔'' فیض الحسن نے قادر علی کو بڑے بھائی کا عہدہ دے دیا تھا۔

گیٹ پر دستک کی آواز سن کر فیض الحسن جلدی جلدی باہر کی جانب لپکا۔ گیٹ کھولا تو سامنے ملک عنایت کو دیکھ کر مسکرا پڑا۔ اس نے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ فکر مندی کے آثار چہرے پر لیے اندر داخل ہوئے، وہ گھر کو دیکھ رہے تھے۔ صفائی ستھرائی کا انتظام دیکھ کر ان کے چہرے سے پسندیدگی جھلکنے لگی تھی۔ گھر اگرچہ ان کے محل کی نسبت بہت ہی چھوٹا تھا مگر طریقہ اور سلیقہ گھر کی ایک ایک اینٹ سے جھلک رہا تھا۔

وہ صحن میں بیٹھ گئے تھے، صفدر حسین نے کرسیاں بچھا دی تھیں۔ قادر علی کا تعارف بھی کروا دیا گیا تھا۔ ملک عنایت کی گرما گرم چائے اور سموسوں سے تواضع کی گئی تھی۔ یہ سب ان کی آمد سے پہلے ہی صفدر حسین کے پلان کا حصہ تھا مگر عنایت علی کے چہرے پر افسردگی چھائی دیکھ کر قادر علی بول پڑا۔

''ملک صاحب! اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو برابر پیدا کیا ہے۔'' وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''اس کی کائنات میں کسی کو بھی کسی پر برتری حاصل نہیں ہے مگر سب سے افضل میرا چھوٹا بھائی ہے اور ماہ نور میری چھوٹی بہن جیسی ہے۔ رشتے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر طے کر کے ان کے جوڑے بنائے ہوتے ہیں اور سب سے خوبصورت جوڑا وہی ہوتا ہے جس میں والدین اور بہن بھائیوں کی رضا مندی کے علاوہ اس جوڑے کی بھی مرضی اور پسندیدگی کو عمل دخل ہو۔''

''میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں مگر رحمٰن بھائی اس شادی کے سخت خلاف ہیں کیوں کہ ان کی نظر میں فیض الحسن ملازم اور ڈرائیور ہے۔ اس کی حیثیت ہمارے برابر نہیں ہے، گھر میں کوئی بھی یہ نہ چاہے گا کہ ان کا ملازم ان کا داماد بنے۔'' ملک عنایت نے اپنی پریشانی واضح کی تو قادر علی مسکرانے لگا۔

''وہ صرف ملک رحمٰن کی ہی بہن نہیں ہے، آپ کی بھی ہے اور پھر اس تمام جائیداد کی وارث بھی ہے جس پر تم لوگ رہتے ہو۔ وہ بالغ ہے، قانون اور شریعت ایک بالغ کو اپنے

فیصلے خود کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اگر تم لوگ اس کے فیصلے کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرو گے.....'' قادر علی کچھ دیر کے لیے رک گیا۔ ''اگر وہ خودکشی کر لے تو لوگوں کو برادری کو کیا جواب دو گے؟ کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ وہ باعزت طریقے سے اپنے گھر سے رخصت ہو اور اپنے شوہر کے ساتھ باعزت زندگی گزارے اور تمہاری بھی عزت رہ جائے۔''

''مگر رحمٰن بھائی کو کون سمجھائے گا؟'' وہ قادر علی کی مدلل گفتگو سے قائل تھے۔

''آپ سمجھائیں گے۔'' قادر علی نے بال عنایت علی کے کورٹ میں پھینک دی۔

''میں.....؟'' وہ حیرانگی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے مگر پھر دوسرے ہی لمحے قادر علی کا اشارہ پا کر بیٹھ گئے۔

''میری ایک بات کا جواب سوچ سمجھ کر دینا ملک صاحب!'' قادر علی نے کہا تو عنایت علی کے ساتھ ساتھ فیض الحسن اور صفدر حسین بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم ماہ نور سے کتنا پیار کرتے ہو اور اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

''میرے پاس آپ کی بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔'' وہ لاچارگی سے بولے۔ ''ماہ نور نے سب کچھ بتا دیا ہے، میں اسے مرتا نہیں دیکھ سکتا، مجھے اپنی بہن سے اتنا پیار ہے کہ میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ مجھے بیٹی نہ دے تاکہ میں ماہ نور کو ہی بیٹی سمجھتا رہوں اور اس کی خواہشات کی تکمیل کرتا رہوں۔'' ملک عنایت آبدیدہ ہو گئے تھے۔

''آپ کو اس بیٹی کے پیار کے لیے اپنے سٹیٹس اور شان کی قربانی دینا پڑے گی۔'' قادر علی کی آواز نے ملک عنایت کی آنکھوں میں جھلکنے والے موتی ان کی جھولی میں گرا دیے۔

''بیٹیاں اور بہنیں پرائی امانتیں ہوتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن انہیں بابل اور بھائیوں کا گھر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ عنایت علی ہمیں بتاؤ، تم ماہ نور کو کب یہاں لا رہے ہو؟'' قادر علی کی بات سن کر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہاں.....؟ مگر کس لیے؟''

''رحمٰن بھائی سے بات کر کے دیکھ لو۔ اگر وہ مان جاتے ہیں تو ٹھیک ہے ہم مختصر سی بارات لے کر تمہارے محل میں آئیں گے۔ اگر وہ نہیں مانتے تو تمہیں اپنی محبت اور پیار کا امتحان دینا ہوگا۔ تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ تم ماہ نور سے کتنا پیار کرتے ہو۔ ہمیں دن بتا دینا، ہم یہاں تمہاری موجودگی میں ماہ نور اور فیض الحسن کا نکاح کروا دیں گے۔ باقی معاملات اللہ پر چھوڑ دو۔''

قادر علی خاموش ہوا تو ملک عنایت اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ نہ جانے کون سی بات تھی کہ قادر علی کا لہجہ ملک عنایت کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وہ کوئی بھی بات کیے بغیر اٹھ کر بوجھل سے قدموں کے ساتھ باہر نکل گئے۔

''میرے مالک اگر فیض الحسن اور ماہ نور کی محبت میں پاکیزگی اور سچائی ہے تو ان پر مہربانی فرما اور اس مبارک کام کو اپنی رحمت سے جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچا۔ (آمین)'' قادر علی نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور باہر جانے کے لیے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''قادر علی! کہاں جا رہے ہو؟'' فیض الحسن کی آواز پر وہ مڑ کر دیکھتا ہوا بولا۔

''تمہیں میری ضرورت تھی میں آ گیا، اب کسی اور کو میری ضرورت ہے، میں جا رہا ہوں مگر تمہارے پاس ہی رہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

ناشتے کی میز پر قصرِ ماہ نور کے سبھی افراد جمع تھے۔ پُرسکون ماحول میں ناشتہ ہو رہا تھا۔ راجو اور ملکہ ایک طرف باادب کھڑے تھے۔ ماہ نور اپنی پلیٹ میں رکھے ہوئے سلائس کے ایک پیس سے کانٹے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ سبھی اس کی اندرونی کیفیت سے واقف تھے۔ اس کے دل کی دنیا لٹ چکی تھی۔ اس کا فیض الحسن اس سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کی نیندیں، بھوک، پیاس سب کچھ لٹ چکا تھا مگر رحمٰن بھائی کے حکم کی بنا پر سبھی ممبران کو اکٹھے کھانا اور ناشتہ کرنا ہوتا تھا یہ اس محل کا دستور اور قانون تھا۔

ملک عنایت نے راجو اور ملکہ کی طرف دیکھا اور اشارے سے انہیں جانے کا کہا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو حیرانگی سے دیکھتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گئے۔ ملک عنایت نے کبھی بھی بڑے بھائی کے سامنے آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کی تھی۔ اب بھی ان کا حوصلہ نہیں رہا تھا کہ وہ رحمٰن بھائی سے ماہ نور کے متعلق بات کریں گے مگر جب ان کی نظر ماہ نور کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی اور غمگین آنکھوں کی طرف جاتی تو وہ تڑپ کر رہ جاتے تھے، انہیں قادر علی کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

''اگر اس نے خودکشی کر لی تو کیا کرو گے، پھر تمہاری حیثیت اور تمہارا اسٹیٹس تمہارے کام نہ آئے گا۔'' وہ لرز کر رہ گئے۔

''رحمٰن بھائی!'' انہوں نے حوصلہ کر کے بڑے بھائی کو متوجہ کیا تو وہ ان کی طرف دیکھنے

لگے۔ ملک عنایت ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے رحمٰن بھائی بول پڑے۔

''ہاں کہو...... کیا بات ہے؟''

''ہم نے بابا کی وفات کے بعد آپ سے کچھ نہیں مانگا۔'' وہ حیرانگی سے عنایت علی کو دیکھنے لگے۔

''ہمیشہ آپ کے فیصلوں پر سر جھکایا ہے اور کوشش کی ہے کہ آپ کی فرمانبرداری میں ہم سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہے تھے جب کہ رحمٰن بھائی نیپکین سے ہاتھ صاف کر کے پوری توجہ سے ان کی طرف متوجہ تھے۔

''اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو مانو کی شادی کر دی جائے۔'' وہ جلدی جلدی بات کر گئے تھے۔ گھر کے دوسرے افراد نے بھی سکون کی سانس خارج کی تھی۔

''میں نے تایا جی سے کہہ دیا ہے وہ اگلے ماہ دن اور تاریخ طے کرنے آ رہے ہیں۔'' رحمٰن بھائی نے ماہ نور اور عنایت علی کے دل پر بم گرایا اور کرسی پیچھے گھسیٹ کر جانے لگے۔

''آپ نے...... میری بات...... پوری نہیں سنی۔'' عنایت علی کی اس جرأت پر رحمٰن بھائی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تو پھر کھل کر ایک ہی سانس میں کہہ ڈالو کیوں کہ میں کہاوتوں اور پہیلیوں میں باتیں کرنے کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی میں پسند کرتا ہوں۔''

''میں تایا جی کے گھر مانو کی شادی کے خلاف ہوں۔'' عنایت علی نے بہن کی وکالت میں تمام الزام اپنے سر لے لیا تھا مگر گھر کے تمام افراد اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ماں جی کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ رحمٰن بھائی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ عنایت علی کی طرف بڑھے تو عنایت علی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''بابا کی وفات کے بعد میں نے تمہیں ہر خوشی اور سکھ دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے مگر آج تمہاری زبان سے نکلنے والے الفاظ اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ تم آج تک میرے فیصلے کے مخالف تھے۔'' ان کی آنکھیں شعلہ بنی ہوئی تھیں اور زبان انگارے برسا رہی تھی۔

''اور کس کس کو اعتراض ہے اس شادی پر؟'' وہ گھوم کر ایک ایک کے چہرے کو دیکھنے لگے وہ چلتے ہوئے ماہ نور کے قریب آئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

"عنایت علی کے منہ میں تمہاری زبان ہے۔ یہ میں بہتر جانتا ہوں مگر یاد رکھو مانو! میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر تم لوگ مجھے جذباتی طور پر بلیک میل نہیں کر سکتے۔" اب وہ گھوم کر عنایت علی کے سامنے آ گئے۔ "جو کہہ دیا ہے وہ کرنا پڑے گا اور وہی ہوگا۔" وہ جانے لگے تو مانو کی آواز نے ان کے قدم جکڑ لیے۔

"میں مر جاؤں گی، خودکشی کر لوں گی۔"

وہ ایک بار پھر مڑ کر اس کے پاس آئے۔ "مجھے تمہاری خودکشی پر بہت خوشی ہوگی کیوں کہ تم خاندان کے وقار اور مرتبے کو بلند کر جاؤ گی۔" وہ مڑ گئے لیکن کوئی بات رہ گئی تھی، وہ الٹے قدموں گھومے اور ماہ نور کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر بولے۔

"کہنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے، اتنی پیاری دنیا اور اتنی آسائشیں ایک ملازم کے لیے چھوڑ کر کس کا دل چاہتا ہے کہ وہ موت کو گلے لگائے؟" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے اور مانو روتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب اوپر بھاگ گئی۔ گھر کے تمام فرد گنگ حالت میں پریشان کھڑے تھے کہ یک دم دھم کی آواز نے انہیں لان کی طرف متوجہ کر دیا۔ ساتھ ہی مالی اور ملکہ کی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"مانو بی بی نے خودکشی کر لی، صاحب جی...... صاحب جی۔ مانو بی بی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی ہے۔" ملکہ چیخ چیخ کر انہیں پکار رہی تھی۔ "خون نکل رہا ہے، جلدی کرو......" ملکہ کی چیخ و پکار نے ان کے دل دہلا دیے تھے۔ وہ سبھی ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے ہوئے باہر نکلے تو ماں جی کی چیخ نکل گئی۔ ماہ نور خون میں لت پت لان کی گھاس پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ چھلانگ لگاتے ہوئے سیدھی لان میں نہ گری تھی بلکہ راستے میں بالکنی کی دیوار سے ٹکرا گئی تھی جس کی وجہ سے اس کے سر سے خون نکل رہا تھا۔

ملک رحمٰن سب سے پہلے ماہ نور کے پاس پہنچے تھے۔ باقی لوگ حیرت کی وادی میں گم تھے۔ ایک نظر میں تو لگتا تھا کہ ماہ نور اللہ کو پیاری ہو گئی ہے مگر رحمٰن بھائی کو ہوش آیا وہ جلدی سے گاڑی لے کر آئے ماہ نور کو اس میں لٹایا اور رحمٰن نے عنایت علی کو ساتھ لیا اور گاڑی بھگا دی۔ وہ قریبی ہسپتال جلد از جلد پہنچنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹرز نے پہلے تو کیس لینے سے انکار کر دیا تھا مگر ملک رحمٰن کے تعلقات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ماہ نور کو فوراً ایڈمٹ کرے۔ آکسیجن لگا دی گئی، ڈاکٹرز کی ٹیم ماہرانہ انداز میں ماہ نور کا معائنہ کرنے لگی۔

سر میں کافی چوٹ لگی تھی، آپریشن ہونا تھا، ڈاکٹرز اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی مہارت صرف کرنے لگے۔ گھر کے باقی افراد بھی ہسپتال پہنچ گئے تھے، ماں جی روئے جا رہی تھیں، عنایت علی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں مگر پتھر پر کوئی اثر نہ تھا، پریشانی ان کے چہرے پر بھی تھی مگر خاندانی وقار، رعب اور دبدبہ انہیں باقی تمام لوگوں سے منفرد رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

"رحمٰن! میری بچی بچ جائے گی نا۔" ماں جی کی روتی ہوئی آواز نے عنایت علی کا بھی حوصلہ توڑ ڈالا، وہ بھی ہچکیاں لینے لگے۔

"کچھ نہیں ہوگا مانو کو۔" رحمٰن ماں جی سے نظریں نہ ملا سکے۔

"اگر کچھ ہو گیا تو......" ماں جی اس سے آگے نہ سوچ سکیں اور رحمٰن اس بات کا جواب نہ دے سکے۔

"اگر مانو کو کچھ ہو گیا تو سمجھیں ایک بہن کے ساتھ بھائی بھی دفن ہوگا۔" عنایت علی نے رحمٰن بھائی کو کہا۔ "اور ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔" رحمٰن اندر سے ہل کر رہ گئے۔

اتنی دیر میں ایک ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا، اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا، ماں جی اسے دیکھتے ہی اس کی جانب لپکیں۔

"ڈاکٹر صاحب...... میری بچی کیسی ہے؟" مگر ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، ماں جی کا دل دہل گیا، وہ کوئی بھی بری خبر سننے کو تیار نہ تھیں۔

"آئی ایم سوری ملک رحمٰن...... ہم آپ کی بہن کو نہیں بچا سکے۔ شی از ایکسپائرڈ" ڈاکٹر یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگا تو ماں جی نے اسے روک لیا جب کہ عنایت اور ملک رحمٰن اپنی اپنی جگہوں پر بُت بن گئے تھے۔

"آپ ذرا پھر سے دیکھیں، وہ زندہ ہے۔ میری مانو بلی زندہ ہے، میری مانو نہیں مر سکتی۔ ڈاکٹر صاحب...... ڈاکٹر صاحب پھر دیکھیے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ اب ملک رحمٰن کی طرف بڑھی۔ انہوں نے رحمٰن کی قمیص پکڑ لی، ان کی آنکھیں آنسوؤں کی برسات لگا رہی تھیں۔

"رحمٰن! میری بیٹی مجھ سے چھن گئی ہے۔ اس کے ذمہ دار تم ہو، میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی، کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئیں۔ ڈاکٹرز نے سٹاف کو بلا کر انہیں سنبھالنے کو کہا اور خود جانے لگے تو آپریشن تھیٹر سے ایک جونیئر ڈاکٹر

نکلا۔

''سر! مریضہ زندہ ہے۔'' اس نے سینئر ڈاکٹر کو پکارا تو وہ جلدی سے واپس مڑے اور آپریشن تھیٹر میں گھس گئے۔ عنایت علی کے چہرے پر آس و امید کی کرنیں پھوٹ پڑیں جب کہ ملک عبدالرحمٰن کے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر آسمان کی سمت دیکھا۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ اپنے رب سے دعا کر رہے تھے۔

ملک عنایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں دیوار سے ٹیک لگا کر وہیں فرش پر ہی بیٹھ گئے۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اسے گزشتہ ایک دن سے ماہ نور کے بارے میں برے برے خوابوں نے گھیر رکھا تھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے، اب بھی وہ ایسے ہی خواب سے بیدار ہوا تھا کہ کوئی اس کی ماہ نور کو اس سے جدا کر رہا ہے۔ ماہ نور ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔ ''میں خودکشی کر لوں گی مگر فیض الحسن کے سوا کسی کی نہیں بنوں گی۔'' مگر کوئی ظالم اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے جاتا ہے۔ فیض الحسن کی آنکھ اسی تکلیف دہ خواب کی بنا پر کھلی تھی مگر اس نے غور کیا تو کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ فیض الحسن نے سمجھا کہ قادر علی آیا ہوگا۔ اس نے صفدر حسین کی طرف دیکھا جو گہری نیند سویا ہوا تھا، اس نے آواز دی۔

''کون ہے بھائی؟''

''میں عنایت علی ہوں، دروازہ کھولو۔'' فیض الحسن دوسری طرف کی آواز سن کر گھبرا گیا تھا۔ عنایت علی اس وقت اس کی چوکھٹ پر؟ ناسمجھ آنے والی بات تھی۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ سامنے عنایت علی کھڑے تھے۔ انہوں نے گرم اونی چادر سے اپنے آپ کو لپیٹ رکھا تھا۔ ان کے پیچھے گلی میں کھڑی گاڑی فیض الحسن کو نظر آ گئی تھی۔

فیض الحسن انہیں راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گیا مگر عنایت علی نے اسے اسی وقت اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا گیٹ کو اندرونی طرف سے آٹو میٹک لاک لگا کر ان کے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ملک عنایت علی نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان کا پُراسرار رویہ اس کے لیے تکلیف دہ تھا، اس سے رہا نہ گیا تو وہ بول پڑا۔

''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہسپتال......!'' مختصر سے جواب میں فیض الحسن کے خدشات چھپے ہوئے تھے۔ وہ

تڑپ کر آگے کی طرف جھکا اس نے ملک عنایت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہسپتال!......مگر کیوں؟'' دل انجانے خوف کی گرفت میں تھا۔

''کل ماہ نور نے خودکشی کی کوشش کی تھی، وہ شدید زخمی ہے اور ہسپتال میں داخل ہے اس وقت اس کے پاس میرے علاوہ کوئی نہیں ہے، تم ایک نظر اسے دیکھ لینا۔''

ملک عنایت کی زبان نے اس کے خیالات اور خدشات کی تصدیق کر کے فیض الحسن کی دھڑکنیں بند کر دی تھیں مگر وہ اور فیض الحسن تیز تیز چلتے ہوئے وارڈ تک پہنچے تھے۔ انہوں نے اشارے سے ماہ نور کے بیڈ کی طرف انگلی کی فیض الحسن تقریباً بھاگتا ہوا ماہ نور کے بیڈ کے پاس پہنچا۔ وہ حیرت سے مجسمہ بنا ماہ نور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا سر پٹیوں سے لپٹا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت ایسے تھی گویا کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو، وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بے سدھ پڑی تھی۔ اسے کوئی خبر نہ تھی کہ اس کا فیض الحسن آیا ہے۔ فیض الحسن کی آنکھوں سے دو آنسو نذرانے کے طور پر گر کر ماہ نور کے بدن پر پڑے ہوئے کمبل میں جذب ہو گئے۔ اس کے پاس اظہار کا کوئی اور طریقہ نہ تھا۔ وہ ماہ نور کی محبت کو اس سے بڑھ کر اور کیا نذرانہ پیش کر سکتا تھا۔ وہ واقعی عظیم تھی، اس کی محبت اور چاہت عقیدت و احترام کی حدیں پھلانگ گئی تھی۔ ماہ نور چاہے اور پوجے جانے کے قابل تھے۔ عنایت علی نے فیض الحسن کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ان کے گلے لگ کر رونے لگا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں، اب تم دونوں کو رحمٰن بھائی تو کیا موت بھی جدا نہیں کر سکے گی۔'' وہ اسے دلاسہ دے رہے تھے۔ ''تم دیکھنا کہ عنایت علی اپنی بہن کے لیے اپنا خاندانی وقار اور عزت و آبرو سب کچھ قربان کر دے گا، بس ایک بار مانو کو ٹھیک ہو لینے دو!'' عنایت علی اسے باہر لے آئے تو اذانِ فجر ہونے لگی۔

''عنایت بھائی! میں خود ہی گھر چلا جاؤں گا، آپ لگتا ہے رات بھر سوئے نہیں ہیں، آرام کر لیں میں نماز کے بعد چلا جاؤں گا۔'' فیض الحسن نے کہا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''تم نماز گھر جا کر پڑھ لینا، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ اگر کسی نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو قیامت ہی برپا ہو جائے گی۔'' وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر ہسپتال سے نکل گئے۔

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟'' فیض الحسن نے اپنی تسلی چاہی۔

''مانو ابھی...... بے ہوش ہے، ڈاکٹرز نے اس کے سر کا آپریشن کر دیا ہے۔ دو دن تک

"ہوش آ جانا چاہیے...... ورنہ......" عنایت علی خاموش نہ ہوئے تھے کہ بے تاب و بے قرار عاشق کی زبان سے "ورنہ کیا ہوگا......؟" نکلا۔

"ورنہ دوسرا آپریشن کرنا پڑے گا۔ اگر مانو بالکنی کی دیوار سے نہ ٹکرائی ہوتی تو چوٹ کے لگنے کے امکانات تھے۔ اس کا سر بالکنی کی دیوار سے ٹکرا گیا تو اس کا جسم گھوم گیا۔ وہ سیدھی زمین پر آ کر گری ہے۔ زیادہ چوٹیں اندرونی طور پر ہیں، تم ہی دعا کرو۔" وہ یہ باتیں کرتے ہوئے گھر تک پہنچ گئے تھے۔

"عنایت بھائی! مانو کا خیال رکھنا، میں پروردگار سے دعا کروں گا۔" وہ اداسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ عنایت علی نے اثبات میں سر ہلا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ بوجھل قدموں سے گیٹ کو چابی لگا رہا تھا، ایک چابی اس کے پاس اور ایک صفدر حسین کے پاس تھی۔ وہ اندر داخل ہوا اور وضو کر کے رب کریم کی حمد و ثنا بیان کر کے سجدے میں گر کر اپنا مدعا آنسوؤں کی زبان میں ادا کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں نے برسات کر دی تھی، جائے نماز گیلی ہو گئی تھی۔ اس کے ہر آنسو سے رب کریم کے سامنے ماہ نور کی زندگی کے لیے التجا نکلتی تھی۔ اس کی ہر ہچکی ماہ نور کی زندگی اور سلامتی کی دعا کرتی تھی۔ اس کی ہر دھڑکن اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر ماہ نور کی لمبی عمر کے لیے دعا گو تھی۔ اس کی ہر سانس ماہ نور کو لگنے کے لیے بے چین و بے قرار ہو رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سجدے میں پڑا رہا۔ رب تعالیٰ کو اس کا گڑگڑانا، اس کا رونا، اس کی التجائیں، اس کی دعائیں، اس کی فریادیں، اس کی بے قراری و بے چینی ادا بن کر بھا گئی تھی۔

ماہ نور کو ہوش آ گیا تھا، اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور درد کی شدت سے پھر بند کر لیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے احساسات کو مجتمع کر کے ماحول کا اندازہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے جسم کی ہلچل نے شاف نرس کو اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ فوراً ڈاکٹر کو بلا کر لائی۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے عنایت علی کو مبارک باد دی۔

"ملک صاحب! مبارک ہو، ان کو ہوش آ گیا ہے۔ اب انہیں زیادہ بولنے سے پرہیز کرنا ہو گا بلکہ آپ لوگ ان سے باتیں نہ کریں۔ بس اب انہیں کمرہ میں شفٹ کر دیں۔"

ڈاکٹر نے آخری الفاظ شاف سے کہے اور ملک عنایت کو لے کر وارڈ سے باہر آ گئے۔

"اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے۔ ورنہ ہماری دوائیں اور تجربہ سب بے کار ہو گیا تھا۔ میرے کیرئیر میں یہ پہلا کیس ہے کہ کوئی مریض مکمل ایکسپائر ہونے کے چند لمحوں بعد زندہ ہو گیا ہو۔ یقیناً اس دنیا میں اللہ کی ذات اپنے ہر جگہ ہونے کے معجزات دکھاتی ہے۔"

ڈاکٹر یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور عنایت علی کی آنکھوں سے دو آنسو رب کریم کو شکرانہ پیش کرنے کے لیے بہہ گئے۔ ماہ نور کو کمرہ میں شفٹ کرنے کے بعد ڈاکٹروں نے ماہ نور کو اس کا نام لے کر پکارا تو اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔

"اگر آپ میری آواز سن رہی ہیں تو اپنے ہاتھوں کو جنبش دیں۔" ڈاکٹر کی آواز پر ماہ نور نے اپنے ہاتھوں کو دھیرے سے ہلایا تو ڈاکٹر نے سکون کا سانس لیا کیوں کہ جس طرح سر پر چوٹ کی نوعیت تھی۔ اس سے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنا ذہنی توازن نہ کھو دے یا پھر اپنی یادداشت نہ کھو دے مگر خیر و عافیت ہی تھی۔ ڈاکٹر اپنی تسلی کر کے جا چکا تو ملک عنایت چلتے ہوئے اس کے بیڈ کے پاس بنچ پر بیٹھ گئے۔ ماہ نور کی آنکھیں بند تھیں، انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ چونک گئی۔

"مانو!...... عنایت بھائی ہوں...... پہچانا مجھے۔" ان کی آواز بہن کی حالت دیکھ کر رندھ گئی تھی۔ جواب میں مانو نے ان کے ہاتھ کو تھوڑا سا دبایا جس کا مطلب تھا کہ وہ کہ اپنے خون کو پہچانتی ہے۔ عنایت بھائی خوشی سے مسکرائے تو آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

"پگلی! مجھے رلا دیا نا۔" وہ اپنے آنسو صاف کرنے لگے۔ "اتنا بڑا قدم تم نے کیوں اٹھایا؟" وہ خود ہی عجیب سی سچوئشن سے دوچار تھے۔

"اے اللہ تعالیٰ تُو بڑا مہربانی کرنے والا ہے، میرے معبود میری بہن کو میری زندگی بھی لگا دے۔ اس کے ہونٹوں پر سدا کلیاں اور پھول ہنسی بن کر کھلتے رہیں۔" انہوں نے منہ اوپر اٹھا کر دعا کی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر نکل گئے۔

☆=====☆=====☆

موسم کی تبدیلی ہونے والی تھی۔ چند دنوں میں ہی یخ بستہ ہواؤں کا زور ٹوٹ گیا تھا مگر سردی ابھی بدستور موجود تھی۔ فیض الحسن اور صفدر حسین اپنے اپنے بستر میں پڑے ہوئے تھے۔ صفدر حسین گزشتہ دو دنوں سے ہر روز ہسپتال جا رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ماہ نور کو دیکھ آتا تھا اور آ کر فیض الحسن کو ساری بات تفصیلی طور پر سناتا تھا۔ ڈاکٹروں کے آنے جانے کے اوقات کار اور پھر مانو کے پاس کس وقت میں کون کون ہوتا ہے۔ اس نے تمام تفصیل چاچا کو بتا دی تھیں۔ اب وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"چاچا! تم بھی مانو چاچی سے مل سکتے ہو۔" اس نے یہ کہا تو فیض الحسن پھدک کر اپنے لحاف سے نکل کر اس کی چارپائی پر جا بیٹھا۔

"ویسے چاچا میں نے چاچی کو اب تک جتنا بھی دیکھا ہے بس.....ٹھیک ہی ہے۔" اس کی تیوری چڑھی دیکھ کر فیض الحسن باؤلا ہو گیا۔

"کیا مطلب؟ کہ جتنا بھی دیکھا ہے۔"

"اوہو چاچا.....اس کے چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اس کا مکمل چہرہ تو نظر ہی نہیں آتا" صفدر حسین بڑے بزرگوں کی طرح سمجھا رہا تھا۔

"اچھا! اب ذرا غور سے سن چاچا!" صفدر حسین نے اسے اشارے سے کان اپنے منہ کے پاس لانے کو کہا تو تجسس کے مارے فیض الحسن نے اپنا کان آگے بڑھا دیا۔ صفدر حسین اس کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا تو فیض الحسن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کا منہ بھی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے نکل گیا تھا۔ جسے صفدر حسین نے اپنے ہاتھ سے بند کیا تھا۔

"تم ایسا کر سکتے ہو؟"

"ہاں! اور اس طرح کر سکتا ہوں کہ تم خود بھی حیران رہ جاؤ گے۔" صفدر حسین کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔"

"او کے۔ اب اللہ کو یاد کرو اور صبح بات ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے لحاف اپنے منہ تک کھینچ لیا۔ فیض الحسن کو اس کا یہ آئیڈیا بہت پسند آیا تھا۔ وہ اس خیال سے ہی مسرور و شاداں تھا کہ کل صبح وہ اپنی ماہ نور کا جی بھر کر دیدار کر سکے گا۔

☆=====☆=====☆

اگلی صبح ایک نیا ہی ڈاکٹر ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ جس کے گلے میں اسٹیتھیسکوپ تھا مگر اس نے کوٹ نہ پہنا ہوا تھا۔ پُرسکون انداز میں چلتا ہوا ماہ نور کے کمرے تک پہنچا تھا۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کا راگ الاپ رہا تھا مگر اب بہت ضروری تھا کہ وہ اندر جائے اور اپنی محبت کے مریض کا معائنہ کرے۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی ڈاکٹر کی اپنی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں، اندر موجود مریض کے تمام لواحقین موجود تھے۔ ملک عبدالرحمٰن اپنے تمام تر جاہ و جلال سے سرخ آنکھیں نکال کر نئے ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے مگر دوسرے ہی لمحے ان کی نظریں جھک گئیں۔ وہ اٹھ کر باہر چلے گئے، اب ماہ نور کے پاس ماں جی، دونوں بھابیاں اور ملک عنایت علی موجود تھے۔ صفدر حسین

کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹر نے گلا صاف کیا اور آگے بڑھ کر بدلی ہوئی آواز میں تھوڑا سا سخت لہجہ اپنا کر عورتوں کو باہر جانے کا کہا۔

"اتنا رش مریضہ کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر کی نظریں بیڈ پر لیٹی ہوئی مریضہ پر پڑیں تو ڈاکٹر کی جان میں جان آئی کیوں کہ اب پہلے دن والی ماہ نور میں بہت فرق تھا۔ خوراک نے اپنا کام دکھایا تھا، اس کے چہرے کی زرد ہوتی ہوئی رنگت اب گلابی ہونے لگی تھی اور ماہ نور کی آنکھیں بھی ڈاکٹر پر لگی ہوئی تھیں۔ ماں جی اور بھابیوں کے باہر جانے کے بعد ڈاکٹر نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ نبض دیکھنا شروع کر دی مگر ماہ نور کا ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں جاتے ہی اس کا جسم جھٹکا لے کر رہ گیا۔ اس نے غور سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگا، اس نے ملک عنایت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ملک صاحب! اب آپ کی مریضہ جلد صحت یاب ہو جائے گی۔ ان کی خوراک کا خیال رکھیں اور کوشش کریں کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو سکے۔ انہیں بظاہر تو کوئی روگ نہیں ہے، مگر....." اب وہ بات چھوڑ کر ماہ نور کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ خود بھی اپنا خیال رکھیں، اتنی اونچائی سے چھلانگ لگا کر آپ نے کوئی کمال نہیں کیا بلکہ مجھے دکھ ہوا ہے۔" یہ بات اس نے بالکل آہستہ کی تھی، جسے صرف ماہ نور ہی سن سکی تھی جب کہ ملک عنایت سر کھجا کر رہ گئے۔

"اب اگر ایسا کیا تو..... میں بھی تم سے روٹھ جاؤں گا..... ڈنگر ہے.....!" یہ الفاظ اس نے ماہ نور کے بازو پر اسٹیتھیسکوپ لگاتے ہوئے جھک کر اس کے کان میں کہے تو ماہ نور کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے مگر فیض الحسن نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کی صحت کے لیے بولنا نقصان دہ ہے، میں آتا جاتا رہوں گا۔ آپ کو تفصیلی چیک اَپ بہت ضروری ہے، مجھے تو کوئی دماغی خلل محسوس نہیں ہوتا مگر پھر بھی....." یہ کہہ کر وہ ملک عنایت کی طرف مڑا اور "ٹیک کیئر" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ انگلش کے الفاظ اس نے صفدر حسین سے سیکھ لیے تھے۔ باہر ماں جی اور بھابیاں بنچوں پر براجمان تھیں۔ وہ انہیں نظر انداز کرتا ہوا آگے چل پڑا۔ اس نے اسٹیتھیسکوپ اتار کر شرٹ کے اندر چھپا لیا تھا۔ اب وہ ایک عام آدمی تھا۔ اگر کوئی ڈاکٹر بھی اسے دیکھ لیتا تو وہ سمجھتا کہ کوئی مریض کی عیادت کے لیے آیا ہے مگر ایک بات ثابت ہو گئی تھی کہ صفدر حسین کمال کا فنکار تھا۔ واقعی منظر علی نے اپنا تمام فن اس میں منتقل کر دیا تھا۔ اب اس کے دل کو بھی سکون تھا اور وہ جانتا تھا کہ ماہ نور کو بھی

اس کی یہ بات سن کر اطمینان اور سکون ہو گیا ہو گا کہ ''میں آتا جاتا رہوں گا۔'' مریضِ عشق کو دیدارِ یار کی دوا ہی کافی ہوتی ہے۔ ملک عنایت ان کی بہت مدد کر رہا تھا۔ فیض الحسن اپنے پروگرام کو حتمی شکل دینے کے لیے بے تاب تھا۔ اسے ماہ نور کی بیوقوفی پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ بھلا کوئی تک بنتی تھی کہ اتنی بلندی سے چھلانگ لگا دی، اگر ماہ نور کو کچھ ہو جاتا تو...... وہ اس سے آگے سوچ کر کانپ گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

قادر علی فاطمہ کو نماز پڑھنا سکھا رہا تھا۔ وہ بڑی سمجھدار نکلی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے ارکانِ اسلام پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کا رام داس کے گھر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قادر علی دو دن بعد گھر آیا تھا۔ فاطمہ قادر علی کے گھر میں اپنے آپ کو محفوظ تصور کر رہی تھی۔ مرشد سرکار کی بتائی ہوئی باتیں اس کے ذہن میں محفوظ تھیں، وہ ان پر عمل کر رہی تھی۔ قادر علی نے اسے ایک ترجمے والا قرآن کریم بھی لا کر دیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ قرآنِ کریم کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ مذہب کی طرف اس کا راغب ہونا قادر علی کے لیے خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ وہ جس خواب کو برسوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ وہ فاطمہ کے مسلمان ہونے پر پورا ہو گیا تھا، اب تو لوگ اس سے دعا بھی کروانے لگے تھے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا تو اللہ تعالیٰ حاجت روا کی حاجتیں پوری کر دیتا تھا۔ یہ قادر علی کے لیے انعام تھا جو رب کریم نے اپنی رحمت سے اسے نوازا تھا۔

قادر علی گھر کا دروازہ بند کر کے باہر نکلا اور بازار کی جانب چل پڑا تھا۔ اب وہ بھیک نہیں مانگتا تھا مگر مرشد نے جو سکے قادر علی کو خواب میں دیے تھے، وہی کام آ رہے تھے۔ ابھی تک ان میں کمی نہ ہوئی تھی یہ معاملہ قادر علی اور مرشد کے درمیان تھا اور اس کا گواہ اللہ تھا۔ وہ چلتا چلتا یونہی ویران جگہ پر پہنچا تو ایک فقیر کی صدا نے اسے روک لیا۔

''دنیا تیاگ دی ہے۔'' وہ یہ سن کر فقیر کی طرف مڑا تو وہ فقیر پھر بولا۔ ''کہنا آسان اور کرنا بہت مشکل ہے قادر علی!'' اپنا نام اجنبی فقیر کے منہ سے سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا مگر وہ خاموشی سے اس فقیر کی باتیں سننے لگا۔

''اسلام اور شریعت اس بات کی اجازت کہاں دیتے ہیں کہ ایک ہی چھت تلے غیر محرم عورت اور مرد رہیں۔ شیطان کے وسوسوں نے اگر تمہیں بہکا دیا تو کیا کرو گے؟'' یہ کہہ کر وہ فقیر آگے چلا گیا مگر قادر علی کے لیے کئی سوالات چھوڑ گیا۔ وہ پریشانی کے عالم میں واپس گھر

کی طرف واپس پلٹ آیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ فاطمہ اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے گھڑے سے پانی بھر کر قادر علی کو دیا وہ ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس پی گیا، اس کے اندر آگ لگ گئی تھی۔ وہ فاطمہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ سہم گئی۔ خود قادر علی بھی سہم کر رہ گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں ''لاحول ولاقوۃ'' کا ورد کرنے لگا۔ عشاء کی اذانیں شروع ہوئیں تو وہ وضو کرنے لگا۔ فاطمہ نے بھی وضو کیا، فاطمہ نے اندر کمرے میں جائے نماز بچھالی جب کہ قادر علی صحن میں ہی نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں نے بہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے رکوع وسجود کو طویل کر دیتا تھا۔ فقیر کی صدا نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ ''غیر محرم، غیر محرم'' کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ نماز ختم کر کے قادر علی سجدے میں گر گیا۔ پھر تو جیسے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ قادر علی پورے خضوع کے ساتھ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ وہ اپنے گھر کے صحن میں سجدہ ریز تھا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی اس کا بدن کانپنے لگا تھا۔

''میرے معبود! میرے پروردگار...... میری مدد فرما۔''

''میرے اللہ! اپنی رحمت اور محبتوں کا نزول فرما۔''

''میرے مالک و معبود! مجھے شیطان مردود کے وسوسوں سے محفوظ فرما۔''

''اے پروردگار! خالقِ کائنات میری رہنمائی فرما۔ میں گناہوں اور غلطیوں سے لتھڑا ہوا تیرا گناہ گار و عاجز بندہ ہوں، میں اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اپنے فیصلے تیری رضا کے بغیر کر سکوں۔''

''بس میرے معبود میری مدد فرما۔ اپنے پیارے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ اور وسیلہ سے میری رہنمائی فرما۔''

قادر علی کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ فاطمہ کچھ بھی نہ سن سکتی تھی کہ قادر علی کیا کہہ رہا ہے؟ فاطمہ نے قادر علی کو ہلانا مناسب نہ سمجھا، وہ جانتی تھی کہ قادر علی رب تعالیٰ کو سجدہ کرتے وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

قادر علی کے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تو وہی فقیر جو گلی میں صدا لگا رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، قادر علی اس کی طرف ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم بہت مقدر والے ہو قادر علی! تمہارے لیے خطرے کی گھنٹی بجتی ہے اور تم اس کو بھانپ لیتے ہو، رب تعالیٰ تو ہر کسی کی فریاد سن لیتا ہے۔'' وہ فقیر فرش پر قادر علی کے پاس ہی

بیٹھ گیا۔ قادر علی بھی اب سجدے کی حالت سے نکل آیا تھا۔ لہٰذا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"لوگوں کے عیب کی پردہ پوشی کرو، اللہ تمہارے عیب چھپائے گا۔ قادر علی، جاؤ اور جا کر فاطمہ سے نکاح کرو اور شریعت پر عمل کرتے ہوئے اللہ کی فرمانبرداری اور سنت نبوی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہو۔" قادر علی اس کی طرف حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" وہ اپنا سوال دہرا بیٹھا تھا۔

"تم کون ہو قادر علی! پہلے یہ تو سمجھ لو، پھر دوسروں کی ٹوہ میں رہنا۔" قادر علی یہ سن کر خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے اس فقیر کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا مگر اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا گم ہو گیا تھا۔

قادر علی ایک جھرجھری لے کر اٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ فاطمہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت کر بیٹھی تھی۔ وہ جائے نماز سے اٹھا اور فاطمہ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ حیرانگی سے قادر علی کا یہ انوکھا روپ دیکھ رہی تھی۔ وہ چلتا ہوا فاطمہ کے سامنے جا کر رک گیا۔ وہ فاطمہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو سکون محسوس کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر اپنی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی تگ و دو میں مصروف رہا۔ فاطمہ حیرت واستعجاب کے عالم میں یہ ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ یا پھر قادر علی سے کیا کہے؟ اس کی الجھن قادر علی نے حل کر دی، وہ خود ہی بول پڑا۔

"اسلام اور شریعت کا قانون ہے کہ دو غیر محرم ایک ہی چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے اور پھر اس صورت میں تو قطعی نہیں رہ سکتے کہ جب ایک مرد ہو اور دوسری عورت اور وہ بھی نوجوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھ چکے ہوں۔" وہ کچھ دیر توقف کر کے بولا۔ "فاطمہ! میری بات کو سمجھنے کی اچھی طرح کوشش کرنا، میں اگر تم سے کہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ تو میرا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کیوں کہ تم نے اللہ کی وحدانیت پر یقین کرنا اور اپنا مذہب اسی گھر سے تبدیل کیا تھا۔ اگر میں تمہیں کہوں کہ تم مجھ سے نکاح کر لو تو اس پر اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" وہ خاموش ہوا تو فاطمہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر رہ گئی، وہ کچھ نہ بول سکی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ابھی نکاح کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو۔ یوں سمجھ لو کہ میاں بیوی بننے کے لیے اسلام میں اللہ تعالیٰ کے قانون اور سنتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کر کے ہی رشتہ نبھایا جاتا ہے۔ یہ بھی سوچ لینا کہ میں غریب آدمی ہوں۔ کئی کئی دن فاقے بھی

کرنا پڑیں گے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر شاکر و صابر رہنا پڑے گا۔ آج کی رات تمہارے پاس ہے، اچھی طرح سوچ لو' میں تم سے نکاح کرنے پر راضی ہوں مگر تمہاری رضامندی سے۔" یہ کہہ کر قادر علی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ فاطمہ گم صم کھڑی تھی، اس کے دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اللہ کے قانون اس پر آہستہ آہستہ واضح ہو رہے تھے۔ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کیا تھی۔ اس پر ایک ایک نکتہ واضح ہونے لگا تھا۔

اس کی سوچیں منتشر ہونے لگی تھیں۔ وہ خود تو کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی اور نہ ہی اتنی طاقت رکھتی تھی کہ اتنے بڑے فیصلے کو اکیلی ہی کر پائے۔ اس نے قادر علی کی طرح اس فیصلہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد لینے کی ٹھان لی۔ اس نے جائے نماز بچھائی اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔ فاطمہ کو اس سجدہ میں بہت سکون ملا تھا، دل کو تسلی ہوئی تھی، اسے یہ بھی خبر نہ رہی تھی کہ وہ کس جگہ پر ہے۔ تاحدِ نگاہ نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ وہ اسی نور کی مستی میں مدہوش ہو گئی تھی۔ پُرنور ہیولوں سے طرح طرح کی روشنیاں اور شعاعیں پھوٹنے لگیں۔ فاطمہ نے رو رو کر رب تعالیٰ سے مدد چاہی اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ کی ذات کو اپنا مددگار طلب کیا۔ وہ الفاظ نہ جانتی تھی ان کا مفہوم نہ سمجھتی تھی مگر اتنا ضرور جانتی تھی کہ وہ جتنی بار بھی اپنی زبان سے لفظ اللہ ادا کرتی ہے دل کی دنیا روشن و منور ہو جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ نیند کا غلبہ بھی اس پر اللہ کا عطا کردہ تھا۔ وہ جائے نماز پر ہی سو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ قادر علی خوبصورت زرق برق لباس پہنے ایک تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور وہ دُور کھڑی اس کی کنیزوں میں شامل ہے۔ قادر علی اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تو وہ شرما جاتی ہے مگر ایک عورت جو کہ شکل سے انتہائی خوبصورت ہے مگر اس کا لباس انتہائی میلا کچیلا ہے۔ وہ فاطمہ کو آگے کی طرف دھکا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تم خوش قسمت ہو قادر علی نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا سے چنا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ قادر علی کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ تو ہر طرف سے "مبارک ہو" کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ اس شور اور قادر علی کی قربت کے لمحات فاطمہ کے لیے قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔

اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ قادر علی کے گھر میں صحن پر اپنی جائے نماز پر پڑی ہوئی ہے اور نماز تہجد کی اذانیں ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے فیصلے پر اپنی رحمت کی مہر ثبت کر دی تھی۔ وہ ایک بار پھر سجدہ میں گر کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگی۔ اس نے قادر علی کو گھر میں نہ پا کر بے چینی سے اس کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ قادر علی کو اپنے فیصلے سے آگاہ

کرنا چاہتی تھی۔ امیری غریبی سبھی کچھ اللہ کے اختیار میں تھا مگر قادر علی جیسا جیون ساتھی یقیناً اللہ کی طرف سے فاطمہ کے لیے نومسلم ہونے کا کھرا انعام تھا اور وہ اس کی حقدار بھی تھی۔

قادر علی گھر کے صحن میں داخل ہوا تو فاطمہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے قادر علی کو غور سے دیکھا تو اس کے سامنے قادر علی کا وہ روپ آ گیا جب وہ ہیجڑا تھا مگر فاطمہ اسے ہیجڑا تسلیم نہ کرتی تھی، وہ جانتی تھی کہ قادر علی ایک بھرپور نوجوان ہے اور قادر علی کے پاؤں میں گھنگرو اس کی آزمائش نے بندھوائے تھے۔ یہیں سے فاطمہ کو قادر علی سے عشق ہوا تھا مگر اس نے فاطمہ کو ٹھکرا دیا تھا کیوں کہ وہ حُبِ الٰہی سے سرشار تھا۔ اس کی زندگی میں دنیاوی عشق کی کوئی جگہ نہ تھی۔ فاطمہ نے بھی اس اللہ کو ملنے کی ٹھان لی، جس کے عشق میں قادر علی دیوانہ ہو چکا تھا۔ بس یہیں سے فاطمہ کا دُنیاوی عشق، عشقِ حقیقی میں بدل گیا۔

وہ اللہ کی تلاش میں نکلی تھی مگر اللہ کو اس کی یہی ادا بھا گئی کہ اس نے اپنا مذہب، گھربار، والدین اور بھائی کو اللہ کی راہ میں چھوڑ دیا تھا اور پروردگار اپنے خاص بندوں پر خاص ہی انعام فرماتا ہے۔ اب اسے اسلام بھی مل گیا تھا اور قادر علی بھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو فاطمہ؟'' قادر علی کی آواز پر وہ چونکی۔

''میں تم سے نکاح کے لیے تیار ہوں قادر علی!''

''تمہاری اس مرضی میں کہیں ماضی کا عشق تو نہیں چھپا ہوا فاطمہ؟''

''نہیں قادر علی! اس راہ پر چل کر میں جان چکی ہوں کہ عشقِ حقیقی ہی اصل عشق کی روح ہے۔ میری ہاں میں میری مرضی نہیں بلکہ اللہ کی رضا شامل ہے اور اللہ میرے لیے بہتر کرنے والا ہے۔'' فاطمہ کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا، وہ ربِ واحد کی ذاتِ مقدس پر اس طرح اعتقاد و اعتماد کر رہی تھی جیسے کہ وہ اس لفظ سے صدیوں پرانی شناسا ہو۔

''تو پھر ٹھیک ہے میں امام صاحب کو لے آؤں گا۔ فجر کی نماز کے بعد ہمارا نکاح ہو جائے گا۔'' فاطمہ شرما کر اندر چلی گئی۔

قادر علی نے امام مسجد صاحب سے بات کی تو انہوں نے باقی نمازیوں کو بھی بتا دیا۔ بس پھر کیا تھا سبھی نمازی قادر علی کے گھر مٹھائیاں اور پھولوں کے ہار لے کر پہنچ گئے۔ دلہن کو امام صاحب کی بچیوں نے سجایا سنوارا۔ بس سادگی سے ان دونوں کا نکاح کروا دیا گیا۔ قادر علی بھی بہت خوش تھا کہ اس نے شریعت کی پابندی کی ہے اور فاطمہ بھی اس انعام کے مل جانے پر مسرور تھی مگر رام داس اور لکشمی کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ راجہ کا کوئی پتا نہ تھا وہ کئی

روز سے گھر سے فرار ہو گیا تھا۔ فاطمہ کو ان کے کسی بھی دُکھ سُکھ کی فکر نہ تھی کیوں کہ اب وہ رانی نہ تھی بلکہ فاطمہ قادر تھی۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن وارڈ بوائے کے روپ میں ماہ نور کے کمرے میں موجود تھا۔ ملک رحمٰن اس کے پاس موجود تھے۔ فیض الحسن یونہی دوائیوں کو الٹا سیدھا کر کے رکھ رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے اب ماہ نور کو بالکل فٹ قرار دیا تھا۔ اس کے سر کی پٹیاں بھی کھل گئی تھیں اور وہ اب باتیں بھی کرتی تھی مگر رحمٰن بھائی سے ناراض تھی اور رحمٰن بھائی کی سوئی ابھی تک جنید اور ماہ نور کے نکاح پر اٹکی ہوئی تھی، اب بھی یہ بحث زیرِ موضوع تھی۔

''اگلے ماہ تایا جی آ رہے ہیں۔'' ماہ نور کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہ تھا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اسے فیض الحسن کا انتظار تھا مگر وہ اس بات سے انجان تھی کہ وہ اس کے پاس اسی کمرے میں موجود ہے۔

''دیکھو مانو! لاڈ پیار اور شرافت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم خاندان کی عزت سے کھیل جاؤ، خاندانی رسم و رواج، خاندانی وقار کی خاطر تلخ اور حقیقی فیصلے ہی زندگی کی خوشیاں بخشتے ہیں۔''

''میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' مانو نے لب کشائی کی تو فیض الحسن کا سیروں خون بڑھ گیا۔

''جنید کے ساتھ یا پھر ساری زندگی۔''

''جنید کے ساتھ۔''

''فیض الحسن کے ساتھ بھی نہیں ہو سکتی۔''

''پھر ساری زندگی نہیں کروں گی۔'' وہ بھی اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔

''تم جانتی ہو کہ تمہاری یہ ضد بے کار جائے گی ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔'' رحمٰن بھائی بھی خاندانی وقار کو مانو کی محبت کی بھینٹ نہ چڑھنے دینا چاہتا تھا۔

''میں نے آج تک آپ کی ہر بات سر جھکا کر مانی ہے۔''

''تو پھر اس بار کیوں نہیں؟''

''کیونکہ...... یہ میری زندگی کا مسئلہ ہے۔''

''میں تمہاری جان کا دشمن نہیں ہوں، تمہارا بڑا بھائی ہوں، تمہاری بہتری کے لیے ہی

فیصلہ کیا ہے۔“

”خاندانی وقار اور عزت و آبرو کا بھرم رکھنے کے لیے میری جان بھی حاضر ہے، مگر......“ وہ خاموش ہوگئی۔

”مگر کیا؟“ وہ اپنے بے قرار لہجے پر قابو نہ رکھ سکے تھے۔

”مگر...... میں اپنی محبت خاندانی وقار پر قربان نہیں کر سکتی۔“ مانو نے وہ کہہ دیا تھا جو سننے کے لیے فیض الحسن کھڑا تھا۔ وہ دوائیاں ٹھیک کرنے کے بعد باہر نکل گیا تھا۔ ماہ نور نے اس کے دل میں مزید جگہ بنالی تھی۔ وہ آج اسے سب سے عظیم لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کمرے میں یہ بات سن کر بھونچال آگیا ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

”اب ہمارا ہاتھ اٹھ گیا تو......“ وہ اپنے غصے کو بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے بولے تھے۔

”آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ اب ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

”تمہاری بہتری اور محفوظ مستقبل کے لیے۔“

”اللہ کی رحمت سے میرے پاس سب کچھ ہے اگر ایک محبت کرنے والا جیون ساتھی نہ ملا تو یہ سب بے کار ہے۔“

”شرم اور بے غیرتی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں تمہیں تین دن کا وقت دیتا ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ میری بندوق کرے گی اور نشانہ تم ہوگی“ یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

ماہ نور گہری سوچوں میں ڈوب گئی تھی، کب دروازہ کھلا اور کب وارڈ بوائے کمرے میں داخل ہوا اسے معلوم ہی نہ ہوا۔ وہ اس کے بیڈ کے پاس چلا گیا تھا۔ ماہ نور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ وہی لڑکا تھا جو کچھ دیر پہلے رحمٰن بھائی کی موجودگی میں اس کی دوائیاں سیٹ کر کے رکھ رہا تھا۔

”تم......؟ اب کیوں آئے ہو؟“ ماہ نور کو اس کا اس طرح دیکھنا اچھا نہ لگا تھا۔ اس لیے وہ غرا کر بولی۔

”دیکھنے آیا ہوں کہ گلاب کی خوشبو کم تو نہیں ہوگئی۔“ وہ یہ آواز سن کر چونک گئی۔

”کون......؟ کون ہو تم......؟ فیض......؟ تم فیض الحسن ہی ہو نا۔“ وہ خوشی سے چیخنے چلانے لگی تھی مگر فیض الحسن نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرا دیا۔

”ڈنگر......! سارے ہسپتال کو بتاؤ کہ میں کون ہوں؟“

”آئی ایم سوری سرکار!......“ ماہ نور کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بولی اور مسکرانے لگی۔

”اتنا شاندار میک اپ کون کرتا ہے؟“

”ہے ایک ڈنگر...... میرا بھتیجا صفدر حسین، کمال کا فنکار ہے۔“

”فیض الحسن! تم نے سنا؟ رحمٰن بھائی کیا کہہ رہے تھے؟“ اس نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، وہ بے پروائی سے بولا۔

”میں نے تو وہ سنا ہے جو تم نے کہا ہے۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں ماہ نور، تمہاری محبت کو سلام کرتا ہوں، یقیناً تم عظیم ہو۔ فیض الحسن کو اس سے بھی زیادہ چاہتی ہو......“ اس نے باقاعدہ سیلوٹ کر دیا تو ماہ نور ہنسنے لگی۔

”آج میں گھر جا رہی ہوں، تمہارا انتظار کروں گی، آؤ گے نا......؟“ اب وہ اس کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھی۔

”اگر رحمٰن بھائی نے گولی مار دی تو......؟“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”تو تم سے پہلے ماہ نور مرے گی۔“ وہ بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔

”میں تمہیں موت کی آغوش سے بھی چھین لوں گا مانو۔ تم دیکھنا کہ فیض الحسن وفا کس طرح نبھاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں اجازت کی فریاد تھی۔ ماہ نور نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ دوائیوں والی ٹرے اٹھا کر باہر نکل رہا تھا کہ ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ انہی کے ساتھ سٹاف نرس بھی تھی، فیض الحسن جلدی سے باہر نکل گیا تو ڈاکٹر نرس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”یہ وارڈ بوائے یہاں کیا کر رہا تھا؟“

”پتا نہیں سر! میں نے تو اس کو ہسپتال میں ہی پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“ نرس اور کیا جواب دیتی۔

ڈاکٹر کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اب وہ ماہ نور کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے چارٹ دیکھا اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”اب آپ بالکل ٹھیک ہیں، گھر جایئے اور مقوی غذا کھا کر رہ جانے والی تھوڑی سی کمزوری کو دور کر لیں۔“ وہ سٹاف نرس کی طرف مڑا اور اسے ڈسچارج سلپ بنانے کی ہدایت کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

ماہ نور کتنے دنوں بعد اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر لیٹی تھی۔ اسے وہ منظر یاد آ رہا تھا جب اس نے اپنے کمرے کی بالکنی سے نیچے چھلانگ لگائی تھی۔ اب بھی اگر کسی نے اس کی بات نہ

مانی تو وہ ایک بار پھر اپنی جان لینے کی کوشش کرے گی۔ دروازے پر دستک ہوئی اور اندر داخل ہونے والی شخصیت اس کی بھابی مسز رحمٰن تھیں۔ انہوں نے حنان کو گود میں اُٹھایا ہوا تھا۔ مسکراتی ہوئی ماہ نور کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں اور حنان کو ماہ نور کے سامنے بیڈ پر بٹھا دیا۔ وہ ننھا حنان بوا سے بہت مانوس تھا۔ وہ اس کے چہرے کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ ننھے بچے کی قلقاریاں اس کے کمرے میں گونجنے لگیں تو بھابی نے بات شروع کی۔

"مانو! میں تم سے ایک خاص بات کرنے آئی ہوں۔" بھابیاں اسے کم ہی بلاتی تھیں۔ وہ بھی ریزرو ہی رہتی تھی اور بھابیاں بھی۔ بہت کم ہی چانس ہوتا تھا کہ کوئی بھابی اس کے کمرے میں کبھی آئی ہو۔ اب بھی مسز رحمٰن جن کا نام سلمیٰ بھابی تھا۔ اس سے کوئی خاص بات کرنے کے لیے ہی اس کے کمرے میں موجود تھیں۔

"کہیے بھابی!...... میں آپ کی بات توجہ سے سن رہی ہوں۔" وہ حنان کے ساتھ لاڈ پیار میں مصروف تھی مگر اس کے کان بھابی کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

"اپنے بھائی کی بات مان لو مانو، وہ تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہے ہیں اور فیض الحسن کسی طور پر بھی تمہارے قابل نہیں ہے۔" مانو کو اس موضوع سے چڑ ہو گئی تھی۔ رحمٰن بھائی خود بات نہ کرنا چاہتے تھے، انہوں نے سلمیٰ بھابی کو بھیج دیا تھا۔

"کیوں میرے قابل نہیں ہے؟ لولا، لنگڑا یا پھر اندھا ہے؟ کیا اس کے ہاتھ پیر سلامت نہیں ہیں، کیا وہ خوبصورت اور جوان نہیں ہے، کیا وہ مجھے کما کر نہیں کھلا سکتا؟" وہ اس انداز سے پہلی بار بھابی سے مخاطب ہوئی تھی۔

"وہ ایک ملازم ہے، ہمارا ڈرائیو تھا۔"

"ڈرائیور تھا...... اب نہیں ہے۔"

"اس کے پاس کوئی سٹیٹس نہیں ہے، وہ تمہیں کیسے سنبھالا دے سکتا ہے؟"

"یہ ساری دولت میرے نام ہے اور میرا سبھی کچھ فیض الحسن کا ہے۔ کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے؟ اگر میں اپنی تمام دولت اور جائیداد اپنے شوہر کے نام کر دوں تو تم لوگ کیا کرو گے؟" بھابی خاموش ہو گئی تھیں۔ ان کے پاس مانو کی کسی بھی بات کا جواب نہ تھا۔ وہ انھیں اور حنان کو لے کر باہر نکل گئیں۔

"آپ کی ضد میری ضد کو مضبوط کر رہی ہے رحمٰن بھائی۔" ماہ نور بڑبڑا کر رہ گئی۔

☆=====☆=====☆

وہ آج پھر جان کی بازی لگا کر ماہ نور کے کمرے تک پہنچا تھا۔ ماہ نور اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ فیض الحسن کو دیکھ کر کھل اٹھی اور بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ دونوں کئی ساعتوں تک محبت اور چاہت کی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دیوانے دل مل رہے تھے۔ درختوں اور پرندوں نے چپ سادھی ہوئی تھی۔ رات بھی ان کی محبت کی امین بن کر دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح شمع پروانے کے انتظار میں پگھل پگھل کر اپنا ننھا سا وجود ختم کر لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح رات بھی دن کے اجالے کی منتظر تھی مگر پیار کرنے والے اس رات اور ان ساعتوں کو روکنے کی ناکام کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

"میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتی فیض الحسن، جو کچھ بھی کرنا ہے خدارا جلدی کرو۔ اگر رحمٰن بھائی نے اپنی ضد منوالی تو میں اس بار زہر کھا لوں گی۔"

"ہر وقت مرنے کی باتیں میرا دل تڑپا دیتی ہیں۔ اب مزید دیر نہیں ہو گی، تم دیکھنا اسی ہفتہ میں ہم کیا کرتے ہیں؟"

"ہم......؟" اس کی آواز میں حیرت اور سوال بھی تھا۔

"ہاں! ہم...... میں اور میرا ایک ہمراز۔"

"کون ہے وہ؟" اس نے شوقِ تجسس سے پوچھا تو فیض الحسن مسکرا پڑا۔

"پھر بتاؤں گا بھی اور اس سے ملواؤں گا بھی۔ میرا وعدہ ہے تمہیں مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر فیض الحسن واپس جانے کے لیے کھڑکی کی جانب بڑھا تو ماہ نور نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

"فیض الحسن! آج میرا دل بہت ڈر رہا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ "پتا نہیں اک انجانا سا خوف میری روح میں سرایت کر گیا ہے۔"

"اپنی محبت پر کتنا اعتماد ہے مانو؟"

"خدا کی طرح۔"

"تو پھر سبھی معاملات اسی پر چھوڑ دو وہ بہتر کرے گا۔ اب کوئی بھی راستہ کٹھن نہیں اور نہ ہی ہماری منزل ہم سے دور ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر کود گیا۔ مانو اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ابھی فیض الحسن سیڑھی سے نیچے اُتر کر دیوار پھلانگنے کے لیے مانو کے سامنے نہ آیا تھا کہ گولی چلنے کی آواز نے مانو کا دل دہلا کر رکھ دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک سایہ پھرتی سے بھاگ کر دیوار پر چڑھتا ہوا دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے

ایک اور گولی چلی۔ چند سیکنڈ پہلے جہاں دیوار پر سایہ تھا، گولی اس جگہ پر اپنا نشان چھوڑ گئی۔ مانو فیض الحسن کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگی۔ یہ گولیاں یقینی طور پر رحمٰن بھائی کی رائفل سے ہی نکلی تھیں۔

انہوں نے فیض الحسن کو دیکھ لیا تھا، جب وہ گن لے کر لان میں پہنچے تو فیض الحسن سیڑھی اتر رہا تھا۔ پتا نہیں گولی اسے لگی تھی یا نہیں مگر رات کی گہری تاریکی میں فیض الحسن خوش قسمت ثابت ہوا تھا۔ اہلِ علاقہ کی نیند خراب ہوگئی تھی۔ قصرِ ماہ نور کے مکین بھی جاگ گئے تھے۔ عنایت بھائی ننگے پاؤں لان تک پہنچے تھے۔ انہوں نے رحمٰن بھائی کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ہی معاملہ سمجھ لیا تھا مگر انجان بن کر پوچھنے لگے۔

''کیا بات ہے؟ کوئی چور وغیرہ تھا؟'' ان کے لہجے سے تشویش ٹپک رہی تھی۔

''ہاں! عزت کا لٹیرا تھا۔'' وہ دور سے بولے تھے۔ وہ یک دم اندر کی طرف مڑے اور غصے میں مانو کو پکارنے لگے، پورا گھرانہ تو پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا۔ ان کی گھن گرج سن کر مانو بالکنی سے جھانکتی ہوئی بولی۔

''جی......؟''

''کون تھا وہ؟'' اُن کی آنکھیں شعلہ بن رہی تھیں۔ ماں جی حیرت سے بیٹی اور کبھی بیٹے کے چہروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''فیض الحسن!'' ماہ نور کا جواب بم تھا، جو ان سب پر گرا تھا۔ اس کے اعصاب بھی تنے ہوئے تھے، وہ ہر قسم کے خطرے سے نپٹنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''ہم نے کہا تھا مانو!'' وہ رائفل مانو کی طرف تان کر کھڑے ہوگئے۔ ''اگر تم نے میری بات نہ مانی تو ہماری بندوق کی گولی بلادریغ تمہیں نشانہ بنائے گی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ٹریگر پر انگلی کا زور بڑھا دیا، عنایت علی جو کہ پاس ہی کھڑے تھے انہوں نے رائفل چھیننے کی کوشش کی مگر رحمٰن بھائی کی گرفت مضبوط تھی۔ نتیجتاً گولی رائفل سے نکل کر مانو کے بالکل قریب لگے ہوئے وال فلاورز پر لگی۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں مگر مانو اپنی جگہ پر ہنوز ساکت کھڑی تھی۔ اسی کشمکش میں عنایت علی نے رحمٰن بھائی سے رائفل چھین لی۔

''کیا کر رہے ہیں آپ؟'' اب وہ بڑے بھائی کے سامنے کھڑے تھے۔ جو شعلے برساتی نگاہوں سے اوپر کھڑی مانو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عنایت پھر بولا۔

''کیا آپ یہ سننا چاہتے ہیں کہ لوگ اور برادری یہ کہے کہ بھائیوں نے جائیداد کی

خاطر بہن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اپنے غصے پر قابو رکھیے رحمٰن بھائی، وہ بچی ہے، نادان ہے۔'' اب وہ مانو کی طرف مڑے اور چند سیڑھیاں چڑھ کر رک گئے۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ مانو۔'' عنایت علی کے کہنے پر مانو اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ سارا ماحول ہی پراگندہ ہوگیا تھا۔ ماں جی آگے بڑھیں اور رحمٰن کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں صوفے پر بٹھایا۔

''تمہاری ان حرکتوں سے وہ اور بھی ضدی ہو جائے گی۔'' رحمٰن بھائی ماں جی کی بات سن کر ان کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگے، پھر ان کا پارہ انتہائی ہائی ہوگیا۔

''مجھ سے ضد کرے گی، کیا اس کی ضد مجھ سے بنتی ہے؟ میں اس کا بڑا ہوں، اس کے باپ کی جگہ ہوں، اتنی سی تھی جب بابا فوت ہوئے تھے، اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا، گھوڑا بن کر اسے اپنی پیٹھ پر جھولے دیئے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ میں بابا کی جگہ نہیں لے سکتا نہ ہی باپ بن سکتا ہوں مگر میں اپنے خاندانی وقار میں کبھی بھی ٹاٹ کا پیوند نہیں لگنے دوں گا۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔ اب اگلی گولی میری کنپٹی پر چلے گی۔'' وہ غصے میں بول رہے تھے تو ان کی رگیں تن کر سرخ ہوگئی تھیں۔ آنکھوں نے گویا خون برسانا شروع کر دیا تھا، وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔

''آپ؟ آپ اسے سمجھائیں ماں جی اور یہ بھی کہہ دیں آخری وارننگ ہے۔''

''میری طرف سے بھی۔'' سب کی نظریں اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں مانو کھڑی تھی، ماں جی اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

''کچھ تو شرم کرو مانو، تمہارا بڑا بھائی ہے، یہ دیکھو...... میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' ماں جی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''کیوں خاندان اور اپنے باپ کے نام کو بٹا لگا رہی ہو؟ میرے سفید بالوں کا ہی خیال کرو مانو۔ میں جیٹھ جی کو کیا منہ دکھاؤں گی؟'' ماں جی رونے لگی تھیں۔ دونوں بھابیاں بھی خاموش اور سوگوار تھیں۔ ان کی جرأت نہ تھی کہ وہ اس معاملہ میں اپنی رائے دینے کے لیے زبان کھولیں۔

''میں اپنی پسند ناپسند کا اختیار رکھتی ہوں، بالغ اور سمجھدار ہوں، میں آپ سے کوئی بھی مطالبہ نہیں کروں گی جو آپ کو پریشان کر دے۔ میں یہ ساری دولت اور جائیداد آپ کے نام پر چھوڑ کر جاؤں گی۔'' سب نے ایک بار پھر اس کی طرف چونک کر دیکھا۔

''میں آپ لوگوں سے کچھ نہیں لوں گی مگر یہ بھی چاہوں گی کہ تم لوگ میری زندگی میں

کبھی بھی زہر بھرنے کی کوشش نہ کرنا کیوں کہ یہ تمام چیزیں میرے سچے اور پُر خلوص پیار کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور میں فیض الحسن کے لیے ہر رکاوٹ دور کرنا چاہتی ہوں۔''

''یہ تمہاری بھول ہے مانو!'' عبدالرحمٰن کی گرج سنائی دی۔ ''تم ہمیں تو ان باتوں میں بہکا سکتی ہو مگر خالی ہاتھ جب اس دو ٹکے کے ملازم کے سامنے جاؤ گی...... وہ تمہیں کبھی بھی قبول نہیں کرے گا کیوں کہ وہ تمہاری سیرت اور صورت پر نہیں بلکہ دولت پر قربان ہوا ہے، یہ میرا دعویٰ ہے۔''

''آپ کی سوچ اور ذہنی پستی سے بہت اونچا اور بلند ہے وہ...... میں آپ کے دعویٰ کو چیلنج نہیں کرتی مگر اتنا ضرور کہوں گی رحمٰن بھائی کہ اس بار آپ نے غلط آدمی کو پرکھنے کی غلطی کی ہے۔ آپ کی آنکھیں اور تجربہ دھوکے میں ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''اس لڑکی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آپ دیکھنا ماں جی...... یہ لڑکی دربدر کی ٹھوکریں کھا کر واپس اسی چوکھٹ پر آئے گی مگر یہ سب کچھ میرے مرنے کے بعد ہوگا۔'' رحمٰن ملک یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

☆=====☆=====☆

قادر علی نے فاطمہ کا تعارف کروا دیا تھا۔ فیض الحسن اور صفدر حسین فاطمہ کی شخصیت اور کہانی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی فاطمہ کو اسلام قبول کرنے پر مبارک باد دی تھی۔ قادر علی بار بار مضطربانہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی کا انتظار ہو۔ پھر اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ دروازے پر دستک سن کر وہ اٹھا اور صفدر حسین سے پہلے ہی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے گیٹ کھولا تو ایک لڑکا جس کے سر پر مسجد کی ٹوپی اور ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کر کے قادر علی کو پکڑا دیا اور ''پیر صاحب ابھی آتے ہیں'' کہہ کر واپس چلا گیا۔ فیض الحسن اور دوسرے افراد قادر علی کی حرکات و سکنات دیکھ کر حیران ہو رہے تھے، اس کا انداز پُر اسرار تھا، فیض الحسن تو خاموش نہ رہ سکا۔

''قادر علی! یہ سب کچھ کیا کر رہے ہو؟''

''احکم الحاکمین کے حکم کی تکمیل کرنے والا ہوں کیوں کہ اس میں اس کی رضا اور مرضی شامل ہے، بس خاموش رہو۔'' قادر علی نے اسے خاموش کروا دیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو اس بار صفدر حسین نے قادر علی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا دروازہ کھولنے کے لیے چل پڑا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کے پیچھے پیچھے ایک

بزرگ جن کے چہرے پر سفید داڑھی ان کی شخصیت کو بارعب بنا رہی تھی اندر داخل ہوئے۔ قادر علی انہیں لے کر صحن میں آیا تو فاطمہ بھی ان کے احترام میں کھڑی ہو گئی بلکہ اس نے آگے بڑھ کر بزرگ کو سلام کیا تو انہوں نے اس کے سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ فیض الحسن اور صفدر حسین کو بھی فاطمہ کی تقلید کرنا پڑی۔ بزرگ نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور باری باری ان سے ہاتھ ملایا۔ فیض الحسن کو عجیب سا روحانی سکون محسوس ہوا تھا۔ وہ ان کے پُرنور چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بزرگ اس سے براہ راست مخاطب ہوئے تو وہ چونک گیا۔

''جب قرآنِ کریم پڑھا جائے تو اسے خاموش ہو کر سنو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' بزرگ نے قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ پڑھا تو سبھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''فیض الحسن! جب تم محبت اور خلوص سے اللہ رب العزت کی مقدس کتاب کو اپنے سینے سے لگا کر اپنی زبان سے اس کے کلام کو ادا کرتے ہو تو یقین کرو، فرشتے تمہارے منہ کو چومتے ہیں، پرندے خاموش ہو کر تمہاری خوش الحانی کی وجہ سے رب تعالیٰ کے کلام کو سنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اس کو تمہاری یہی ادا بھا گئی ہے مگر ایک انسان ایسا بھی ہے جس نے تمہارے منہ سے نکلنے والے قرآنی الفاظ سن کر تمہاری محبت اور عشق کی پوجا کرنی شروع کر دی ہے۔ تمہاری خوش الحانی اسے بہت آگے تک لے گئی ہے۔ اب واپسی کا راستہ اس کی یا پھر تمہاری موت پر ختم ہوتا ہے مگر رب تعالیٰ کا فرمان ہے کہ قرآنِ کریم کو خاموشی سے سننے والے پر میں رحم کرتا ہوں اور اس کے رحم کرنے کے انداز اسی طرح ہیں کہ وہ جس پر قرآن کریم کی محبت کی وجہ سے رحم کرتا ہے اس کو انعام سے نوازتا ہے اور اس کے اعزازات و اکرام ہم جیسے جاہل لوگوں کے لیے حیران کن ہی ہوتے ہیں۔'' وہ فیض الحسن کی طرف دیکھ رہے تھے مگر اس کا چہرہ ان کے قدموں پر تھا۔ اس کی نگاہیں بزرگ کی جوتی سے اوپر نہ اٹھ رہی تھیں۔ آنکھیں اشکبار تھیں، دل دھڑک دھڑک کر زندگی کا ثبوت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو انعام مقرر کیا ہے، وہ تمہارے لیے حیران کن ضرور ہو گا اور اس انسان کے لیے بھی جس کو اللہ تعالیٰ نے رحم کر کے انعام کے لیے چنا ہے، بس کچھ دیر باقی ہے۔'' وہ بزرگ خاموش ہوئے تو سبھی حیرانگی سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے، وہ پھر گویا ہوئے۔ ''میں کوئی پُر اسرار بندہ نہیں ہوں بلکہ آپ ہی کی طرح عام انسان ہوں۔ بس قادر علی مجھے اپنا مرشد سمجھتا ہے۔'' انہوں نے اپنا تعارف کروا کے فیض الحسن اور صفدر حسین کے ذہن میں کلبلانے والے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

ایک جان لیوا خاموشی گھر پر طاری تھی۔ فیض الحسن کے لیے انعام والی بات پُراسراریت اختیار کر چکی تھی۔ وہ مضطرب اور بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا مگر قادر علی، بزرگ اور فاطمہ بالکل پُرسکون تھے۔ بالکل اسی طرح فیض الحسن بھی آنے والے انجانے طوفان کی تباہ کاریوں سے خوف زدہ تھا۔ اچانک گیٹ پر دستک ہوئی تو فیض الحسن چونک پڑا۔

قادر علی نے دروازہ کھولا تو اندر داخل ہونے والے مرد و عورت کو دیکھ کر فیض الحسن حیرت کے جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی تیز ہوتی ہوئی دھڑکن کی صدا سب کو سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ وہ ماہ نور اور عنایت بھائی کو خواب ناک حالت میں دیکھ رہا تھا۔

''فیض الحسن! یہ تمہارا انعام ہے۔'' مرشد کی آواز پر وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ماہ نور کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور عنایت علی سے ہاتھ ملایا۔ ''عنایت علی! یہ کام جو تم کرنے جا رہے ہو، دنیاوی اعتبار سے تمہارے خاندان کی عزت و وقار کے منافی ضرور ہے مگر دینی لحاظ سے تم نے ان دو افراد کی مدد کی ہے۔ جن پر خداوند کریم نے اپنا خاص کرم فرمایا ہے اور اس کارِ خیر میں سے تمہیں بھی اعزاز ملے گا۔'' ماہ نور فیض الحسن کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنا وجود ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ مرشد نے ان دونوں کا نکاح کروا دیا۔ قادر علی اور عنایت علی گواہ تھے۔ فاطمہ اور صفدر حسین بھی ایک طرف سے گواہ بن گئے۔ اس طرح ماہ نور اب زوجۂ فیض الحسن بن گئی تھی۔ فیض الحسن ناقابلِ یقین کیفیت سے گزر رہا تھا۔ یہی حال ماہ نور کا بھی تھا۔ عنایت علی اسے بازار کا بہانہ بنا کر ساتھ لائے تھے۔ جب وہ اس گھر میں داخل ہوئی تو فیض الحسن کو دیکھ کر اس کی حالت بھی ویسی ہی تھی جیسی فیض الحسن کی ہوئی تھی۔ اس نے تشکر کی نظر سے فیض الحسن کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی نظروں نے عنایت علی کا شکر ادا کیا۔ عنایت علی کی آنکھوں میں موتی تھے جو چھلک کر گالوں پر آ گئے تھے، انہوں نے ماہ نور کو پیار دیا۔

''مانو! ہر بھائی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بہن کی شادی دھوم دھام اور عزت و آبرو سے ہو۔'' وہ خاصے جذباتی ہو رہے تھے۔ ''میں تمہیں دعائیں تو دے ہی رہا ہوں اور تاحیات دیتا رہوں گا مگر میں نے تمہیں سلامی دینے کے لیے بھی چھوٹا سا تحفہ لے کر رکھا ہے، سدا خوش رہو مانو۔'' آنسو ان کے گالوں پر لکیریں بنانے لگے تھے۔ ''میں خاندان والوں سے بغاوت کر کے ان سے چوری چھپے تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ میں نے اور فیض الحسن نے تمام

پروگرام طے کر لیا تھا۔''

''آپ نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے جو میں ساری زندگی نہیں اتار سکتا۔'' فیض الحسن بولا۔ ''آپ نے تو مخمل میں مجھ جیسے گندے مندے ٹاٹ کا پیوند لگایا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں، اپنی کھال بیچ کر بھی مانو کو خوش رکھوں گا۔'' عنایت علی نے بھینچ کر فیض الحسن کو گلے سے لگا لیا تھا۔

وہ فیض الحسن کا ہاتھ پکڑ کر ماہ نور کے پاس لائے تو فاطمہ ان سے الگ ہو کر قادر علی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے ماہ نور کے سر پر ایک بار پھر پیار سے ہاتھ رکھا۔ مرشد نے گلا کھنکار کر صاف کیا تو سبھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''قادر علی!'' انہوں نے پکارا تو قادر علی مؤدب انداز سے آگے بڑھا۔ ''مہمانوں کے لیے مٹھائی وغیرہ کا بندوبست کرو اور مجھے اجازت دو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ کوئی بھی ان سے رک جانے کے لیے نہ کہہ سکا کیوں کہ ان کی ڈیوٹی بدل گئی تھی وہ اپنا فریضہ انجام دے کر جا چکے تھے۔

اتنی دیر میں صفدر حسین چائے بنا لایا تو ماہ نور نے پہلی بار اسے دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چاچی کو سلام کیا تو ماہ نور نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ صفدر حسین نے بھی ہاتھ بڑھایا تو سبھی مسکرانے لگے۔

''ایک بات پوچھوں چاچی!'' صفدر حسین نے کہا تو فیض الحسن کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی نہ کوئی اوٹ پٹانگ بات ہی کرے گا۔

''اجازت کیوں لے رہے ہو، جو کہنا ہے کہہ ڈالو، تمہارا اپنا ہی گھر ہے، ڈنگرا۔'' ماہ نور کی زبان سے فیض الحسن کا تکیہ کلام سن کر صفدر حسین اپنی بات بھول گیا تھا۔ فیض الحسن نے شکر ادا کیا تھا۔

اب سبھی افراد مستقبل کے بارے میں لائحہ عمل بنانے لگے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ ماہ نور ابھی واپس چلی جائے گی۔ وہ فیض الحسن سے ملنے آتی جاتی رہے گی۔ اس تمام کام میں عنایت بھائی ان کا ساتھ دیں گے۔ گھر میں ابھی کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ ماہ نور کا نکاح ہو گیا ہے۔ ان دونوں کا تو دل پھولے نہ سما رہا تھا مگر نکاح کے بعد فوراً جدائی...... ان کی جان پر بن گئی تھی۔

''بے شک یہ دنیا کا عجیب نکاح ہے۔ دلہن، دلہا کو چھوڑ کر اپنے میکے واپس جا رہی ہے۔'' صفدر حسین نے فقرہ چُست کیا تو ماہ نور نے اس کے سر پر ایک چپت لگائی۔

''شرارتی!......تمہیں ٹھیک کرنا پڑے گا۔''

''عنایت بھائی نے فیض الحسن اور قادر علی سے اجازت چاہی تو فیض الحسن نے فاطمہ اور قادر علی کا بھی بتا دیا۔ ماہ نور فاطمہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگی، واقعی وہ عظیم تھی، اس نے حُبِ الٰہی میں اپنے خاندان اور مذہب کو چھوڑ دیا تھا۔

وہ اجازت لے کر چلے گئے مگر فیض الحسن کی جان پر بن گئی۔ قادر علی مسکراتے ہوئے اسے سمجھا رہا تھا۔ ''تمہاری اور ماہ نور کی زندگیوں کے لیے فی الحال یہی بہتر ہے۔''

☆=====☆=====☆

ماہ نور پوری طرح مطمئن تھی۔ اس کا نکاح اس کی مرضی کے مطابق فیض الحسن سے ہو گیا تھا۔ کاغذات وغیرہ بھی تیار ہو چکے تھے۔ عنایت بھائی نے فیض الحسن سے دستخط اور انگوٹھے بھی لگوا لیے تھے۔ اب اس کے سامنے نکاح نامہ پڑا تھا جس کے مطابق وہ فیض الحسن کی منکوحہ تھی۔ اب وہ رحمٰن بھائی کو بتائے گی کہ جیت کس کی ہوئی ہے۔ وہ مستقبل کے ان تمام منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کو تیار تھی جو فیض الحسن کے گھر پر بیٹھ کر بنائے گئے تھے۔

دروازہ اچانک کھلا اور ماں جی اندر داخل ہوئیں تو اس نے جلدی سے کاغذات اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ ماں جی گو کہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر نکاح نامے کے کاغذات پہچان سکتی تھیں۔

''مانو! مانو بیٹی۔'' وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھیں۔ انہیں تو کاغذ کی جانچ پڑتال کا ہوش کہاں تھا۔ ''بیٹی! تمہارے سُسر کا انتقال ہو گیا ہے، جنید کے ابا تمہارے سگے تایا کا انتقال ہو گیا ہے۔'' وہ اونچی اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ مانو بھی پریشان ہو گئی۔ تایا ابو اچھے انسان تھے، مانو سے خصوصی لگاؤ تھا۔ انہی کی خواہش تھی مانو کو اپنی بہو بنانے کی۔ مانو کو دلی طور پر افسوس ہوا مگر وہ ماں جی سے اس کا اظہار نہ کر سکی یا پھر کرنا نہ چاہتی تھی۔

''جلدی جلد تیاری کر لو، ہم سب جا رہے ہیں۔''

''ہم سب میں...... ''میں'' شامل نہیں ہوں، ماں جی!'' ماہ نور نے بے رخی سے جواب دیا تو ماں جی کا منہ کھلا رہ گیا۔

''تم اب مرگ بھی چھوڑ دو گی مانو؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ڈاکٹرز نے مجھے سفر سے منع کیا ہے اور میں ابھی جینا چاہتی ہوں ماں جی۔''

''یہ اب جینے کی امنگ تم میں کیسے جاگ گئی؟'' وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھیں۔ حیرت و استعجاب کی آمیزش ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ ''کل تک تو تم مرنے کی باتیں کرتی تھیں۔''

''جس کے لیے مرنے لگی تھی، اب اسی کے لیے جی کر دکھاؤں گی۔'' وہ اپنے اٹل فیصلے پر قائم تھی۔ ''میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی۔ آپ بھی اپنا وقت ضائع مت کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگ دیر سے پہنچیں اور وہ جنازہ لے کر چلے جائیں۔'' ماں جی نے اس کی بات سنی تو انہیں ہوش آ گیا وہ مانو کو کوستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ رحمٰن بھائی کی ماں جی سے بڑی لے دے ہوئی تھی۔ وہ مانو کو کسی طور بھی اکیلا چھوڑنے پر راضی نہ تھے مگر ماں جی نے واویلا مچایا ہوا تھا۔ رحمٰن بھائی کی گاڑی میں ماں جی اور سلمٰی بھابی تھیں جب کہ عنایت علی اور ممتاز بھابی اکیلے تھے۔ شہر میں ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے عنایت علی کی گاڑی پیچھے رہ گئی تو انہیں ایک کام یاد آ گیا وہ گاڑی فیض الحسن کے گھر کی طرف موڑ چکے تو ممتاز بھابی چونک گئیں۔

''یہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟'' ان کی آواز میں فکر تھا مگر عنایت علی بھی کایاں آدمی تھے، فوراً بولے۔

''یہاں ایک دوست رہتے ہیں۔ ان سے تایا جی کی وفات کا کہہ دوں اور پھر کوٹھی میں مانو بھی اکیلی ہے۔ ان کی والدہ اور بہنوں کو مانو کے پاس بھیج دیتے ہیں، میں ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر عنایت علی گلی میں گھس گئے جب کہ ممتاز بھابی ناک بھوں چڑھا کر رہ گئیں۔

''سارے گھر میں مانو نے ہی نحوست پھیلا رکھی ہے پتا نہیں کب اس بلا سے جان چھوٹے گی۔'' یہ بات وہ اپنے شوہر کے سامنے کہنے کی ہمت نہ رکھتی تھیں۔ بس اپنا غبار انہی الفاظ کے ذریعے نکال کر جل بھن کر بیٹھ رہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی عنایت علی آ گئے اور گاڑی دوبارہ اپنی منزل کی جانب چل پڑی۔

☆=====☆=====☆

''قصرِ ماہ نور'' کی پُرشکوہ عمارت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زمین پر ایستادہ تھی۔ اس عظیم محل کے تمام کمرے بند پڑے ہوئے تھے۔ صرف ایک کمرے کی روشنی بتا رہی تھی کہ اس محل میں زندگی موجود ہے۔ ماہ نور اس وقت اکیلی تھی۔ اس نے راجو اور ملکہ کو چھٹی دے دی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑ کر اپنے محبوب فیض الحسن کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ فیض الحسن سے مل سکتی تھی مگر کوئی تجویز یا پھر کوئی ایسا طریقہ سمجھ

میں نہ آرہا تھا کہ وہ گھر کو چھوڑ کر چلی جائے۔

"کاش کوئی میرے فیض الحسن کو خبر کر دے کہ اس کی مانو اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔" اس نے سوچا تھا کہ گیٹ پر بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی رات کے نو ہی بجے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نیچے لان میں آ گئی۔ بیل مسلسل بج رہی تھی۔

بیل بجانے والے کا انداز ایسا تھا کہ اگر جلدی سے گیٹ نہ کھولا تو وہ بیل ہی جلا دے گا۔ ماہ نور گیٹ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اندھیرے میں ڈر بھی لگ رہا تھا اور پھر وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے گیٹ میں لگی ہوئی چھوٹی کھڑکی میں دُوربین سے دیکھا تو اس کا رُواں رُواں ناچنے لگا، اس کی مراد بر آئی تھی۔ اس کے دل کی آواز فیض الحسن نے سن لی تھی اور وہ فوراً سے پیشتر چلا آیا تھا، ماہ نور نے گیٹ کھول دیا۔ فیض الحسن گرے رنگ کے سوٹ میں بالکل دلہا لگ رہا تھا۔ چند ساعتیں یونہی گزر گئیں۔ وہ اب میاں بیوی تھے۔ کاغذی اور شرعی طور پر بھی مگر چاہت اور محبت ان کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

پیا...... پہلی بار گھر آیا تھا۔ اس گھر کا داماد آیا تھا، کسی نے بھی پھول پتیوں سے استقبال نہ کیا تھا، کسی نے بھی چوکھٹ میں تیل نہ گرایا تھا، نہ ہی دودھ پلائی کی رسم ہوئی تھی اور نہ ہی دلہن دلہا کے پہلو میں گھونگھٹ نکال کر بیٹھی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے دیدار کی فیض یابی حاصل کر رہے تھے۔

فیض الحسن کے اس طرح دیکھنے پر ماہ نور پہلی مرتبہ شرما گئی تو وہ اس ادا پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر گیٹ کو تالا لگایا اور ماہ نور کے چاندی جیسے گالوں پر اپنی محبت کی مہر ثبت کی تو وہ لجا کر دوہری ہو گئی۔

"اس گستاخی کی سزا ملے گی۔" ماہ نور کا انداز خود سپردگی کا تھا۔

"سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں آئے۔" فیض الحسن کا انداز بادشاہوں جیسا تھا۔

"اگر سزا ہی ملنی ہے تو پھر کیوں نہ مزید گستاخیاں کر لی جائیں؟" اس نے شرما کر بھاگتی ہوئی ماہ نور کو بھاگ کر پکڑ لیا اور اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر محل کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ پہلی بار اس راستے سے اس محل میں داخل ہوا تھا۔ وہ حیرانگی سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

وہ بڑے سے ڈرائنگ روم نما ہال میں پہنچ گئے تھے، بلند چھت پر قیمتی فانوس لٹک رہا تھا۔ فیض الحسن نے ماہ نور کو صوفے پر پیار سے اتار دیا، وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ فیض الحسن

صوفے پر بیٹھا تو وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس کا سر فیض الحسن کے گھٹنوں پر تھا اور چہرہ دیدار یار کر رہا تھا۔

"اس گھڑی اور پیار بھرے لمحات کا بہت جان لیوا انتظار کیا ہے مانو۔" فیض الحسن نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا، وہ بھی مخمور حالت میں بولی۔

"محبت سچی ہو تو یہ لمحات کبھی نہ کبھی زندگی میں خوشیاں بھرنے کے لیے ضرور آتے ہیں۔"

"اور مجھے تم پر فخر ہے فیض الحسن کہ تم نے محبت کی پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے میرا ساتھ دیا ہے۔ اب زندگی بھر مجھے ان قدموں سے دور نہ کرنا۔"

"تمہاری جگہ تو دل کی بلند ترین جگہ پر ہے۔" اس نے ماہ نور کو قدموں سے اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ "مرد اور عورت ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اور یہ لباس کبھی بھی علیحدہ نہیں ہو گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" فیض الحسن کی شرارت بڑھنے لگی تو وہ تڑپ کر علیحدہ ہو گئی اور بھاگ کر اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

فیض الحسن بھی اس کے پیچھے گیا تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر مانو نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ اسے کمرے میں دیکھنے لگا تو باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سن کر وہ سانس بھر کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ بیڈ پر بیٹھا آنے والے حسین لمحات میں گم تھا کہ آدھا گھنٹہ گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ وہ تب چونکا تھا جب ماہ نور اس کے سامنے نئے اور قیمتی لباس میں کھڑی تھی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے کوئی میک اپ نہ کیا تھا۔ اس کی سادگی اس کے حسن کی محتاج تھی اور اس کا حسن اس کی سادگی پر قربان ہو گیا تھا۔

وہ بغیر میک اپ کے اور بغیر زیورات کے پہلی دلہن تھی جو امیر ترین تھی مگر اس کی کلائیوں میں کوئی چوڑی نہ تھی۔ اس کی مانگ میں کوئی جھومر نہ تھا نہ ہی کوئی قیمتی گلوبند تھا۔ وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ فیض الحسن کے سامنے کھڑی تھی۔ فیض الحسن کو سانس لینے کا بھی ہوش نہ تھا۔

"مانو!" اس نے اپنی انگلی سے چاند کے ٹکڑے کو تھوڑا سا اوپر کیا تو چونک گیا۔ مانو کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ حیران ہو گیا اتنی بہادر لڑکی جس نے تمام خاندان سے بغاوت کر کے ان کی روایات کو توڑ کر رسم و رواج سے ٹکر لی تھی اس موقع پر اداس اور غمگین کھڑی تھی۔

''کیا ہوا جانِ من؟''

''فیض! میں کیسی دلہن ہوں جس کی رخصتی پر نہ کوئی ڈھولک، نہ کسی بھائی کا پیار، نہ ماں کی دعائیں، نہ بہنوں، سکھیوں کے ہنسی مذاق......'' وہ باقاعدہ رونے لگی تو فیض الحسن نے اسے آغوش میں بھر لیا۔

''محبت نے تمہارے سر پر اپنی عظمت کا تاج پہنایا ہے۔ تمہیں تو فخر ہونا چاہیے کہ تم نے ان سب رشتوں کی مخالفت کے باوجود محبت کی کٹھن منزل کو فتح کیا ہے۔ دیکھو...... تمہارا تاج تمہارے سامنے ہے۔ یہ رات آنسو بہانے کی نہیں ہے بلکہ پیار و محبت سے ایک دوسرے کو اپنانے کی رات ہے۔''

''مگر میری ایک شرط ہے۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی تو فیض الحسن حیران بھی ہوا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''فرمایئے سرکار!''

''میرا حق مہر......؟''

''میری جان ہی تمہارا حق مہر ہے مانو کہو تو ابھی تمہارے قدموں پر نچھاور کر دوں۔''

''آج کے بعد آپ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے مجھے دکھ پہنچے۔'' اس نے پہلی بار اسے آپ کہا تو فیض الحسن خوشی سے سرشار ہو گیا۔

''تو پھر کیا طے ہوا......؟'' وہ مدہوشی سے بولا تو ماہ نور بھی خودسپردگی کے عالم میں بولی۔

''میں اپنا حق مہر صبح وصول کروں گی......''

''اوکے جانِ من......'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ فیض الحسن نے انگلش کا لفظ بولا تھا۔

''یہ کس سے سیکھا ہے؟''

''ڈنگر...... صفدر حسین سے۔'' اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی بتی بجھا دی۔ ''میں اس حسین رات کو اس ڈنگر کے نام سے خراب نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا...... اب کوئی بات نہ ہوگی صبح تک......'' محبت سچی ہو تو رضائے الٰہی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ تب محبت عبادت بن جاتی ہے۔ بس جذبۂ صادق موجود ہونا چاہیے۔ محبت کو ہوس کی نظروں سے پاک رکھ کر پوجتے رہو تو وہ ایک نہ ایک دن خدا بن کر سامنے آ جاتی ہے، یہی محبت کی سچائی ہے۔

وہ صبح ہر روز ہونے والی صبح سے نہایت دل کش اور خوشگوار تھی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

فیض الحسن بھی جاگ رہا تھا، زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد زندگی اور بھی خوبصورت لگنے لگی تھی۔

''اَلصَّلوٰۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم۔ اَلصَّلوٰۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم''

فیض الحسن اپنے بستر سے اٹھا تو مانو اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پیار سے اس کا سر اپنے بازو سے ہٹایا تو وہ تھوڑا سا کسمسائی اور کروٹ لے کر سو گئی۔ فیض الحسن نے غسل کر کے وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے رب تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو گیا۔ سجدے میں پہنچا تو آنکھیں اظہارِ تشکر سے چھلکنے لگیں، سجدے سے اٹھنے کو دل نہ چاہ رہا تھا۔ اس نے رو رو کر رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ وہ اس دن کو سوچنے لگا جب وہ اس شہر میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اس وقت اس شہر میں اگر منظر علی نہ ہوتا تو وہ کہیں نہ کہیں بھٹک رہا ہوتا۔

آج منظر علی نہ تھا مگر اس کی جھولی محبت سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا خاندان، صفدر حسین، قادر علی، فاطمہ اور ماہ نور کی شکل میں موجود تھا۔ یہ سب اللہ کا کرم تھا اور وہ اللہ کی اس کرم نوازی پر آنسوؤں کے نذرانے پیش کر کے اس کا شکر گزار ہو رہا تھا۔

ماہ نور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کیا۔ فیض الحسن نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو کھل اٹھا۔ وہ بھی غسل کر کے سر پر دوپٹہ لپیٹے نماز کی تیاری کر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے انعام کا شکریہ ادا کرنے کا اس سے اچھا کوئی اور انداز نہ ہو سکتا تھا۔

نماز سے فراغت کے بعد ماہ نور فیض الحسن کے پاس چلی آئی۔

''میرا حق مہر......؟'' اس نے اپنے ہاتھ فیض الحسن کے آگے کر دیے۔ وہ پریشان ہو گیا تھا، اس کی جیب خالی تھی، چند روپے تو اس حسین و جمیل مہ جبیں کا حق مہر نہ ہو سکتے تھے۔

''میری جیب میں تو چند روپے ہیں وہ چاہو تو لے لو۔'' وہ لاچاری سے بولا تو ماہ نور مسکرانے لگی۔

''روپے اور سونے چاندی کے زیورات میرا مطالبہ نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا چاہتی ہو......؟''

''میں تمہاری زبان سے قرآن کریم کی تلاوت سننا چاہتی ہوں۔ بس یہی میرا حق مہر ہے۔'' وہ عشق الٰہی سے سرشار تھی، فیض الحسن نے یہ سنا تو مسکرا کر بولا۔

''ڈنگر...... تم نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا تھا۔ میں تمہارا حق مہر ادا کرنے کے لیے تیار

ہوں۔''

ماہ نور نے اسے قرآنِ کریم پکڑایا تو فیض الحسن نے اسے چوم کر آنکھوں اور سینے سے لگا لیا۔ اسی کتاب کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم کر کے انعام بخشا تھا۔ ماہ نور کی صورت میں خوبصورت اور حسین انعام۔

فیض الحسن نے قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کی تو کمرے میں عجیب سا سکوت چھا گیا۔ کمرے سے ماحول فضا بھی خوشگوار ہوگئی۔ اس کی خوش الحانی سن کر پرندوں نے اپنے نغمے، ترانے اور چہچہانا بھولنا شروع کر دیا تھا۔ ہوا بھی باادب ہو کر گزرنے لگی۔

فیض الحسن کی آواز آج معمول سے زیادہ اونچی تھی۔ اسے کسی کی نیند میں خلل پڑنے کا خطرہ نہ تھا۔ اس کو ''آواز ہلکی کر لو۔'' کہنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ماہ نور کے حق مہر کی ادائیگی کا طریقہ تھا جو ماہ نور نے سوچا تھا اور فیض الحسن نے ادا کر دیا تھا۔ اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش نے عجیب ہی سماں باندھ دیا تھا۔

پیار و محبت کی داستان رقم کرتے ہوئے چار دن گزر گئے تھے۔ بس یونہی تھا کہ دو پل ہی ہوئے ہوں مگر ان لوگوں کو اب کوئی فکر نہ تھی۔ وہ شرعی طور پر میاں بیوی تھے۔ قانونی حیثیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔

''اگر بیگم صاحبہ کا حکم ہو تو بندہ محترمہ کو کالج چھوڑ کر آ سکتا ہے۔'' فیض الحسن مانو سے رخصت ہو رہا تھا اس کے لہجے میں شوخی اور شرارت عود آئی تھی۔

''تیرے پیار میں مانو نے وہ کچھ سیکھا ہے جس کی دنیا طلب کرتی ہے۔ یہ کالجوں کے علم اب میرے لیے بے معنی ہو گئے ہیں۔'' وہ اداس تو تھی مگر فیض الحسن کو جانا تھا۔ ''فیض! زندگی کے کسی بھی موڑ پر میرا ہاتھ نہ چھوڑنا، میں بھی وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک سانسوں کی ڈور قائم رہے گی، آپ کا ساتھ اور آپ کا نام میری عبادت ہوگا۔'' وہ جذباتی ہو کر اس کے گلے لگ گئی۔ وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''باہوش زندگی میں...... اب فیض الحسن جتنے بھی سانس لے گا اللہ کے بعد تمہارا ہی نام لے گا۔''

اس نے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنے سامنے کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''جب کبھی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں تو پیشگی معافی چاہتا ہوں مگر یاد رکھنا مانو...... اگر تم زندہ رہو گی...... تو سمجھنا کہ فیض الحسن بھی زندہ ہے۔ کیوں کہ ہم نے بہت بڑے

خاندان سے ٹکر لے لی ہے۔ میری اور تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔'' وہ رونے لگی اور دوبارہ اس کے گلے لگ گئی۔

''اس گھر میں تم میری امانت ہو...... اور میری اس امانت کی حفاظت بھی تمہاری ذمہ داری ہے...... اب کسی بھی کھڑکی یا بالکنی سے چھلانگ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اس کے گالوں پر پیار اور بوسہ دے کر اسے غمگین اور اداس چھوڑ کر چلا گیا تو ماہ نور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

☆=====☆=====☆

وہ سبھی لوگ واپس آ گئے تھے۔ گھر میں ہر چیز اپنی جگہ پر قائم تھی مگر اس گھر کی بیٹی اب اس گھر کی بیٹی نہیں بلکہ کسی کی بیوی تھی۔ یہ بات صرف عنایت علی کو ہی پتا تھی۔ وہ لوگ فوتگی سے واپس آئے تھے۔ سفر کی تھکان اور پھر گھر کے ایک سربراہ کا اس طرح اچانک چھوڑ کر چلے جانا ان کے چہروں سے دکھ عیاں تھا۔ کسی نے بھی ماہ نور سے کوئی بات نہ کی مگر عنایت علی اپنی جگہ مطمئن تھے انہوں نے ماہ نور کے چہرے پر اطمینان اور سکون کی جھلک دیکھ لی تھی۔

رات کے کھانے پر سبھی لوگ جمع تھے۔ ملک عبدالرحمٰن خلافِ توقع خاموش تھے اور یہ خاموشی گھر کے باقی افراد کو کھا رہی تھی مگر ماہ نور مطمئن اور پُرسکون ہو کر کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ اس بات کو ماں جی اور رحمٰن بھائی نے بھی محسوس کیا تھا۔

''مانو!'' انہوں نے ماہ نور کو پکارا تو سبھی کے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے اور نوالے منہ تک لے جانا بھی بھول گئے۔ سبھی رحمٰن بھائی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کل سے تم کالج جاؤ گی، یہ جنید نے کہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ اس کے بعد شادی کی بات ہوگی اور ابھی تو تایا جی کی وفات کا غم تازہ ہے۔ اس لیے چند ماہ تک اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔'' وہ ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے مگر اس کی نظریں اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھیں۔

''میں اس گھر میں فیض الحسن کے آنے سے پہلے والی پوزیشن چاہتا ہوں۔ کوئی گڑبڑ یا کوئی ٹینشن نہیں...... اس گھر میں اگر آئندہ کسی ڈرائیور کا ذکر ہوا...... تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھے اور باہر کی جانب نکل گئے۔

ماں جی ان کے پیچھے ہی چل دیں، انہوں نے بھی ماہ نور سے کوئی بات نہ کی تھی کیوں کہ وہ بھی اس سے ناراض دکھائی دیتی تھیں۔ انہوں نے لان میں جا کر دیکھا تو عبدالرحمٰن

سنگِ مرمر کے بنچ پر براجمان تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھے۔ ماں جی بھی خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے عبدالرحمٰن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے دلاسہ دینے والے انداز میں بولیں۔

''تم فکر نہ کرو رحمٰن!...... ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے ماں جی کی طرف اداس نگاہوں سے دیکھا۔

''یوں تو اس گھر میں ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک لگ رہی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے کچھ کھو گیا ہے...... پتا نہیں...... کیا کھو گیا ہے؟''

''تمہاری نظروں کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے یا پھر تمہاری سوچ کا قصور بھی۔'' ماں جی نے انہیں دلاسہ دیا تو وہ کہیں دُور سے بولے۔

''اللہ کرے!...... یہ میری نظروں کا دھوکا ہی ہو میری ہر چیز اس گھر میں موجود ہو۔'' انہوں نے ماں جی کی گود میں سر رکھ لیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆=====☆=====☆

قادر علی اور فاطمہ چپکے سے منظر علی کا گھر چھوڑ گئے تھے۔ صفدر حسین ان کے کمرے سے ملنے والا خط فیض الحسن کو پڑھ کر سنا رہا تھا۔

''برادر...... فیض الحسن! السلام علیکم!

اللہ کی رحمت سے جتنا دانہ پانی تمہارے ساتھ لکھا تھا، ہم نے کھا، پی لیا، تمہیں تو معلوم ہے کہ میں ڈیوٹی کا پابند ہوں اور اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے مجھے تمہارا ساتھ چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ یہی سمجھو کہ اللہ کی رضا یہی ہے۔ زندگی نے وفا کی تو ان شاء اللہ ضرور ملاقات ہوگی۔

اب میں کہاں جا رہا ہوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم...... اس لیے تمہیں بھی بتانے سے قاصر ہوں۔ ہر حال میں اللہ کی مقدس کتاب سے مدد لینا۔ کوئی بھی مشکل مشکل نہ رہے گی۔

قادر علی

صفدر حسین نے خط بند کر کے کاغذ فیض الحسن کو پکڑا دیا تھا۔ وہ قادر علی کے اس طرح چلے جانے سے اداس ہو گیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ قادر علی قادرِ مطلق کے حکم کی بجا آوری کے لیے اپنی ڈیوٹی پوری ایمان داری سے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ جدائی ضروری تھی۔

''چاچا!'' صفدر حسین نے اسے مغموم اور کھوئے ہوئے دیکھا تو اس کا دل بہلانے کے لیے اسے باتوں میں لگانے لگا۔ ''اداس ہو؟''

''جب کوئی اپنا اس طرح بچھڑتا ہے تو دل کو بہت دُکھ پہنچتا ہے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا تھا۔

''چاچے قادر علی کو ڈھونڈا بھی تو جا سکتا ہے؟'' اس کی آواز میں تجسس تھا۔

''نہیں ڈنگرا...... اسے ہم جیسے لوگ نہیں ڈھونڈ سکتے۔ وہ اس دنیا کا مسافر نہیں ہے بلکہ راہِ حق کا مسافر ہے۔ ایسے مسافر...... میلوں پیدل چلتے ہیں۔ بھوک، پیاس اور موسموں کی شدت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ فاصلے سمٹ کر منزلیں ان کے قریب کر دیتے ہیں اور یہ لوگ ڈھونڈنے سے نہیں ملتے بلکہ جہاں بھی کوئی اللہ کا بندہ تکلیف میں ہو یہ وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ بس اللہ کی رضا اور اس کی مدد سے۔'' فیض الحسن کا لہجہ بدستور مغموم تھا۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن منہ کھول کر عنایت علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس نے اسے بتایا تھا کہ مانو اب پھر کالج جانے لگی ہے۔ عنایت علی نے اسے تمام بات بتا دی تھی۔ اب ان دونوں کی شادی کا اعلان کرنا ہی مشکل ترین مرحلہ تھا۔

عنایت علی نے بہت سارے روپے فیض الحسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کچھ روپے ہیں، رکھ لو فیض الحسن! ان سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لو۔'' وہ ان روپوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''آپ کو مانو نے کچھ نہیں بتایا عنایت بھائی۔''

''سب کچھ بتایا ہے اور میں تمہاری خودداری کی قدر کرتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم یہ روپے لے کر اپنی خودداری بیچ دو بلکہ میں اپنے بہنوئی کو یہ ادھار دے رہا ہوں۔'' عنایت علی نے اُدھار کا لفظ استعمال کیا تو صفدر حسین جو کہ ان کی گفتگو سن رہا تھا، بول پڑا۔

''اُدھار تو چلتا ہی رہتا ہے زندگی میں...... میں چاچے فیض الحسن کو سمجھاتا ہوں۔'' وہ ان کے ہاتھ سے روپے لے کر فیض الحسن کی طرف بڑھا۔

''ان روپوں سے جو بھی کاروبار کرو گے اس کے نفع میں سے کچھ بچا بچا کر اپنا قرض اتار دینا۔ اس طرح تمہارے گھر کا خرچ بھی چلتا رہے گا اور تمہاری راس بھی اپنی ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ عنایت چاچا کا قرض بھی اتر جائے گا اور اس طرح تمہاری خودداری پر آنچ بھی

نہیں آئے گی۔'' صفدر حسین اپنی بات اچھی طرح سمجھا سکا تھا۔
فیض الحسن نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا اور روپے رکھ لیے۔

''اب مانو بھی خوش ہو جائے گی۔'' عنایت علی یہ کہہ کر جانے لگے تو فیض الحسن انہیں باہر دروازے تک چھوڑنے آیا۔

''مانو سے کہنا کہ میں اس کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''اچھا مجھے یاد آیا!'' عنایت علی گاڑی میں بیٹھے تو انہوں نے فیض الحسن کو اپنے پاس بلایا۔

''سبزی منڈی میں میرے جاننے والے ہیں، تم صبح چلے جانا۔ آلو یا پیاز کا کام کر لینا۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہ کام بہتر طور پر کر سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے سبزی منڈی کے بندوں کے دو تین کارڈ جیب سے نکال کر فیض الحسن کو دے دیے اور گاڑی ریورس کرتے ہوئے گلی سے باہر لے گئے۔

فیض الحسن جان گیا تھا کہ ماہ نور گھر والوں سے فی الحال سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے۔ لہٰذا اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

فیض الحسن نے سبزی منڈی میں آلوؤں کا کاروبار شروع کر لیا تھا۔ صفدر حسین بھی اس کے ساتھ جاتا تھا۔ آڑھتی صاحبان جب آلو کی بولی دیتے تو وہ اچھا سودا زیادہ بولی دے کر خرید لیتے اور مناسب منافع پر آگے بیچ دیتے تھے۔ پہلے دس پندرہ دن تو انہیں کبھی نقصان ہوتا اور کبھی رقم پوری ہو جاتی مگر فیض الحسن کو ہمت دینے والا ساتھی صفدر حسین کی صورت میں ساتھ تھا۔ انہوں نے محنت کر کے اپنا نام بنا لیا۔ اب دو ماہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد ان کی گاہکوں سے شناسائی ہو گئی تھی۔ گاہک بھی ان کی زبان کی وجہ سے ان کی عزت کرتے تھے۔ ان دو ماہ میں ماہ نور تین مرتبہ ان کے گھر آئی تھی۔ صفدر حسین موقع شناس تھا وہ جائے وقوعہ سے رفو چکر ہو جاتا تھا اور وہ ڈھیروں پیار کی باتیں کرتے اور مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے۔

ماہ نور نے اسے بتا دیا تھا کہ گھر میں ابھی کسی کو بھی شادی کے بارے میں علم نہیں ہے اور عنایت بھائی کی پلاننگ کے مطابق انہیں ابھی اپنی شادی ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بس اسی طرح چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ صفدر حسین نے بھی رنگ روپ نکالنا شروع کر دیا تھا اس کا قد کاٹھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

سبزی منڈی میں ان کی اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ اب تو فیض الحسن سبزی کی

دو تین گاڑیاں خریدنے لگا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اچھا خاصا نفع بھی دے دیا تھا۔ اس نے عنایت علی کو اس کا قرض بھی لوٹا دیا تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر وہ تلاوتِ قرآنِ حکیم سے کرتا تھا۔ اب تو اس کی شاگردی میں صفدر حسین نے بھی قرآن کریم ختم کر لیا تھا یعنی مکمل پڑھ لیا تھا، اب وہ دہرائی کر رہا تھا۔

مگر دنیا سکھوں اور نفع کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ دُکھوں اور کانٹوں کی سیج بھی ہے۔ تقدیر کی مہربانیاں سدا قائم نہیں رہتیں۔ ان پر بھی قدرت کی ستم ظریفی شروع ہونے والی تھی۔ ماہ نور کالج جانے کے لیے سیڑھیاں اُتر رہی تھی کہ ایک زوردار چکر آنے پر لڑکھڑا کر رہ گئی۔ ممتاز بھابی اسے دیکھ رہی تھی، ماہ نور نے دیوار کا سہارا لے کر اترنا شروع کیا مگر نیچے آتے ہی وہ ممتاز بھابی کی بانہوں میں جھول گئی۔ ماں جی بھی پریشانی کے عالم میں بہو کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

عنایت علی تو تمام معاملہ جانتے تھے انہوں نے فوراً گاڑی نکالی اور ماہ نور اور ماں جی کو لے کر ہسپتال کی طرف چل پڑے۔

لیڈی ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا تھا وہ ماں جی کی عقل سے ماورا بات تھی۔ وہ گنگ ہو گئی تھیں یوں لگتا تھا کہ اب زندگی بھر کبھی بھی نہیں بولیں گی مگر گھر آتے ہی انہیں ماہ نور کے چہرے پر چھلکنے والی خوشی کی رنگت نے تاؤ دلا دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگیں۔ بہوئیں ان کی طرف دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ وہ ساتھ ساتھ کہہ بھی رہی تھیں اور ان کے آنسو بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

''مانو تجھے موت کیوں نہ آ گئی، کاش تُو اسی وقت مر کھپ جاتی، تم نے میرے خاندان کو بٹا لگا دیا۔ تمہارے باپ کی روح کو کتنی تکلیف پہنچی ہو گی؟ بھائیوں کی عزت کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔'' وہ سانس لینے کو رکیں تو ممتاز بھابی نے پانی کا گلاس ان کے منہ سے لگا دیا۔ سلمیٰ بھابی نے انہیں تھام رکھا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر زمین پر ہی بیٹھ گئیں۔

ماہ نور سیڑھیوں میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ گھر میں ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ بھائی عنایت تو خاموشی سے ایک جگہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ بھابیاں بھی دنیا داری کی سمجھ رکھتی تھیں۔ وہ تمام معاملہ سن اور سمجھ کر خاموش ہو گئیں مگر انگشت بدنداں رہ گئی تھیں۔

کنواری ماہ نور ماں بننے والی تھی۔ گھر میں ابھی یہ واویلا ہو رہا تھا کہ ملک عبدالرحمٰن اندر داخل ہوئے انہوں نے ماں جی کی یہ حالت دیکھی تو فوراً ان کی طرف بڑھے۔

''ماں جی...... ماں جی......'' انہوں [illegible] ماں جی کو پکارا تو وہ بونقوں کی طرح ان [illegible]

طرف دیکھنے لگیں۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کہ وہ رحمٰن کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان کے دماغ اور دل نے رشتہ کی پہچان کروائی تو ان کا ضبط ساتھ چھوڑ گیا، وہ بیٹے کو گلے لگا کر رونے لگیں۔ ''ہم برباد ہو گئے رحمٰن!'' ان کا یہ کہنا تھا کہ رحمٰن بھائی نے سمجھا کہ کوئی مزید نوتید گی ہو گئی ہے، وہ ماں جی کو حوصلہ دینے لگے۔

''حوصلہ کیجیے ماں جی! مجھے بتائیں کیا ہوا ہے۔'' وہ ابھی تک تمام معاملے سے بے خبر اور لاعلم تھے۔

''کس منہ سے اور کس زبان سے کہوں، میرے خاندان کی عزت کی دھجیاں بکھر گئی ہیں۔'' وہ بیٹے کو خاندانی وقار کے بخیے اُدھڑ جانے کی روداد الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر تھیں۔ پھر بھی انہوں نے روتے ہوئے مانو کی طرف اشارہ کیا تو رحمٰن بھائی اس جانب دیکھ کر شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔

''کیا اس نے پھر خودکشی کی کوشش کی ہے؟'' وہ نہ سمجھ رہے تھے۔ اس لیے ان کے لہجے میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔ ''مجھے صاف صاف بتایا جائے کہ کیا ہوا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑے ہو گئے، بھابیاں سہم گئی تھیں۔ مانو پورے طمطراق کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ چکی تھی۔

''آئیے! میں آپ کو بتاتی ہوں۔'' سلمٰی بھابی نے ملک رحمٰن کو ایک طرف لے جا کر بتایا تو ان کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئیں، آنکھیں شعلہ بار بن گئیں، کچھ ساعتیں تو وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں اپنی بیوی کی طرف دیکھتے رہے مگر ماں جی کا رونا حقیقت کو تسلیم کروانے کے لیے اٹل حقیقت تھا۔ وہ زمین میں دھنس جانا چاہتے تھے مگر زندگی میں ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔

وہ آہستہ آہستہ مانو کی طرف بڑھے۔ مانو بھی انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چلتے ہوئے تین سیڑھیاں چڑھ کر مانو کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''کون ہے؟'' ان کی زبان نے انگارہ اُگلا تو مانو ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ ''میں پوچھتا ہوں کون ہے وہ جس کے ساتھ تم نے منہ کالا کر کے خاندان کے وقار کو نیلام کیا ہے؟'' ان کی رگیں پھول گئیں۔ انہوں نے مانو کے خاموش رہنے پر اسے بالوں سے پکڑا اور سیڑھیوں سے گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئے۔ اس کی چیخوں کی پروا کیے بغیر انہوں نے اسے ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ مارتے بھی جاتے تھے اور کہتے بھی جاتے تھے۔

''بتاؤ...... وہ کون ہے؟ جس کی اولاد...... بتاؤ۔'' ایک اور ٹھوکر نے مانو کی دردناک چیخ بلند کی۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ گویا کہ

مامتا دنیا میں آنے والے بچے کی حفاظت کر رہی ہو۔ وہ گرتی پڑتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحمٰن بھائی اس کی طرف خون آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''فیض الحسن!'' ماہ نور کی زبانی اتنا سننا تھا کہ رحمٰن بھائی کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ انہوں نے گھوم کر ماہ نور کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا تو وہ کئی فٹ دور جا کر گر گئی۔ وہ اسے مارنے کے لیے مزید آگے بڑھے مگر عنایت بھائی جو کافی دیر سے اس تماشا کو برداشت کر رہے تھے۔ رحمٰن بھائی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کا انداز رحمٰن بھائی کو روکنے اور سمجھانے کا تھا مگر رحمٰن بھائی نے انہیں بھی دھکا دے کر پرے پھینک دیا اور ایک بار پھر مانو کی طرف بڑھے جس کا سر صوفے سے لگنے پر اب خون آلود ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑے ہو گئے۔

''تم نے نالی کی اینٹ چوبارے کو لگانے کی کوشش کی ہے۔ اتنی گندی حرکت اور گھناؤنا فعل......'' ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک اور تھپڑ مارنے کی کوشش میں ہاتھ اٹھایا تو مانو نے بھی ہاتھ اٹھا کر منع کرنے والا انداز اپنایا تو رحمٰن بھائی کی آنکھیں مزید کھل گئیں۔

''اپنی طاقت اور مردانگی کا گھمنڈ سنبھال کر رکھیے۔'' ان کا ہاتھ نیچے ہو گیا تو مانو نے بھی اپنا ہاتھ نیچے کر لیا تھا۔ ''اگر آپ نے ہمیں پال کر ہم پر احسان کیا ہے تو ہم نے بھی آپ کی فرمانبرداری میں کبھی سر نہیں اٹھایا؟ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کو اپنی ہی تربیت اور خون پر اعتماد نہیں ہے؟ میں نے آپ سے کہا تھا نا...... کہ اگر ضد کی بات ہے تو میں بھی آپ کی بہن ہوں اور دیکھیے مسٹر رحمٰن! آج میری ضد کی جیت ہوئی ہے۔ میری کوکھ میں پلنے والا بچہ فیض الحسن کا ناجائز خون نہیں ہے بلکہ اس کی جائز اولاد ہے۔ میں نے اس سے نکاح کیا ہے...... نکاح کیا ہے......'' یہ الفاظ عنایت بھائی کے علاوہ سبھی پر بم بن کر گرے۔ ماں جی ہکا بکا تھیں، ممتاز بھابی کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔ رحمٰن بھائی کی حالت پر ترس آنے لگا تھا مگر ماہ نور نے اس پر بھی بس نہیں کیا۔

''آپ نے میری جان پر جتنے ظلم کرنے ہیں کر لیجیے مگر یاد رکھیے...... اگر میرے بچے کو کوئی نقصان پہنچا...... تو گھر کے ہر فرد سمیت...... سب کچھ جلا کر راکھ کر دوں گی۔ اس کے بعد ہی میری موت ہو گی......'' وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگی مگر پھر ٹھہر گئی۔

''اگر اس بات میں کوئی شک لگے...... تو آزما کر دیکھ لینا۔'' گھر کے تمام افراد بُت بن کر کھڑے تھے۔ سبھی ایک دوسرے سے آنکھ چرا رہے تھے۔ اتنا بڑا قدم اٹھا کر مانو نے

انہیں جینے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

وہ لوگ اپنی اپنی جگہ پر زندہ مُردوں کی صورتوں میں سانس لے رہے تھے۔ ماں جی تو سر پیٹ کر خاموش ہوگئی تھیں۔

ٹک ٹک...... ٹک ٹک کی آواز پر انہوں نے اوپر کی جانب دیکھا تو مانو ہاتھ میں بریف کیس لیے سیڑھیاں اُترتی ہوئی آرہی تھی۔ ان سب کو ایک بار پھر جھٹکا لگا، وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ چلتی ہوئی ماں جی کے پاس پہنچی اور روتی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''میں نے اچھا کیا یا برا...... یہ میں جانتی ہوں کہ اچھا ہی کیا ہے۔'' اب وہ سب کے چہرے بار بار دیکھ رہی تھی۔ ''آپ لوگوں کے لیے...... اور اس خاندان کے لیے یقینی طور پر دُکھ اور ذلت کی بات ہے۔'' وہ پھر ماں جی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''مجھے معاف کر دیجیے ماں جی...... میں آپ کو دُکھ دے کر رُخصت ہو رہی ہوں۔''

آنسو چھلکنے لگے ماں جی کی ممتا بھی تڑپ اٹھی مگر سوال خاندان کے وقار اور عزت و عظمت کا تھا۔ انہوں نے لمبا سانس لے کر اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کی۔

''میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری اس رخصتی میں کسی کی بھی دعائیں شامل نہیں ہیں۔''

اب وہ رحمٰن بھائی کے سامنے آکھڑی ہوگئی، انہوں نے غصے اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

''جب پیار بکنے لگتا ہے...... تو پھر یہ دولت، خوبصورت جائیداد اور زمینیں سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔'' وہ رحمٰن بھائی سے کہہ رہی تھی مگر ان کی پشت اس کی طرف تھی۔

''آپ نے میرے جذبات کو اس عظیم الشان عمارت سے مشروط کر کے اپنی دولت اور جائیداد کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی تھی مگر یہ اینٹوں اور گارے سیمنٹ کی بنی ہوئی عظیم الشان جائیداد میرے پیار کی راہوں میں آپ کی نفرت اور خاندانی روایات کی زنجیر نہ بن سکی۔'' وہ واپس مڑی اور چند قدم پر ٹھہر گئی۔

''میں یہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ بس اگر کچھ میرے پاس ہے تو آپ لوگوں کی یادیں اور آپ کے ساتھ گزارا ہوا پیار بھرا وقت...... بس یہی میرے پاؤں کی زنجیر ہوگا۔ یہ رشتے ناطے میں کبھی بھی بھول نہ پاؤں گی مگر جیون کے نئے سفر پر نئے رشتوں کا تقدس اور احترام ضرور چاہوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

ماں جی کے لب پھڑپھڑائے مگر کانپ کر رہ گئے۔ ''اسے روکیے...... رحمٰن بھائی...... اسے روکیے۔'' عنایت علی رحمٰن بھائی کی منت کرنے لگے۔

''میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' رحمٰن بھائی کی دور سے آتی ہوئی آواز سبھی نے سن لی تھی۔ عنایت علی مانو کے پیچھے بھاگ کر باہر نکلے تو وہ گیٹ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ''مانو...... مانو...... رک جاؤ۔'' وہ عنایت بھائی کی آواز سن کر رک گئی تھی۔ آخر وہی اس گھر میں اس کا محسن تھا۔ ان کے قریب پہنچنے پر مانو ان کے گلے لگ کر رو پڑی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر دلاسہ دے رہے تھے۔

''میں تمہیں رخصت کرنے آیا ہوں...... مانو رونے نہیں۔'' ان کی آنکھیں بھی چھلکنے لگیں۔

''کیوں کہ...... بہنیں اور بیٹیاں...... اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں...... اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دینا......'' اس سے پہلے کہ عنایت بھائی اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے وہ تڑپ کر بھائی کے سینے سے لگ گئی، وہ پھر بولے۔

''مانو!...... میں تمہارا باپ تو نہیں بن سکا مگر تمہیں باپ بن کر تمہاری خواہش کے مطابق خوشیاں دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔ کہیں تم یہ نہ کہو کہ اگر آج بابا زندہ ہوتے...... تو مجھے کسی بھی خوشی کے لیے ترسنے نہ دیتے۔''

''آپ نے تو وہ کیا ہے...... عنایت بھائی، اگر بابا بھی ہوتے تو شاید میری اس خواہش کو میرے ساتھ ہی دفن کر دیتے...... آپ واقعی مسیحا ہیں مگر وہ مسیحا...... جسے اپنوں کی نفرت کے پتھروں کا ڈر اور خطرہ رہتا ہے...... کانچ کا مسیحا!'' وہ گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔ ماں جی کے رونے کی آواز نے عنایت علی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سبھی لوگ بھی دور کھڑے مانو کی رخصتی کو دیکھ رہے تھے۔

مانو رخصت ہوگئی تھی مگر کسی بھائی نے کہار بن کر ڈولی کو کاندھا نہ دیا تھا۔ ماں کے پیار اور دعاؤں کے بغیر ہی بیٹی رخصت ہوگئی تھی۔ بھابیوں نے شگن بھی ادا نہ کیے تھے۔ یہ کیسی رخصتی تھی جو دولہا کے بغیر ہوئی تھی، دلہن کا سسرال کہاں ہے؟ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ کہاں گئی ہے، یہ گھر کا کوئی فرد نہ جانتا تھا، بس عنایت علی کے سوا۔

سبھی لوگ بوجھل قدموں کے ساتھ واپس اندر چلے گئے تھے جیسے کہ مانو کو قبر میں دفنا کر گئے ہوں۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن منڈی جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ گیٹ پر بیل ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا

تو سامنے ماہ نور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ جلدی سے ایک طرف ہٹا اور اسے اندر آنے کا کہا۔ اس کے ہاتھوں سے اٹیچی کیس لے کر خود پکڑا اور اسے اندر لے آیا۔

اس نے دیکھا کہ ماہ نور کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ ہونٹ اور ماتھے سے خون بھی نکل رہا تھا۔ وہ تمام معاملہ سمجھ گیا تھا مگر ماہ نور کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ اس وقت صفدر حسین گھر پر نہ تھا، دوپہر کو بھی منڈی جا کر سودا وغیرہ خریدنا ضروری تھا کیوں کہ صبح صبح وہی خریدا ہوا سودا فروخت کرنا ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماہ نور کوئی بات کرتی گیٹ پر دستک سن کر وہ سمجھا کہ صفدر حسین آ گیا ہے۔ گیٹ کھولا تو سامنے عنایت علی کھڑے تھے۔ ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں ماہ نور بھی حیران رہ گئی تھی۔

عنایت علی کی زبانی فیض الحسن کو تمام کارروائی معلوم ہو گئی۔ ماہ نور روئے جا رہی تھی۔

''فیض الحسن! یہ جگہ چھوڑ دو۔'' عنایت علی نے کہا تو وہ دونوں ہی ان کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگے۔ جیسے کہ انہیں عنایت علی کی ذہنی رو بہک جانے کا ڈر ہو گیا ہو۔

''ہاں! فیض الحسن..... آپ بھائی رحمٰن کو نہیں جانتے۔ وہ اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، میں نے خود سنا ہے۔ وہ فون پر کسی کو ہدایات دے رہے تھے کہ فیض الحسن کو ڈھونڈ کر ان کے سامنے پیش کیا جائے۔''

''عنایت بھائی! کیا آپ مجھے بزدل سمجھتے ہیں؟ آپ نے سنا اور مجھے آ کر کہہ دیا اور میں اپنا گھر بار اور بیوی کو لے کر کہیں گمنام منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو عنایت علی اور ماہ نور بھی کھڑے ہو گئے۔ ''یہ ناممکن ہے عنایت بھائی!''

''میری بات کو سمجھو فیض الحسن! تمہاری بیوی اور بچہ خطرے میں ہے۔'' عنایت علی نے کہا تو فیض الحسن اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''مجھے باپ بن جانے کی خوش خبری..... کن الفاظ میں دے رہے ہیں آپ.....؟''

''میں اپنے بیوی بچے کی حفاظت کرنا جانتا ہوں اور کر کے دکھاؤں گا۔'' اتنی دیر میں صفدر حسین بھی اندر آ چکا تھا۔ وہ چچی ماہ نور کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ماہ نور نے بھی پیار سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''میں تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے آیا تھا..... مگر تم نے مقابلہ کرنے کا کہہ کر میرا مان بڑھا دیا ہے۔ مجھے واقعی تم پر اور ماہ نور کی پسند پر فخر ہے فیض الحسن! میں دعا کروں گا کہ تمہیں اللہ رب العزت گرم ہوا سے بھی محفوظ رکھے۔'' وہ جاتے ہوئے مانو کی طرف مڑے۔ ''زندگی

کی حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں، تمہیں اپنا گھر مبارک ہو مانو! زندگی میں کبھی بھی اس بھائی کی ضرورت محسوس ہو تو آواز ضرور دے دینا۔ مجھے اپنے سائے سے بھی آگے پاؤ گی۔'' وہ یہ کہہ کر بھرائی ہوئی آواز اور مغموم تاثرات کے ساتھ باہر نکل گئے۔

گھر کی سوگوار فضا صفدر حسین کو کھل رہی تھی۔ وہ ناسمجھ نہیں تھا بلکہ اب تو جوان ہو چکا تھا۔ اسے اس گھر کو جنت بنانا تھا اور جنت قہقہوں اور پھولوں کی بارش سے ہی بنتی ہے۔

''چاچا! کیا زندگی اسی طرح بھوکے ہی گزار دو گے؟'' اس کی آواز سن کر مانو بھی چونک گئی۔

''فیض الحسن!'' وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ سبزی وغیرہ لے کر آیا کریں میں آپ کو پکا کر دیا کروں گی۔''

''ہُرّے.....'' صفدر حسین کا نعرہ گونجا۔ ''اب ہم بھی گھر کی روٹی کھائیں گے۔''

''تم ابھی سکون سے بیٹھو..... میں اس ڈنگر کی خبر لیتا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر صفدر حسین کو پکڑنے کے لیے بھاگا..... بس پھر کیا تھا؟ گھر کا نقشہ ہی چند لمحوں میں بدل گیا۔ جب وہ دونوں ہانپنے لگے تو فیض الحسن کو خود ہی صفدر حسین نے اپنا بازو پکڑا دیا۔

''ہاں! اب بول ڈنگر! کدھر جائے گا۔'' وہ دونوں ہی ہانپ رہے تھے جب کہ مانو انہیں دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

''کان ادھر لاؤ۔'' فیض الحسن نے صفدر حسین کے کان میں کچھ کہا..... تو وہ اس کی طرف منہ کھول کر دیکھنے لگا۔ جیسے کہ ایسے یقین نہ آ رہا ہو وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ ''اوہ..... نئیں یار.....''

''اوہ..... ہاں یار..... ہاں!'' فیض الحسن نے اسی کے انداز میں کہا اور اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بھی بند کر دیا۔ اب وہ مانو کی طرف مڑا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ صفدر حسین کے اس طرح دیکھنے پر شرما کر رہ گئی۔

''چاچی!..... اس ڈنگر کا نام..... میں رکھوں گا۔'' مانو اس کے منہ سے سن کر دوہری ہو گئی اور مصنوعی طور پر آنکھیں نکال کر اسے گھورا تو وہ ہنسنے لگا۔

''مراد الحسن!'' صفدر حسین نے کہا تو فیض الحسن اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ مراد الحسن کون ہے؟''

''وہ.....'' اس نے ماہ نور کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو ابھی آنے والا ہے، یہ اس کا نام

ہے۔بس...... کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' اس کا انداز حاکمانہ تھا، وہ دونوں ہی مسکرانے لگے۔فیض الحسن ہنستے ہوئے بولا۔

''اگر! لڑکی ہوئی تو......؟'' یہ سن کر وہ سوچنے لگا اور پھر شرارتی انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔''لڑکا ہی ہوگا...... اگر...... فرض کرو لڑکی ہوئی تو اس کا نام...... حور بانو رکھیں گے۔'' وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے۔فیض الحسن کو صفدر حسین کی خوشی عزیز تھی اور صفدر حسین نے پل بھر میں اپنی طبیعت کے مطابق گھر میں اداسی اور سوگواری کو دھکا دے کر قہقہوں میں بدل دیا تھا۔

وہ رات سکون سے گزر گئی۔منہ اندھیرے ہی فیض الحسن اپنے معمول کے مطابق اٹھا اور حاجاتِ ضروریہ سے فارغ ہو کر اس نے ماہ نور کو نماز کے لیے جگایا۔انہوں نے وضو کر کے نماز ادا کی اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہر کسی مصیبت میں ان کی حفاظت فرمائے۔صفدر حسین بھی بیدار ہو چکا تھا۔وہ بھی نماز باقاعدگی سے پڑھنے لگا تھا۔پھر فیض الحسن نے دل کی تاروں کو چھیڑنے والی خوش الحانی شروع کی تو واقعی پُرسرور کیفیت نے کلام پاک کی برکت سے ماحول خوشگوار اور باوضو کر دیا تھا۔

فیض الحسن نے منڈی جاتے ہوئے ماہ نور کو کچھ ہدایات دیں اور دونوں ہی باہر نکل گئے۔

''چاچا!'' صفدر حسین نے اسے باہر آ کر پکارا تو فیض الحسن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے صرف ''ہوں'' کہا۔

''اگر ملک عبدالرحمٰن نے ہمارے بعد گھر میں چاچی کو نقصان پہنچایا تو کیا ہوگا؟'' وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔فیض الحسن اس کی پریشانی کا سدِ باب کرنا چاہتا تھا اس لیے بولا۔

''تمہاری چاچی بہت بہادر خاتون ہے، دیکھا نہیں کہ کس طرح پورے خاندان سے ٹکر لے کر اس نے ایک غریب ڈرائیور سے شادی کر لی اور پھر اب اللہ کی رحمت ہوئی ہے تو پورے گھر کی دہشت سے خوف زدہ ہونے کی بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں ہر طرح کے مقابلے کا چیلنج کر کے آئی ہے...... مجھے اپنی مانو پر فخر ہے۔وہ تم نے سنا نہیں کہ گھوڑوں کے دولتے گھوڑے ہی سہتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں چاچا؟''

''میں نے ڈنگروں کی بات کی ہے اور حیران ہوں کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے اس ویگن میں سوار ہو گئے جو انہیں سبزی منڈی تک لے جا رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

''آپ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔'' عنایت علی اس وقت رحمٰن بھائی اور ماں جی کے ساتھ اپنے بنگلے کے ڈرائینگ روم میں موجود تھے۔

''مجھے روک رہے ہو؟ سمجھا رہے ہو؟ یا پھر اطلاع دے رہے ہو۔'' ان کی گھن گرج ویسے ہی قائم تھی۔ماں جی کا ستا ہوا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ انہیں بیٹی کے اس طرح چلے جانے کا بہت دُکھ ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔بیٹی ان کی عزت کو داغ لگا کر گئی تھی مگر وہ کہتی ہے کہ اس نے نکاح کیا ہے۔اگر نکاح ہی کرنا تھا تو پھر اتنی دیر چھپایا کیوں؟ کیا ان کا کوئی حق نہیں ہے۔جنہوں نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا، پڑھایا لکھایا، اچھی اور اعلیٰ تربیت کی۔ شاید ان کی تربیت میں ہی کوئی کمی تھی، جبھی تو اس خاندان کے ساتھ اتنا بڑا سانحہ ہوا تھا۔

''تم اس کی وکالت مت کرو عنایت علی، اس نے خاندان کی عزت کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔'' رحمٰن بھائی کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔

''اس نے بھاگ کر شادی نہیں کی...... رحمٰن بھائی۔''

''تو کیا؟ تم اس کی شادی کو خاندان کی رضامندی میں شامل کرتے ہو؟''

''اس نے جو بھی کیا وہ اس کا فعل تھا۔آپ دیکھیں کہ وہ اسی میں خوش ہے۔اس نے یہ سب کچھ اپنے پیار کی خاطر قربان کر دیا ہے۔''

''یہ اس کا جذباتی فیصلہ تھا، جب بھوکوں مرے گی۔خود ہی اس چوکھٹ پر خالی پیٹ کا کاسہ لے کر آ گرے گی۔''

''آپ نے اسے گود کھلایا ہے، اس طرح بد دعائیں تو نہ دیں۔''

''عنایت علی! تم جس طرح اس کی وکالت کر رہے ہو مجھے تم پر شک ہونے لگا ہے۔کیا تم بھی اس سازش میں شریک تھے؟'' اس بار براہِ راست شک کا تیر عنایت علی کی طرف آیا تو وہ گڑبڑا گئے مگر سمجھدار تھے فوراً ہی معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئے۔

''میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہم نے اسے اپنی بانہوں میں جھلایا ہے۔اس کی ہر خواہش اور خوشی کو عملی جامہ پہنایا ہے۔کیا یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ بھی اس کی خواہش تھی؟''

''یہ اس کی ضد تھی۔'' رحمٰن بھائی غصے کی حالت میں کھڑے ہو گئے۔''خاندان والوں کو اس بات کی کیا مناسب دلیل دو گے عنایت علی؟ کیا یہ کہو گے کہ اس نے ایک ملازم کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کی اور ہم بھائیوں نے آنکھیں بند کر کے ہمیشہ کی طرح اس کی خواہش

کا احترام کرتے ہوئے اس کی شادی ایک ملازم کے ساتھ کر دی؟'' وہ اپنا سانس درست کرتے ہوئے بولے۔ ''عنایت علی! مجھے اس کی اِس کی ضد کا بہت دکھ ہے۔ اب اگر وہ سونے کی بن کر آجائے تو بھی میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''آپ! اگر اس کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے تو وہ بھی جوابی طور پر قانونی کارروائی کر سکتی ہے۔ پڑھی لکھی ہے، باشعور اور عاقل و بالغ بھی ہے، خود سوچیں جب یہ معاملہ عدالتوں، کچہریوں اور تھانوں میں جائے گا تو اس ملک کی ہر اخبار کی زینت بھی بنے گا۔ کیا تب خاندان کا نام بدنام نہ ہوگا؟'' وہ کچھ توقف کے بعد پھر بولے۔

''ذرا سوچیے رحمٰن بھائی! اس نے قانونی طور پر شرعی طور پر شادی کی ہے۔ قانون اور شریعت اسے اپنے خاوند کے ساتھ باعزت زندگی گزارنے کی اجازت دیتے ہیں۔ کورٹ کچہری میں اپنے آپ کو ننگا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہمیں یہاں باپ بن کر سوچنا اور چلنا ہوگا۔''

رحمٰن بھائی سمجھدار تھے۔ ان کی سمجھ میں سب کچھ آرہا تھا۔ اس ملک کا پرنٹ میڈیا بہت ہی طاقتور ہے اور پھر کچہری میں کورٹ میں وہ اپنی ہی بہن کے خلاف مدعی بنے گا تو کس کیس میں بنے گا؟ خاندان کی مزید سبکی ہوگی، لہٰذا خاموشی ہی بہتر ہے۔

''جنید کے گھر والوں کو کیا جواب دوں گا، کیا منہ دکھاؤں گا؟'' وہ ایک کرب سے گزر کر یہ بات کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ اس آواز میں دکھوں اور شکوؤں کا زہر شامل تھا۔

''میں ان کو قائل کروں گا، آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بس مانو کو اپنی خوشی سے اس کی زندگی جینے دیں۔ یہ اس کا حق ہے اور والدین ہونے کے ناطے ہمارا فرض بھی۔'' رحمٰن بھائی نے ماں جی کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں بیٹی کے لیے دریا بن گئیں۔ رحمٰن بھائی چلتے ہوئے آہستہ آہستہ ماں جی کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

''میں ہار گیا ہوں ماں جی! آج میری شکست ہوگئی ہے۔ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ میں نے اسے باپ بن کر پالا تھا، انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلنا سکھایا تھا۔ اس کے منہ میں ابھی توتلی زبان تھی کہ میں نے اس کی ہر خواہش کو مقدم جانا۔ اس نے چلنا شروع کیا تو میں نے اس کے قدموں کے نیچے قالین بچھا دیے۔ اگر وہ چلتی ہوئی گر جاتی تو میرا دل تڑپ کر سینے سے باہر آجاتا۔ اس نے کوئی بھی چیز لینی ہوتی تو مجھ سے مانگ لیتی۔ میں اپنے تمام کام چھوڑ کر اس کی خواہش کا احترام کرتا مگر یہ اس کی خواہش نہ تھی، یہ اس کی ضد تھی۔ وہ مجھ

سے میرے باپ کا نام، خاندان کا وقار اور مان مرتبہ مانگ بیٹھی...... میں یہ سب کچھ اسے نہیں دے سکتا تھا...... بس میری بہن تھی۔ ضدی بھی میری طرح تھی...... اپنی منوالی اور مجھے شکست دے کر...... میرے مان اور غرور کو منہ کے بل اپنے پاؤں پر گرا دیا۔ میں ہار گیا ہوں ماں جی۔ میں نے زندگی کی بدترین شکست کا مزہ چکھ کر مانو کو کھویا ہے۔'' ملک رحمٰن اس خاندان کا سربراہ بچوں کی طرح ماں جی کی گود میں سر رکھ کر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ عنایت علی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں جب کہ ماں جی کے آنسو ملک رحمٰن کے سر پر گر رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

قادر علی نے حکم کے مطابق ایک ویران جگہ پر ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ اس نے ایک کچی جھگی بنا کر اس میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ تقدیر نے اسے شفا بانٹنے کے لیے چن لیا تھا۔ اب وہ لوگوں کو تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ اللہ کے کلام سے ذہنی بیماریوں کا علاج بھی بتانے لگ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کی بات میں برکت ڈال دیتا تھا۔ جس جگہ پر قادر علی نے ڈیرہ جمایا تھا، وہ جگہ نہر کے کنارے آباد تھی۔ بہت اونچائی پر ایک سڑک وہاں سے گزرتی تھی۔ قادر علی کو وہاں بیٹھے سڑک پر چلتی بھاگتی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ نیچے ایک چھوٹا سا پیارا سا گاؤں تھا جس کے باہر قادر علی نے اپنا ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے عظیم وعدہ کی بدولت اسے دو وقت کی روٹی پہنچ رہی تھی کبھی کسی کے گھر سے اور کبھی کسی کے گھر سے۔ فاطمہ نے قرآن کریم پڑھ لیا تھا۔ اب وہ اس کا ترجمہ پڑھ رہی تھی۔ اللہ کی رحمت نے اسے نیک صورت بیٹا عطا کیا تھا۔ اس کا سارا دن اللہ کی عبادت' قادر کی خدمت اور بیٹے کی تربیت میں ہی گزر جاتا تھا۔ وہ قادر علی کے ساتھ انتہائی خوش وخرم زندگی گزار رہی تھی۔

ایک دن ایک عورت اپنے بچے کو لے کر قادر علی کے پاس روتی ہوئی پہنچی۔ وہ اپنا معاملہ بیان نہ کر سکی۔ اس کے آنسو اس کی مجبوری نہ سمجھ کر آنکھوں کی چلمن سے جھانک رہے تھے۔ قادر علی نے اس سے معاملہ پوچھا تو وہ بمشکل بولی۔

''سرکار! میرے اس چار سالہ بچے کو ڈاکٹروں نے کینسر کا مریض بتایا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر پھر رونے لگی۔ قادر علی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بچے کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں اس کا علاج کروا سکوں۔ اس کا باپ بھی دنیا میں نہیں ہے۔'' وہ عورت پھر رونے لگی۔ قادر علی اس عورت کو دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

''اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو بی بی، وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ اگر تمہارے بچے کی زندگی ہوئی تو وہ ضرور کرم فرمائے گا۔ میں اس بچے کو پانی پر دم کر دیتا ہوں۔ اس کو روزانہ گھونٹ گھونٹ پلانا۔ اللہ پاک بڑی مہربانی کرے گا۔'' قادر علی نے فاطمہ کو آواز دی اس نے اندر سے ایک بوتل بھر کر پردے کی اوٹ سے قادر علی کو پکڑا دی۔ اس پر قادر علی نے اللہ کا کلام پڑھ کر پھونک ماردی۔ وہ بوتل عورت کو دے دی اور تاکید کی کہ وہ بھی نماز پڑھ کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے آپ کو عاجز و مسکین پیش کر کے اس سے رحمت مانگتا تھا، شفایابی کی دعا کے لیے قادر علی کتنی کتنی دیر سجدہ میں ہی پڑا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کی اِس ادا پر اپنی رحمت اور شفائیت کے خزانے کھول دیتا تھا۔ یہ قادر علی کی رب تعالیٰ سے محبت اور عقیدت کا ثبوت تھا۔

☆=====☆=====☆

موسم گرما کی روانگی کا وقت آن پہنچا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی نے موسم بہت خوش گوار کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فیض الحسن کو ماہ نور کی کوکھ سے خوبصورت بیٹے سے نوازا تھا جو کہ اب تین ماہ کا ہو چکا تھا۔ صفدر حسین کے ''حکم'' کے مطابق اس کا نام مراد الحسن رکھ دیا گیا تھا۔

گھر بھر کی آنکھوں کا تارا مراد دن بھر صفدر حسین اور فیض الحسن کو چکرا کر رکھ دیتا تھا۔ اب تو کاروبار میں فیض الحسن کی اچھی خاصی جان پہچان بن چکی تھی۔ اس کا نام آڑھتیان کی لسٹ میں شامل ہو گیا تھا۔

مراد کی پیدائش پر عنایت علی نے بہت سارے روپوں کی سلامی بہن کو پیش کی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئے تھے مگر انہوں نے گھر جا کر کسی کو نہ بتایا تھا مگر ماں جی کے دل کو ہول اُٹھ رہے تھے۔ ان کے حساب کے مطابق مانو کے بچے کو تین ماہ کا ہونا چاہیے تھا مگر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ان کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر بھی چلنے لگتا تھا جب ملک رحمٰن نے مانو کو ٹھڈے مارے تھے، خدانخواستہ اس کا بچہ...... اس سے آگے وہ سوچ کر ہی کانپ جاتی تھیں۔ مانو نے بھی کبھی بھول کر اپنے میکے والوں کا نام نہ لیا تھا کیوں کہ فیض الحسن نے کبھی بھی اسے پیار اور محبت کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ اب تو وہ اپنے بچے میں مگن ہو گئی تھی۔

مگر ملک رحمٰن کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے انہوں نے بہت بے قراری کے عالم میں یہ وقت گزارا تھا۔ خاندان والوں نے چند بار ماہ نور کے متعلق پوچھا تو وہ ٹال گئے۔ اب ان کی برداشت بھی جواب دے رہی تھی مگر ابھی صبر سے کام لینا تھا۔ وہ سانپ اور سنپولیے کو اکٹھا ہی ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ ماہ نور کی طرف سے کسی بچے کی پیدائش

کی خبر ملے تو وہ اپنے مشن کو عملی جامہ پہنائیں مگر ابھی تک وہ اس بات سے لاعلم تھے۔ ماہ نور اور فیض الحسن اپنے بچے کی پرورش میں مصروف تھے۔ صفدر حسین اسے عورتوں کے میک اپ کر کے ہنساتا رہتا تھا۔

ماہ نور بھی اس کی فنکاری کی قائل ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی عورت کا گیٹ اپ کرتا تو مانو حیرانگی سے اسے دیکھتی رہتی اور اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دیتی۔

وقت کا ظالم اور مہربان پنچھی اپنے پروں کو چلاتا ہوا کے دوش پر اُڑتا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ مراد الحسن اب ڈیڑھ سال کا ہو گیا تھا۔ وہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ وہ انوکھی انوکھی شرارتیں کرتا تھا، اب فیض الحسن اسے گود میں اٹھا کر جب تک باہر کا چکر نہ لگاتا تھا وہ اسے کہیں جانے نہ دیتا تھا۔

گھر بھر کی آنکھوں کا تارا مراد الحسن باپ اور ماں کی تصویر تھا مگر کہتے ہیں نا کہ بچہ بڑے رنگ بدلتا ہے۔ ابھی بہت سی منازل طے کر کے مراد الحسن نے اپنا رنگ و روپ بنانا تھا۔

''عنایت بھائی! آپ مراد الحسن کا ماں جی کو بتا دیں۔'' مانو نے عنایت علی سے منت بھرے لہجے میں کہا تو وہ مسکرانے لگے۔ وہ اس وقت فیض الحسن کے ساتھ صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فیض الحسن بھی بیوی کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے ماں جی نے جو دُکھ اٹھائے ہیں اور میں نے انہیں جو دُکھ دیے ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔ عنایت بھائی! آپ ماں جی کو ایک بار لے آئیں۔ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔'' مانو کا انداز رو دینے والا تھا۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ ماں جی تمہارے لیے نہ تڑپتی ہوں گی، وہ ماں ہے۔ اس کے کرب اور دُکھ کا اندازہ اولاد نہیں کر سکتی۔'' عنایت علی بھی غمگین ہو تھے۔ ''میں کوشش کروں گا مانو کہ تمہاری ملاقات ماں جی سے کروا سکوں۔'' یہ کہہ کر عنایت علی چلے گئے۔

صبر و ہمت کا پیکر ماہ نور جو کہ فیض الحسن اور دنیا کے لیے مثال بن گئی تھی۔ اب خود ماں بنی تھی تو اس کا صبر اور ہمت جواب دینے لگی تھی۔ اس نے شوہر کی طرف دیکھا جو پیار سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں فیض کہ آپ کو پوچھے بغیر گھر والوں سے ملنے کی ضد کی۔'' اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جن میں شرمندگی اور معذرت واضح نظر آ رہی تھی۔

''مانو! میں نے تمہیں اپنانے سے پہلے اور بعد میں اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ

سدا تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اور میں آج بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" فیض الحسن کی زبانی یہ سن کر اس کے آنسو خشک ہو گئے۔ وہ پھر بولا۔

"میں نے تمہیں گھر والوں سے ملنے کے لیے کبھی بھی نہیں روکا اور نہ ہی کبھی تم نے ملنے کی ضد کی اور اتفاق ہی ہے کہ انہوں نے بھی کبھی تم سے ملنے یا ڈھونڈنے کی کوشش کی ہو۔ ماں جی اور اس گھر کا ہر فرد میرے لیے قابلِ احترام ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

فیض الحسن واقعی محبت کرنے والا شوہر تھا۔ "میں وقت کے ساتھ ساتھ ہر دُکھ بھول گیا ہوں مگر تم پر جو ظلم رحمٰن بھائی نے کیے ہیں انہیں میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔"

یہ بھی اس کی محبت کی ایک ادا تھی۔ وہ اپنی جان پر ہونے والے ظلم و جبر تو فراموش کر بیٹھا تھا مگر اپنی جان مانو کے اوپر ظلم و جبر کو بھولنا نہ چاہتا تھا۔

عنایت علی نے ماں جی کو مانو کے ہاں بیٹے کی خوش خبری سنائی تو وہ ان کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگیں۔

"تم اس سے کہاں ملے تھے؟" ماں جی کا انداز ایسا تھا جیسے کہ وہ مانو کی بہت سی باتیں سننا چاہتی ہوں۔ رحمٰن بھائی اور بھابیاں بھی عنایت علی کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

"میں بازار میں جا رہا تھا کہ مانو اور فیض الحسن سے ٹاکرا ہو گیا...... ماں جی...... اس کا بیٹا بہت پیارا ہے...... وہ میرے گلے لگا تھا۔ میں نے اسے پکڑا تو وہ میرا منہ چومنے لگا۔ آخر ہمارا ہی خون ہے...... میں تو کہتا ہوں ماں جی...... آپ ایک بار چلیے تو سہی......" عنایت علی نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر مانو کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔

"یہ دیکھیں...... میں نے اس سے گھر کا پتا پوچھا تھا اور لکھ بھی لیا۔" انہوں نے کاغذ ماں جی کی طرف بڑھا دیا۔ "وہ بھی آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ماں جی کو لے کر میرے گھر آنا......"

"وہ خود ہی گئی تھی...... اور خود ہی آئے گی۔" رحمٰن بھائی درمیان میں ہی بول پڑے تھے مگر ماں جی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھیں۔ بیٹے کی انا اور ضد نے انہیں بیٹی سے دور کر دیا تھا مگر اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"نہیں...... رحمٰن...... میں اپنی مانو کو لینے جاؤں گی، وہ میری بیٹی ہے...... اور میں اس کی ماں ہوں۔"

"اس نے آپ کا خیال نہیں کیا تھا۔ اس خاندان کی عزت کا جنازہ نکال کر ہمیں روتا ہوا

چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ تب بھی وہ...... آپ کی بیٹی تھی...... اور تب بھی آپ اس کی ماں تھیں...... قصور اس کا ہے، سزا بھی اسے ملنی چاہیے۔" رحمٰن بھائی اپنی انا اور ضد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

"میں تمہاری بھی ماں ہوں رحمٰن، میں نے تمہاری بھی غلطیوں سے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے...... تم نے میری بیٹی کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا میں خاموش رہی...... تم نے اس کی کوکھ میں پلنے والے بچے کو اپنی ٹھوکروں اور ٹھڈوں سے ختم کرنے کی کوشش کی...... تب بھی میں خاموش رہی...... تم نے میری مانو کے سہاگ کو اجاڑنے کی منصوبہ بندی کی...... مگر میں تب بھی خاموش رہی...... اگر ماں کی عدالت سے ممتا کا جذبہ نکال دیا جائے تو جانتے ہو کہ تمہارے جرائم کی فہرست کتنی طویل اور سنگین ہے۔ اگر مانو اپنی غلطیوں اور گناہوں پر سزا کی مستحق ہے تو تمہاری غلطیوں اور جرائم کی سزا پر ممتا کی عدالت تمہیں زندگی بھر ماں کی شکل دیکھنے کو ترسنے کی سزا دے سکتی ہے......" وہ باقاعدہ رونے لگی تھیں۔ "عبدالرحمٰن! ہم نے تمہارا ہر فیصلہ سر جھکا کر سنا اور مانا...... مگر اب نہیں...... میں مانو کے گھر جاؤں گی...... اور اس طرح جاؤں گی جس طرح ایک ماں اپنی بیٹی کی پہلی اولاد کی خوشیاں منانے کے لیے جاتی ہے۔" وہ کچھ توقف کر کے بولیں۔ "اور ہاں! مانو بھی اس گھر میں آئے گی...... فیض الحسن کی بیوی بن کر...... اپنے خاوند کے ساتھ...... اور فیض الحسن بھی آئے گا اس گھر کا داماد بن کر...... اب یہ میرا فیصلہ ہے اور اس بار تمہیں ہی نہیں گھر کے ہر فرد کو عمل کرنا پڑے گا۔" ماں جی اپنا فیصلہ سنا کر باہر لان میں چلی گئیں تو عنایت علی نے سکون اور اطمینان کی ایک سانس خارج کی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی جب کہ رحمٰن بھائی زچ ہو کر رہ گئے تھے۔ اب وہ ماں جی کے ساتھ ٹکر نہ لے سکتے تھے۔ انہیں زندگی میں دوسری بار شکست ہو گئی تھی اور وہ اپنی شکست پر سیخ پا نہ ہوئے تھے بلکہ دماغ کو ٹھنڈا رکھ کر آئندہ کے لائحہ عمل پر عمل کرنے کی سوچنے لگے تھے۔

☆=====☆=====☆

عنایت علی نے فیض الحسن کو سبزی منڈی میں ہی بتا دیا تھا کہ ماں ان کے گھر آنے والی ہیں۔ اس نے بہت سا پھل خریدا اور دوسرے لوازمات بھی خرید کر وہ لدا پھندا گھر لوٹا تو ماہ نور حیران رہ گئی جب کہ ننھا مراد الحسن باپ کو دیکھ کر قلقاریاں مارنے لگا۔

"اتنا سارا پھل اور یہ گوشت وغیرہ......؟" مانو کے لہجے اور آنکھوں میں حیرت تھی۔ فیض الحسن نے اسے تنگ کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اس نے مراد الحسن کو اٹھایا اور چار پائی پر

لیٹ کر اسے اپنے پیٹ پر بٹھا لیا۔ وہ ہنسنے اور کھیلنے لگا مگر مانو کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں؟"

"میرے خاص مہمان آ رہے ہیں، یہ سب کچھ ان کے لیے ہے۔ اب فٹافٹ کھانا تیار کر دو۔ وہ لوگ ابھی پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

"پہلے تو کبھی اس گھر میں کوئی مہمان نہیں آیا۔ یہ آج مہمان اور وہ بھی خاص؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟" وہ حیرانگی سے فیض الحسن کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ مجھے تنگ کر رہے ہیں نا؟" اس نے شک کی نگاہ سے خاوند کو دیکھا تو وہ قہقہہ لگا کر رہ گیا۔ "مانو! میری ایک یہی خامی ہے کہ میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتا۔"

"ہاں! پکڑ لیا نا۔ اب جلدی سے بتائیں۔"

"دل پر ہاتھ رکھ کر سنو! مراد الحسن کی نانی، میری ساس صاحبہ اور تمہاری ماں جی آ رہی ہیں۔" فیض الحسن کا انداز ایسا تھا جیسے کہ بادشاہ کی آمد سے پہلے بگل بجا کر اعلان کیا جاتا تھا۔

ماہ نور بے یقینی کی کیفیت میں فیض الحسن کو دیکھتی رہی۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ فیض الحسن نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا تو وہ ضبط کے باوجود خوشی سے رونے لگی۔

"پاگل ہو گئی ہو...... مانو!...... زندگی کی جس گھڑی سے بھی خوشی ملی خدا کی قسم چرا کر تمہاری گود میں ڈال دوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے مانو کی پشت تھپتھپائی تو وہ بھی آنسو پونچھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ پھر فیض الحسن نے اسے وہ ساری بات بتائی جو عنایت علی اسے بتا کر گئے تھے۔

"عنایت بھائی نے واقعی ایک پُل کا کردار ادا کیا ہے۔"

"نہیں وہ تو مسیحا ہیں۔" مانو بولی تو فیض الحسن کا سر بھی تائید میں ہلنے لگا۔

اب مانو کی پھرتیاں دیکھنے کے لائق تھیں۔ وہ ماں جی کے آنے سے پہلے پہلے مراد الحسن کو صاف ستھرا لباس پہنا کر تیار رکھنا چاہتی تھی، گھر کی صفائی وہ معمول کے مطابق کر چکی تھی، کھانا پکانے کے لیے ہانڈی چولہے پر چڑھا دی تھی۔ چھوٹی موٹی بکھری چیزیں اس نے جلدی جلدی سمیٹ لی تھیں۔ وہ دو سال بعد اپنی ماں جی سے ملنے والی تھی۔ فیض الحسن نے اسے اس گھر میں ہر طرح کا سکھ دیا تھا۔ اس نے کبھی بھی روپے پیسے کی کمی نہ ہونے دی تھی اور مانو نے بھی کبھی زبان پر شکوہ نہ آنے دیا تھا۔ محبت کو عبادت سمجھ کر نبھانے والے اس جوڑے نے محبت کی بے مثل مثال قائم کر دی تھی۔

گیٹ پر دستک ہوئی تو مانو کا دل دھڑک دھڑک کی صدا بلند کرنے لگا۔ فیض الحسن اٹھ کر گیا تو وہ بھی نروس ہو رہا تھا کیوں کہ ماں جی نے اسے ملازم ڈرائیور کے روپ میں ہی دیکھا تھا۔ آج داماد کے طور پر قبول کرنے آئی تھیں۔ مانو بے قراری کی کیفیت میں انگلیاں مروڑنے لگی تھی۔ دروازہ کھل گیا تو سامنے عنایت بھائی اور ان کے پیچھے ماں جی اور دونوں ہی بھابیاں بھی تھیں۔ ماہ نور کو بھابی سلمیٰ کے آنے کی امید نہ تھی کیوں کہ رحمٰن بھائی انہیں روک سکتے تھے مگر یہ عجوبہ ہو گیا تھا۔

کئی ماہ بعد ماں سے ملنے والی بیٹی کی آنکھوں نے ماں جی کے گلے لگتے ہی ساون کی جھڑی لگا دی تھی۔ یہی حال ماں جی کا تھا، وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھیں۔ فیض الحسن ایک طرف کھڑا سبھی کچھ دیکھ رہا تھا۔ ابھی قصرِ ماہ نور کے کسی بھی مکین نے اسے اپنے داماد کے طور پر تسلیم نہ کیا تھا۔ بہر حال پھر بھی وہ مانو کی خوشی میں خوش تھا۔ بھابیاں بھی مانو سے خوش ہو کر ملیں۔ زمان اور حنان اب بڑے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے پاؤں پر چل کر صحن میں کھیل کود میں مصروف ہو گئے تھے۔ مانو نے باری باری ان کا منہ چوما تو وہ حیرانگی سے بوا کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہ پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"اتنی دیر کیسے دور رہ لیا تم نے مانو؟" ماں جی نے بیٹی سے شکوہ کیا تو اس نے اپنے گھر کی مان مریادہ اور خاوند کی بے مثال محبت کی مثالیں دینا شروع کر دیں۔ ماں جی اب فیض الحسن کی طرف مڑیں تو وہ کچھ نروس ہو گیا۔

"تمہاری ذہانت اور سادگی کی میں پہلے دن سے ہی قائل ہو گئی تھی مگر تم اتنے ذہین اور سمجھدار ہو گے یہ میں سمجھ نہ سکی۔ ماں جی کے گلے لگ جاؤ فیض الحسن!" ماں جی نے یہ کہہ کر اپنی بانہیں کھول دیں اور وہ شرماتا ہوا ماں جی کے کندھوں پر سر رکھ کر ہنسنے لگا۔ "میں تمہیں اپنے داماد کے روپ میں قبول کرتی ہوں۔ مجھے کوئی گلہ نہیں ہے، میری بیٹی خوش ہے اور سکھوں کی زندگی گزار رہی ہے۔ بس یہی میرے لیے بہت بڑی خوشی ہے۔ مجھے زندگی سے اور کیا لینا ہے؟" وہ اب مانو کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"میرا نواسہ کہاں ہے؟ جس کو دیکھنے کے لیے میری دن رات کی بے قراری نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔" مانو اندر سے سوئے ہوئے مراد الحسن کو جگا کر لائی تو وہ نیند کے خمار میں آنکھیں ملتا ہوا نئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔

ماں جی اسے چوم چوم کر دیوانگی کی حدیں پار کر رہی تھیں۔ مانو کی آنکھیں موتیوں سے

چمکنے لگی تھیں۔ زمان اور حنان حیرانگی سے کبھی دادی اور کبھی نئے بچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بھابیاں بھی بظاہر خوش ہی نظر آ رہی تھیں۔

ماں جی اور عنایت بھائی بہت ساری مٹھائی لے کر آئے تھے۔ بہت سارے کھلونے اور بہت سے کپڑے تھے۔

''ماں جی! رحمٰن بھائی نہیں آئے؟''

''آئے گا! کیوں نہیں آئے گا۔ اس کے دل میں بھی بہن کے لیے تڑپ ہے مگر وہ اپنی جھوٹی انا اور ضد کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ تم دیکھنا ایک بار...... جا کر کہہ دو گی تو وہ ضرور تمہارے گھر آئے گا۔'' اچھے اور پُر تکلف ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ پھل اور دیگر لوازمات نے ماں جی اور بھابیوں کو یہ سمجھا دیا تھا کہ مانو اپنے گھر میں ٹھیک ٹھاک ہے۔ اچھا خاصا کھاتی پیتی ہے۔

ماں جی کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ فیض الحسن محنتی اور محبت کرنے والا شوہر ہے۔ بس ان کے دل سے کدورت نکل گئی تھی۔

اس سارے کھیل میں عنایت علی کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے بہت کچھ داؤ پر لگا کر مانو کی محبت اور نکاح سے لے کر اب خفگی اور صلح تک ایک ایسا کردار ادا کیا تھا جو ناقابلِ فراموش تھا۔

ماں جی تو مراد الحسن کو چوم چاٹ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں اور مراد بھی ان سے مانوس ہو گیا تھا۔

''اچھا مانو! کب آ رہی ہو؟'' سلمیٰ اور ممتاز بھابی نے پوچھا تو وہ فیض الحسن کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے کہ اجازت طلب کر رہی ہو، وہ سمجھ گیا اور بولا۔

''اب آپ لوگ آئے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بھی دل میں کوئی گلہ شکوہ نہیں رکھنا چاہیے ہم ان شاء اللہ اگلے ہفتے آئیں گے۔''

''اور مانو میرے پاس پورا ایک مہینہ رہے گی، یہ میری شرط ہے۔'' ماں جی نے کہا تو فیض الحسن ہنس کر بولا۔

''مانو تو مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ دو تین مہینے رہے گی۔'' ماں جی اس کی بات سن کر شرم سے خاموش ہو گئیں جب کہ مانو اس کی طرف آنکھیں نکال کر ہنسنے لگی۔

وہ لوگ جس طرح خوشی خوشی آئے تھے اسی طرح واپس بھی ہنسی خوشی چلے گئے۔

فیض الحسن مانو کو تنگ کر رہا تھا وہ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔

''مانو! ایک بات کہوں؟''

''فرمائیے حضور!''

''اگر رحمٰن بھائی نے تمہیں معاف نہ کیا اور مجھے اس رشتہ میں قبول نہ کیا تو.....؟'' فیض الحسن نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔

''تو......؟'' وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ''تو پھر آپ بتائیں مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

''نہیں مانو! جو بھی کرنا ہے تمہیں اپنی سمجھ اور دانش مندی سے کرنا ہے۔ بس مجھے تمہارا ہر فیصلہ دل و جان سے منظور ہو گا۔'' فیض الحسن اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

''میں اس گھر میں کبھی بھی نہیں رہوں گی جہاں میرے خاوند کی عزت نہ ہو۔''

''جذبات سے نہیں مانو! دل سے سوچو۔ وہ تمہارے بھائی ہیں، ماں جی ہیں، تمہارا گھر ہے، بہت سی یادیں، تمہارا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ابتدائی ایام اس آنگن میں گزرے ہیں۔ کیا تم سب کچھ ایک ڈرائیور کی خاطر چھوڑ دو گی؟'' وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا مگر مانو سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس کی سنجیدگی سے پتا چلتا تھا کہ وہ فیض الحسن سے کتنا پیار کرتی ہے۔

''میں اپنا سب کچھ آپ کے پیار میں پہلے ہی چھوڑ چکی ہوں۔ جو شخص اور جو گھرانہ آپ کی عزت نہیں کرے گا۔ میرا بھی اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔''

☆=====☆=====☆

ماہ نور اور فیض الحسن مراد کو ساتھ لے کر قصر ماہ نور کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ ماہ نور ''رخصتی'' کے بعد پہلی بار اس دہلیز کو پار کر رہی تھی۔ ماں جی نے تیل گرایا اور فیض الحسن کا ماتھا چوما تو اس نے اظہارِ تشکر سے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ مانو نے بھی فیض الحسن کی قدر ہوتے ہوئے دیکھی تو اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا۔

راجو اور ملکہ بھی ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ فیض الحسن اور ملکہ کی آنکھیں چار ہوئیں تو فیض الحسن نے آنکھ دبا کر ملکہ کو مزید جیلس کر دیا۔

مانو اور فیض الحسن کو سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ رحمٰن بھائی کام کے سلسلہ میں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی شام کو ہونے والی تھی۔ چائے پانی سے فراغت پا کر فیض الحسن اور مانو لان میں نکل آئے۔ وہ نرم نرم گھاس پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ فیض الحسن اسے چھیڑنے لگا۔

''یاد ہے مانو! جب تم نے مجھے پہلی بار اپنے پاس مس شمسہ کی زیادتی کا ازالہ کرنے

کے لیے بلوایا تھا تو تم اس جگہ کرسی پر بیٹھی چائے کا مگ تھام کر مجھے سر اونچا کر کے جینے کا سبق دے رہی تھیں۔''

''مجھے آپ کی ذات سے جڑا ہوا ایک ایک پل اور ایک ایک لفظ یاد ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

فیض الحسن اور ماہ نور اپنی بیتی باتوں کو یاد کر رہے تھے کہ ملکہ آ گئی۔

''ماہ نور بی بی! وہ آپ کا بیٹا جاگ گیا ہے، اسے بھوک لگی ہے، وہ رو رہا ہے۔''

مانو مراد الحسن کے رونے کا سن کر بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ اب فیض الحسن اور ملکہ رہ گئے تھے۔

''بڑے ظالم نکلے ہو!'' ملکہ نے فیض الحسن کی طرف تیر پھینکا۔

''تم پر تو کوئی ظلم نہیں کیا۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا تو وہ جل کر رہ گئی۔

''تبھی تو ظالم ہو۔'' وہ یہ کہہ کر پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔ فیض الحسن نے مالی چاچا کو دیکھا جو پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ اس نے قریب جا کر سلام کیا تو مالی چاچا حیرانگی سے فیض الحسن کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گلے لگ کر ملا مگر پھر فوراً ہی الگ ہو گیا۔ شاید اب وہ فیض الحسن کی حیثیت کا نہیں تھا یا پھر فیض الحسن کا درجہ بڑھ گیا تھا۔

مالی چاچا نے اسے مبارک دی اور بتایا کہ تمہارے بعد ملک رحمٰن نے تمام ملازموں کو نکال دیا تھا مگر مجھے' ملکہ اور راجو کو دوبارہ چند ماہ بعد بلوا لیا، یہ ان کی محبت ہے، وہ محل والوں کو دعائیں دینے لگا۔

ملک رحمٰن کی گاڑی آ کر رکی تو ان دونوں کا دل دھک سے رہ گیا۔ مانو نے اپنے بڑے بھائی کو دو سال بعد دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی ان دونوں کو لان میں دیکھ لیا تھا۔ ننھا مراد الحسن مانو سے چمٹا منہ میں انگلیاں ڈال کر کھیل رہا تھا۔

ملک رحمٰن ان پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اندر کی طرف چلے گئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

''فیض! ہمیں رحمٰن بھائی کے کمرے میں جا کر معذرت کرنی چاہیے۔'' مانو نے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آج تک میرے ساتھ ان کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے مگر پھر بھی تمہارا بڑا بھائی ہے اس لیے اگر تم چاہتی ہو کہ تم معذرت کرو اور یہ بھی جانتی ہو کہ وہ تمہاری بے عزتی نہیں کریں گے تو میں تمہارے ساتھ ان کے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہوں۔'' فیض الحسن نے

یہاں بھی ماہ نور کی بات کو اہمیت دی تھی۔

انہوں نے رحمٰن بھائی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو گونج دار آواز آئی۔

''دروازہ کھلا ہے مانو!'' مانو جانتی تھی کہ اس کے بھائی اس کے قدموں کی چاپ بھی پہچانتے ہیں مگر فیض الحسن حیران تھا۔ مانو پہلے اندر داخل ہوئی، پیچھے پیچھے فیض الحسن بھی تھا۔ وہ اس کمرے اور مانو کے کمرے میں کوئی خاص فرق نہ تلاش کر سکا۔ بس کارپٹ کا رنگ مختلف تھا۔ رحمٰن بھائی باہر کا نظارہ کرنے کے لیے کھڑکی میں کھڑے تھے۔

''بیٹھو مانو!'' ان کا چہرہ بدستور ان کی مخالف سمت تھا۔ فیض الحسن نے یہ بات بھی محسوس کی کہ ابھی تک رحمٰن بھائی نے صرف مانو کو ہی مخاطب کیا تھا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ مانو اپنے گھر میں پہلے جیسا مقام بنا لے۔ وہ دونوں رحمٰن بھائی کے کھڑے ہونے کی وجہ سے خود نہ بیٹھ سکتے تھے یہ احترام کا تقاضا تھا۔

وہ واپس گھومے تو ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مانو کی نظریں جھک گئی تھیں۔ انہوں نے فیض الحسن کی طرف مسکرا کر دیکھا تو وہ بھی حیرت کے ساتھ ساتھ زیر لب مسکرایا۔

''فیض الحسن!'' پہلی مرتبہ ان کی آواز اور لہجے میں شیرینی کا آمیزہ تھا۔ ''لباس اور حیثیت انسان کا سٹیٹس بدل دیتے ہیں۔ اب تم دیکھو، اس کمرے تک پہنچے ہو تو مانو تمہارے پہلو میں تمہاری مالکن نہیں تمہاری بیوی بن کر کھڑی ہے اور تم میرے سامنے ایک ایسے رشتے میں کھڑے ہو جس کا احترام میرے لیے واجب ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور فیض الحسن کی حیرت کی پروا کیے بغیر اسے گلے سے لگا لیا۔ مانو بھی اس یک دم تبدیلی پر انگشت بدنداں تھی۔

وہ بھی رحمٰن بھائی کے سینے سے لگ گئی۔ انہوں نے اسے پیار دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''تم نے کیسے سوچ لیا تھا کہ ہم تمہارے بغیر زندہ رہ لیں گے۔''

''مجھے معاف کر دیں رحمٰن بھائی!'' یہ کہہ کر مانو پھر ان کے گلے لگ گئی۔

''مانو! میری طرف دیکھو!'' انہوں نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بہن کا چہرہ ہاتھ سے اوپر کرتے ہوئے کہا۔

''تم واقعی ضدی ہو، تم جیت گئیں بابا اور ہم تمہارے پیار میں ہار گئے۔'' رحمٰن بھائی نے اعتراف کر کے اس کا مان بڑھا دیا تھا۔ فیض الحسن بھی خوش تھا کہ اب گھر کا ماحول بھی پراگندہ نہیں رہے گا۔ اچانک شور بلند ہوا تو سبھی لوگ ان کے کمرے میں گھس آئے اور تالیاں بجانے لگے۔ ان سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ بہت عرصہ بعد گھر میں خوشی آئی تھی۔

رات کا کھانا انہوں نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ اگلی صبح رحمٰن بھائی اور عنایت بھائی زمینوں پر چلے گئے اور فیض الحسن منڈی چلا گیا۔ اس نے صفدر حسین کو تمام داستان من وعن سنا دی۔ وہ بھی خوش ہوا کہ اس کے غریب چاچا کو قصرِ ماہ نور والوں نے اپنا داماد تسلیم کر لیا تھا۔

''چاچا! یار مجھے ایک بات کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔'' اس وقت وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے جب کہ مانو نے اپنے میکے ایک ماہ تک رہنا تھا۔

''ضرور تُو دور کی کوڑی لایا ہوگا۔ تُو ہے بھی ڈنگر، چل بول، کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ میرا قد تمہارے قد سے اونچا ہو گیا ہے۔ میری بات کی اہمیت کو سمجھا کرو۔''

صفدر حسین کا انداز ایسا تھا کہ فیض الحسن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''چاچا! مجھے اس بات کا کھٹکا ہے کہ ملک رحمٰن جتنا ٹیڑھا آدمی ہے۔ اس کا اتنی جلدی سیدھا ہو جانا اور پھر تم سے کوئی گلہ بھی نہ کرنا دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔''

''یہ جو بہن بھائیوں کے نازک رشتے ہوتے ہیں۔ ان میں خلوص چاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ جب ان کی چوٹ دل پر لگتی ہے تو ملک رحمٰن جیسے ٹیڑے بھی سیدھے ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو کوئی چکر نظر نہیں آیا۔'' فیض الحسن اسے سمجھا رہا تھا مگر وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

''آج کے دور میں پُرخلوص اور چاہت بھرا رشتہ صرف ''ماں'' کا ہوتا ہے۔ باقی سب ڈھونگ دکھاوا اور پیسے کے رشتے ہوتے ہیں۔ میرا دل انجانے سے خطرے سے ڈر رہا ہے۔ بس ذرا احتیاط ہی رہنا۔'' وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا جب کہ فیض الحسن اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وہ مجھ سے کیا چھین سکتا ہے ڈنگرا۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''تمہارا بچہ، تمہاری بیوی اور تمہاری زندگی!'' صفدر حسین کی بات نے فیض الحسن کو ایک زبردست جھٹکا دیا تھا۔ وہ سنجیدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اتنی گہری بات صفدر حسین کے ذہن میں کیسے آ گئی۔ یقیناً وہ بڑا ہو گیا تھا اس کا ذہن بھی زمانے کے ساتھ ساتھ حالات کی سنگینیوں سے نبرد آزما ہو کر وسعت پکڑ گیا تھا۔

فیض الحسن نے اسے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ اس کی آواز میں جو درد اور خوف تھا اس نے فیض الحسن کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆=====☆=====☆

فیض الحسن قصرِ ماہ نور کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ایک نئی گاڑی جو کہ سامان وغیرہ لوڈ کرنے کے لیے ڈالہ نما ہوتی ہے، لان میں کھڑی تھی۔ گھر کے سبھی افراد اس کے پاس ہی بیٹھے کرسیوں پر چائے وغیرہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فیض الحسن کو دیکھ کر ماہ نور مراد کو اٹھائے اس کی طرف بڑھی۔ اس نے مراد کو مانو کی گود سے لے کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی باپ کا ناک پکڑ لیتا اور کبھی مونچھوں کو پکڑ لیتا، پکا شرارتی بن گیا تھا۔

فیض الحسن مراد کو اٹھائے چلتا ہوا ان لوگوں کے پاس پہنچا اور سلام کیا۔ خالی کرسی پر بیٹھ کر وہ نئی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ ملک عبدالرحمٰن اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فیض الحسن کی نظروں میں پسندیدگی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ نیلے رنگ کی ڈاٹسن گاڑی اپنی شان کے ساتھ کھڑی تھی۔

فیض الحسن کو بھی ماہ نور نے چائے پیش کی تو سبھی لوگ چائے پینے میں مصروف ہو گئے ملک عبدالرحمٰن نے اپنا کپ ختم کر کے اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور ٹیبل پر رکھ دی۔

''فیض الحسن!'' سبھی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''میں نے ماہ نور کو شادی پر کوئی تحفہ نہیں دیا کیوں کہ جن حالات میں شادی ہوئی وہ دور میرے خاندان کے لیے اذیت کا دور تھا مگر اب سبھی تمہاری شادی کو دلی طور پر قبول کر کے اپنا اپنا تحفہ پیش کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب میں بھی دلی طور پر تم دونوں کی شادی کو قبول کرتے ہوئے اپنا حقیر سا تحفہ تمہاری نذر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گاڑی کی چابی فیض الحسن کی طرف بڑھا دی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ نئی گاڑی اس کے لیے ہوگی۔ اس نے مانو کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ فیض الحسن نے چابی رحمٰن بھائی کے ہاتھ سے لے لی تو تالیوں کی گونج سے لان میں مزید خوشگواری پھیل گئی۔

''مجھے مانو نے بتایا تھا کہ تم دوسرے شہر سے سبزی وغیرہ منگواتے ہو۔ اب کرایہ پر گاڑی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے'' وہ دوبارہ بولے تو فیض الحسن کو صفدر حسین یاد آ گیا جس نے سمجھ لیا تھا کہ ملک عبدالرحمٰن اچھا بندہ نہیں ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔

''میری طرف سے اپنا دل صاف کر لو فیض الحسن!'' رحمٰن بھائی نے اسے سوچوں میں غرق دیکھ کر کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرا تحفہ پسند آیا ہوگا؟''

''آپ نے خواہ مخواہ ہی تکلف کیا رحمٰن بھائی!'' اس نے پہلی مرتبہ ملک عبدالرحمٰن کو ان کے نام اور رشتے سے پکارا تھا۔

"بھائی بھی کہتے ہو اور غیریت بھی برتتے ہو۔" ان کے لہجے میں خلوص دیکھ کر وہ صفدر حسین کے شک اور شبہے کو جھٹلانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اب صفدر حسین اور فیض الحسن اپنی نیلے رنگ کی ڈاٹسن پر دوسرے شہروں سے سبزیاں لایا کرتے تھے۔ اپنی گاڑی ہونے کی بنا پر وہ دوسرے لوگوں سے پہلے منڈی پہنچ جاتے تھے اور اچھے خاصے پیسے کما لیتے تھے۔ اب تو صفدر حسین بھی گاڑی پر ہاتھ سیدھے کرنے لگا تھا۔ وہ بہت ذہین تھا اور جلد ہی گاڑی چلانا سیکھ لینا چاہتا تھا۔ فیض الحسن بھی اس پر اپنی توجہ صرف کرتا تھا۔

خان پور جو کہ ماہ نور کے اجداد کا گاؤں تھا۔ وہاں جانے کے لیے باقاعدہ ٹرین جاتی تھی مگر جنید کی شادی پر سبھی لوگوں نے اپنی گاڑیوں میں جانے کو ترجیح دی۔ ماہ نور اور فیض الحسن اپنی نیلی ڈاٹسن میں تیار تھے مگر رحمٰن بھائی نے کہا کہ یہ گاڑی اچھی نہیں لگے گی۔ اس لیے تم اپنی سابقہ گاڑی لے جاؤ مگر فیض الحسن نے انکار کر دیا تھا۔ سبھی راضی ہو گئے، ماہ نور سے شادی کرنے کے بعد اس کے خاندان میں پہلی شادی یا پہلا فنکشن تھا جس میں فیض الحسن بطور ماہ نور کے شوہر شامل ہونے جا رہا تھا۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ خان پور جا چکا تھا مگر تب ماہ نور اس کے پہلو میں اس کی محبت کے روپ میں تھی اور آج اس کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں بن کر اس کے پہلو کو مہکا رہی تھی۔

فیض الحسن نے صفدر حسین کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ چاچا کو رُخصت کیا تھا۔

قصرِ ماہ نور کے تمام لوگ اس شادی میں شامل ہونے کے لیے جا رہے تھے مگر پھر بھی صفدر حسین کے خدشات اپنی جگہ پر موجود تھے اس نے چاچا کو غور سے دیکھتے ہوئے آنکھوں میں نمی بھر کر رخصت کیا تو فیض الحسن "ڈنگر" کہہ کر چلا آیا۔

گاڑیاں اپنی منزل پر رواں دواں تھیں۔ سب سے آگے عنایت علی، پیچھے رحمٰن بھائی اور پھر ان کے پیچھے فیض الحسن اور ماہ نور مراد الحسن کے ساتھ اپنی گاڑی میں سفر پر رواں دواں تھے۔ رحمٰن بھائی نے عنایت علی کو بتا دیا تھا کہ راستے میں کس جگہ رُکنا ہے۔ تھوڑا سا کھانا کھانے کے بعد پھر آگے چلا جائے گا۔

رحمٰن بھائی کے کہنے کے مطابق گاڑیاں ایک کچے سے ہوٹل پر رک گئیں۔ ان کا کھانا مزیدار ہوتا ہے یہ رحمٰن بھائی نے بتایا تھا۔ ہوٹل پر رکھا ہوا ایک لڑکا جلدی سے گاڑیوں کو پانی مارنے لگا۔ وہ لوگ ہوٹل کی چھت جو کہ سرکیوں اور بانسوں کی مدد سے بنائی گئی تھی کے نیچے

چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ کھانا تیار ہو کر اور کھانے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہو گیا۔ گاڑیاں دوبارہ اپنی منزل کی جانب چل پڑیں۔ اب ترتیب بدل گئی تھی۔ سب سے آگے فیض الحسن اور پیچھے رحمٰن بھائی اور سب سے پیچھے عنایت علی ممتاز بھابی، زمان اور ماں جی کے ساتھ اپنی گاڑی میں آ رہے تھے۔

"مانو!" فیض الحسن سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔

"ہوں" مانو نے پچھلی سیٹ پر سوئے ہوئے مراد الحسن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے کبھی سوچا تھا کہ اس حیثیت سے میرے پہلو میں بیٹھ کر ایک بار پھر خان پور جاؤ گی؟"

"خان پور جانے کا کئی بار سوچا تھا مگر اس طرح نہیں۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ نہیں ہوتا اور جو ہوتا ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔"

"مانو! اگر زندگی کی راہوں میں کبھی بچھڑنے کا مقام آ جائے تو؟"

"سفر پر جا رہے ہیں، کوئی خیر کی بات کریں۔" وہ شوہر کو جھڑک کر بولی۔ فیض الحسن اس کی پیار بھری ڈانٹ سن کر مسکرانے لگا۔

ایک موڑ کاٹتے ہوئے فیض الحسن کو احساس ہوا کہ گاڑی کے بریک کام کرنا چھوڑ گئے ہیں۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے تو مانو بھی فکرمندی سے بولی۔

"کیا ہوا ہے؟ آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔" مگر فیض الحسن نے جواب دینے کی بجائے سامنے نظریں مرکوز رکھ کر ایکسیلیٹر سے پاؤں ہٹا لیا۔ اب گاڑی کی رفتار کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ سامنے کی طرف سے سنگل سڑک پر ٹریفک بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ اس نے مڑنے کا اشارہ دے کر انتہائی بائیں طرف گاڑی روک لی بلکہ خود ہی رک گئی۔ فیض الحسن کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ پچھلی دونوں گاڑیاں بھی رک گئیں۔

"فیض الحسن! کیا ہوا، گاڑی کیوں روک دی؟"

"گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ مانو کے ہوش اُڑ گئے۔ بخیریت رک جانے پر اس نے بے ساختہ آسمان کی طرف منہ کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

رحمٰن بھائی اور عنایت علی بھی پریشان ہو گئے تھے۔ ماں جی نے تو رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ انہوں نے مانو اور مراد کو چومنا شروع کر دیا تھا۔

"کچھ اللہ کے نام کا دیا ہی کام آ گیا ہے۔" رحمٰن بھائی کے منہ سے نکلا تو سب نے

''شکر الحمدللہ'' کہا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑے المناک حادثے سے انہیں بچالیا تھا۔ مانو تو سوچ کر ہی کانپ گئی۔ یہ فیض الحسن کی حاضر دماغی تھی کہ اس نے ریس پر پاؤں دبانے کی بجائے پاؤں اٹھالیا جس سے گاڑی کی رفتار آہستہ ہونا شروع ہوگئی اور وہ بالآخر رک گئی۔

اب وہ رحمٰن بھائی کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے خان پور جارہے تھے۔ خراب گاڑی وہیں کھڑی کردی گئی تھی کہ جنید کا کوئی ملازم آکر ٹھیک کروا کے لے جائے گا۔

خان پور پہنچنے کے بعد حویلی میں ان کا پُرتپاک استقبال کیا گیا مگر فیض الحسن اور ماہ نور کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ شادی والا گھر تھا، خوشیاں سبھی کے چہروں پر رقصاں تھیں مگر ماہ نور اور فیض الحسن اس ماحول میں خود کو غیر اور اجنبی محسوس کررہے تھے۔

تائی، چاچی اور کسی بھی کزن نے رسمی سلام دعا کے بعد انہیں پوچھا تک نہ تھا۔ جنید کئی مختلف بہانوں سے فیض الحسن کو گھور گیا تھا۔ غرض کہ ان کا آنا بے کار ثابت ہوا تھا۔ پوری شادی میں وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں فٹ قرار دیتے رہے۔

مہندی کی رات لڑکیاں ڈھولک بجارہی تھیں۔ مرد حضرات باہر چوپال میں جمع تھے۔ ڈنگر اور بکرے وغیرہ کسی دوسری جگہ پر باندھ دیے گئے تھے۔ چارپائیاں بچھائی گئی تھیں۔

فیض الحسن چلتا ہوا ایک چارپائی پر بیٹھا تو دوسرے مرد لوگ آہستہ آہستہ اس سے کترا کر نکل گئے۔ خواہ مخواہ ہی اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ یہی حال ماہ نور کا بھی تھا وہ ڈھولک بجانے کے لیے لڑکیوں کے پاس دری پر بیٹھی تو لڑکیاں آہستہ آہستہ اس سے کترا کر نکل گئیں۔ ماہ نور نے تو محسوس کیا ہی تھا مگر ماں جی نے بھی یہ رویہ مانو کے ساتھ دیکھا تو تڑپ کر رہ گئیں۔ انہوں نے مانو کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہ کر وقت گزارنے کی تلقین کی۔ اگلی صبح فیض الحسن اور جنید کی تکرار ہوگئی جس کا ڈر تھا وہ ہوگیا تھا۔

ہوا یوں کہ فیض الحسن مانو کو تلاش کرتا ہوا زنان خانے میں چلا گیا۔ جنید بھی وہیں گھوم رہا تھا۔ وہ فیض الحسن کو اس طرح اپنی عورتوں میں دیکھ کر تاؤ میں آگیا۔ فیض الحسن ماں جی کا داماد تھا۔ مگر ان کی نظروں میں وہ ملازم ہی تھا اور پھر جنید کے حق پر اس نے ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس کے غصہ میں آنے کی یہی وجہ تھی یا پھر وہ فیض الحسن کو ذلیل کرنے کا جواز ڈھونڈ رہا تھا۔

فیض الحسن نے جنید کی بہن سے مانو کے متعلق پوچھا تو وہ ہتھے سے ہی اُکھڑ گئی۔

''اپنی اوقات میں رہو، تم ملازم ہو، ملازم ہی رہو گے، مجھ سے بات کرنے کی تمہاری

جرأت کیسے ہوئی؟'' وہ چیخ چیخ کر بولنے لگی تو جنید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فیض الحسن کو گریبان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر پنڈال میں لے آیا۔

اس نے آتے ہی اونچی اونچی آواز میں بولنا شروع کردیا۔ فیض الحسن کا گریبان ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''حرامزادے! کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ تمہاری اوقات ہی کیا ہے کہ تم میری بہن کو چھوؤ۔'' فیض الحسن یہ الزام سن کر چکرا کر رہ گیا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے منہ ہی کھولنا چاہتا تھا کہ ایک زوردار گھونسا اس کی ناک پھاڑ گیا۔ وہ دور جا گرا، اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہوگیا تھا۔ سبھی عورتیں اور مرد بھی اکٹھے ہوگئے۔ رحمٰن بھائی اور عنایت علی انہیں چھڑا رہے تھے۔ ابھی تک فیض الحسن نے جوابی ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔

رحمٰن بھائی نے تھوڑی سی زبردستی کی تو جنید نے فیض الحسن کو چھوڑ دیا وہ آنکھوں سے انگارے برسا رہا تھا۔

''معاملہ کیا ہے، مجھے تو کچھ بتاؤ؟'' رحمٰن بھائی کی گونج دار آواز سن کر مانو بھی وہاں پہنچ گئی اس نے فیض الحسن کی ناک سے خون بہتا دیکھا تو گھبرا گئی۔ وہ بھاگ کر فیض الحسن کے پاس پہنچی۔ اس نے اپنا دوپٹا پھاڑ کر فیض الحسن کو دیا۔ وہ ناک سے خون صاف کرنے لگا۔ جنید کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''اس نے زلیخا کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ آپ نے اسے یہاں لاکر ہماری توہین کی ہے رحمٰن بھائی۔ یہ کم ذات لوگ اپنی ذات اور اوقات کبھی نہیں بھولتے۔ اسے کہہ دو ابھی جا کر زلیخا سے معافی مانگے۔'' فیض الحسن یہ سن کر مزید حیران ہوگیا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا وہ اپنی صفائی میں رحمٰن بھائی سے بولا۔

''میں نے کسی بھی لڑکی کو نہیں چھیڑا اور چھونا تو درکنار میں نے نظر اٹھا کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کون ہے؟ میں نے تو صرف اس لڑکی سے مانو کے متعلق پوچھا تھا۔ بس اتنی سی بات پر جنید صاحب بھڑک اٹھے۔''

''کتے کے بچے! بکواس بند کر۔ ابھی زلیخا سے معافی مانگ ورنہ گولی ماردوں گا۔'' جنید کے منہ سے گالی سن کر فیض الحسن کا خون کھولنے لگا۔

''اپنی زبان کو لگام دو جنید۔ اگر میرا ہاتھ اٹھ گیا تو تم تماشا بن جاؤ گے۔''

''تمہاری اتنی جرأت کہ تم میرے سامنے بکواس کرو۔'' جنید کا مزاج پھر گرم ہوگیا تھا مگر

رحمٰن بھائی نے اسے پکڑا ہوا تھا۔''

''تم خاموش رہو، مجھے بات کرنے دو۔'' انہوں نے جنید کو ڈانٹا تو وہ خاموش ہو گیا۔

''فیض الحسن! کیا جنید سچ کہہ رہا ہے۔'' رحمٰن بھائی کی آواز میں غصہ کا عنصر بتا رہا تھا کہ وہ اپنا بھی انتقام لینا چاہتے ہیں۔

''جو سچ تھا میں نے بتا دیا ہے رحمٰن بھائی! اگر وہ لڑکی میرے سامنے بھی آئے گی تو میں اسے پہچان نہ پاؤں گا کیوں کہ میری نظریں نیچی تھیں۔'' فیض الحسن نے اپنی صفائی پیش کی تو رحمٰن بھائی شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔

''جنید! فیض الحسن سچ کہہ رہا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' وہ جنید کی طرف مڑے اور معاملہ رفع دفع کروانے کے لیے جنید کو فیض الحسن سے معذرت کر کے گلے ملنے کا کہا مگر فیض الحسن نے انکار کر دیا۔ وہ ابھی وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ اس نے مانو کو چلنے کا کہا، مانو بھی اس کے فیصلے پر حیران تھی۔ وہ کبھی شوہر کو اور کبھی ماں جی اور رحمٰن بھائی کی طرف دیکھتی۔

''مانو! جیسا تمہارا شوہر کہہ رہا ہے ویسا ہی کرو۔ ہمیں تمہاری اور تمہارے خاوند کی خوشی عزیز ہے۔'' رحمٰن بھائی یہ کہہ کر اندر کی طرف چلے گئے اور فون پر کسی کو کچھ ہدایات دینے لگے۔

تماشہ ختم ہو گیا تھا، مجمع چھٹ گیا تھا۔ ماں جی اور مانو فیض الحسن کے ساتھ صحن میں کھڑی رہ گئی تھیں۔

''اپنا خیال رکھنا مانو، فیض الحسن! ہمیں مجبوری ہے بیٹا۔ ہم اس طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہیں جا سکتے کیوں کہ شریکے کا کام ہے۔'' ماں جی نے مانو اور فیض الحسن کو سمجھایا۔ وہ دونوں بھی خود کو اجنبی محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے یہ بہانہ بن گیا تھا۔ مانو نے تاعمر ان رشتہ داروں سے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا کر فیض الحسن کی بے عزتی کی تھی۔ گاڑی ٹھیک ہو کر رات کو ہی آ گئی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں مراد الحسن کو لے کر اس حویلی کی طرف تھوک کر چلی آئی۔

''میں شرمندہ ہوں مانو! میری وجہ سے تمہارا فنکشن خراب ہو گیا۔'' فیض الحسن گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بولا تو مانو نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''جہاں آپ کی عزت نہیں ہو گی، میں دوبارہ کبھی بھی وہاں نہیں جاؤں گی۔ چاہے وہ قصرِ ماہ نور ہی کیوں نہ ہو۔'' وہ چاہت سے لبریز لہجہ فیض الحسن کو بڑا پیارا لگا۔

''مانو! رحمٰن بھائی نے میری بات پر یقین کیسے کر لیا؟'' فیض الحسن حیرانگی سے بولا۔

''سچ اور جھوٹ کا پتا بات کرنے والے کے منہ اور انداز سے ہو جاتا ہے اور رحمٰن بھائی نے دنیا دیکھی ہے۔ اسی لیے انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔''

''میرا خیال ہے کہ جنید نے تمہاری وجہ سے مجھ پر گھٹیا الزام لگا کر بدلہ لینے کی بھونڈی سی کوشش کی ہے۔''

''ہاں! ایسا ہی کچھ ہے۔'' مراد الحسن اس کی گود میں سو گیا تھا۔ اس نے بمشکل اسے پچھلی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔

''مانو! کیا تمہیں یقین ہے کہ میں اس تمام معاملے میں سچا ہوں؟'' فیض الحسن نے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

''اپنی تعریف سننا چاہتے ہو؟''

''نہیں تمہارا اعتماد جانچنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے تو مرنے کے بعد جی اٹھنے پر جس طرح یقین ہے بالکل اسی طرح تمہاری ذات اور تمہاری زبان پر یقین اور اعتماد ہے۔''

''شکریہ مانو!'' فیض الحسن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دبایا تو وہ مسکرانے لگی۔

اسی اثناء میں گاڑی نے ایک جھٹکا کھایا اور اگلا ٹائر نکل کر گاڑی سے آگے نکل گیا۔ مانو کی چیخ نکل گئی۔ فیض الحسن گاڑی کو کنٹرول کرنے لگا مگر موت نے ان پر اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ گاڑی ایک طرف گہری کھائی میں جانے لگی، ایک اور جھٹکا لگا۔ مانو کی طرف کا دروازہ کھلا اور وہ دروازے سے باہر لڑھک گئی۔ چیختی چلاتی مانو سڑک پر گر گئی۔ وہ کئی گز تک سڑک پر رُلتی ہوئی لڑھکتی گئی۔ گاڑی فیض الحسن کے قابو سے باہر ہو کر نیچے کھائی میں جا گری۔ کئی قلابازیاں کھاتی ہوئی گاڑی ایک زوردار دھماکے سے نیچے بہنے والے دریا کے کنارے گر گئی جب کہ مانو کو سڑک پر چلنے والی ٹریفک نے کچلنے سے بچایا تھا۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ کسی اللہ کے بندے نے اسے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا، وہ بے ہوش تھی۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک دھماکے سے پھٹ گئی۔ اس کی ٹینکی سے نکلنے والا تیل آگ پکڑ چکا تھا۔ پتا نہیں اب اس کے اندر موجود دو انسانوں کا کیا ہوا ہو گا۔

☆=====☆=====☆

صفدر حسین ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں وحشت برسا رہی تھیں۔ وہ کئی دنوں سے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ اب بھی اسی خواب

سے چونکا تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور گھڑی کی طرف دیکھا تو منڈی کا وقت ہو گیا تھا اس نے نماز پڑھی اور گھر کو تالہ لگایا اور منڈی چل پڑا۔

سودا بیچنے کے بعد اس نے اپنی بے چینی اور بے قراری کو چین دینے کے لیے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور واپسی ویگن میں سوار ہو کر گھر کی راہ لی، اس کی طبیعت بے چین اور دل بے قرار تھا مگر کوئی بھی معاملہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ قصرِ ماہ نور جا کر فیض الحسن کا پتا کروائے گا وہ خیریت سے بھی ہے یا نہیں؟ وہ گھر پہنچ کر کپڑے تبدیل کر کے قصرِ ماہ نور پہنچا تو حیران رہ گیا۔ لوگ وہاں ایمبولینس سے سٹریچر پر دو لاشیں رکھی ہوئی نکال رہے تھے، بہت سے لوگ جمع تھے، آہ و بکا پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے مجمع چیرتے ہوئے آگے بڑھ کر دیکھا تو سٹریچر پر ایک ننھی منی لاش اور دوسری جوان مرد کی جلی ہوئی لاش تھی۔ ملک عبدالرحمٰن اور ملک عنایت علی بین کر رہے تھے۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''چاچا...... ! مراد الحسن!'' اس نے اپنے ذہن میں آنے والے خیال کو جھٹکا دیا۔ اس نے اپنے فاسق خیال کی تصدیق عنایت علی سے چاہی۔ وہ صفدر حسین کو دیکھ کر مزید دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''صفدر حسین! تمہارا چاچا!'' عنایت علی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ صفدر حسین تڑپنے لگا۔ لوگ اس کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگے، وہ فیض الحسن کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ وہ لاش کا چہرہ دیوانہ وار چوم رہا تھا۔ لوگ اسے پکڑ پکڑ کر دور ہٹاتے اور وہ پھر سٹریچر پر پڑی لاش سے لپٹ جاتا، اک حشر برپا تھا۔

صفدر حسین نے پہلی مرتبہ اتنے عظیم الشان محل کو دیکھا تھا۔ اس محل میں اس کا چاچا ڈرائیور تھا۔ پھر ترقی ہوئی داماد بن گیا اور اب تمام ترقیوں سے بے نیاز وہ ایک لاش بن گیا تھا۔ لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ محل کے لان میں لاشوں کو رکھ دیا گیا تھا۔ صفدر حسین کو ماہ نور کہیں نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا کبھی باہر اور کبھی اندر لان میں چلا جاتا تھا۔ اس نے عنایت بھائی سے مانو چاچی کا پوچھنا چاہا تو وہ اسے گلے لگا کر مزید رونے لگے۔

صفدر حسین کا وہم ایک خوفناک حقیقت کا روپ دھارنے لگا تھا۔ عنایت بھائی کا رونا اسے ایک مرتبہ پھر یتیم ہو جانے کی خبر دے رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئلے کی طرح جلا ہوا جو

ناقابلِ شناخت وجود رکھا تھا، وہ اس کا چاچا فیض الحسن تھا، اس کا سینہ غم سے پھٹنے لگا۔

''مانو ابھی تک بے ہوش ہے، وہ ہاسپٹل میں ہے، اسے کچھ پتا نہیں کہ اس کی دنیا لٹ گئی ہے۔'' عنایت علی نے آہوں اور سسکیوں کی زبان میں صفدر حسین کو بتایا۔ ''میری لاڈلی مانو آج بیوہ ہو گئی ہے، اس کی گود بھی اجڑ گئی ہے۔'' عنایت علی کی حالت سب سے ابتر ہو رہی تھی اور صفدر حسین تو بے چارہ ان امیر لوگوں کے گلے سے لگ کر بھی نہیں رو سکتا تھا۔

اس کا کوئی سہارا نہ تھا۔ وہ بے چارہ دیواروں سے گلے شکوے کر رہا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر وہ آہ و بکا کرنے لگتا تھا۔ اس کی دھاڑیں سن کر پتھر دل بھی پگھلنے لگے تھے۔

''یہ نوجوان کون ہے جو اس طرح بین کر رہا ہے؟'' رحمٰن بھائی نے عنایت علی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ منظر علی کا بیٹا اور فیض الحسن کا بھتیجا ہے۔ تب رحمٰن بھائی نے صفدر حسین کو اپنے گلے سے لگا کر پیار کیا اور روتی ہوئی آنکھوں سے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

وہاں موجود ہر آنکھ اشکبار تھی مگر ماہ نور تمام دکھوں اور اس بات سے بے نیاز کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے ہسپتال کے بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹروں نے سر توڑ کوششوں کے بعد اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے بازو کی ہڈی دو جگہ سے فریکچر ہو گئی تھی۔ اس کے سر میں چھوٹے بڑے مجموعی طور پر بیس بائیس زخم آئے تھے۔ اس کے بال کاٹ کر ڈاکٹرز نے ٹانکے لگائے تھے۔ ملک رحمٰن کو خان پور میں اطلاع ان کے جاننے والے نے دی تھی۔ جو اس دن اسی روڈ پر اپنی گاڑی میں آ رہا تھا۔ اس نے مانو کو پہچان لیا تھا۔ قصرِ ماہ نور میں رابطہ کرنے پر مالی بابا نے خان پور کا پتا بتا دیا تھا۔

اس طرح وہ تمام لوگ جنید کی شادی درمیان میں ہی چھوڑ کر بھاگم بھاگ پہنچے تھے۔ تب تک لوگوں نے ماہ نور کو ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ ان لوگوں نے پولیس کی مدد سے فیض الحسن اور مراد کی لاشیں دوسرے دن ڈھونڈ لی تھیں۔ رحمٰن بھائی نے اتفاقی حادثہ قرار دے کر پولیس کیس سے جان چھڑوالی تھی۔ خواہ مخواہ ہی پولیس کی کارروائیوں میں پڑ کر وقت برباد کرنے والی بات تھی۔

نمازِ جنازہ کے بعد جب فیض الحسن کی میت کو قبر میں ڈالنے کا وقت آیا تو صفدر حسین کو ایک بار پھر منظر علی یاد آ گیا۔ اس کی آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے آنسو فیض الحسن کے کفن کو بھگو رہے تھے، لوگوں کے دلاسہ دینے پر وہ کچھ خاموش ہوا۔

میتوں کو دفنانے کے بعد فاتحہ خوانی ہوئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ صفدر

حسین نے اپنے محلّہ کی مساجد میں بھی اعلان کروا دیے تھے۔ اس کے گھر کے باہر بھی لوگ دریاں بچھا کر بیٹھ گئے تقریباً تین سال پہلے والا وقت اس پر پھر آ گیا تھا۔ منظر علی کے بعد فیض الحسن کی موت نے اسے ایک بار پھر اکیلا کر دیا تھا۔ اب تمام کاروبار اس کو سنبھالنا تھا۔ وہ اب اچھا خاصا جوان ہو گیا تھا۔ اس کی بانہیں ہر طرح کا بوجھ اٹھا سکتی تھیں مگر ان اموات نے اس کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔

حالات اپنے معمول پر آتے جا رہے تھے۔ وہ دو مرتبہ قصرِ ماہ نور گیا تھا۔ ایک مرتبہ ماہ نور سو رہی ہے کہہ کر اسے ٹرخا دیا گیا اور دوسری مرتبہ کہا گیا کہ چیک اَپ کروانے ہسپتال گئی ہے۔ وہ انتظار کر کر کے آ گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

ماہ نور کو ہوش آیا تو اس کے ذہن میں محفوظ رہ جانے والا آخری منظر وہ تھا جب وہ گاڑی سے باہر گری تو لڑھکتے ہوئے اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے گہری کھائی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے یاد آ گیا، وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی مگر تکلیف کی شدت اور سر پر زیادہ چوٹیں آنے کی وجہ سے وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ ماں جی اس کی دیکھ بھال کے لیے دن رات اس کے پاس تھیں۔

اگلے دن مانو کو ہوش آیا تو وہ گم صم ہو کر بیٹھ رہی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا ننھا منا ہنستا کھیلتا مراد الحسن گھوم گیا وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کے دل نے تیز تیز دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ ممتا وہ چیخنے لگی تھی مگر اس کی پکار ایک ماں ہی سن سکتی تھی۔ سہاگن کو اپنا سہاگ یاد آیا تو فوراً جیون کی راہوں میں ساتھ چلنے والے فیض الحسن کا خیال روح کو تڑپا گیا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے اس کا وجود کانپنے لگا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں تیز تیز حرکت کرنے لگیں۔ وہ چیخنا چلانا چاہتی تھی مگر کچھ نہ بول سکی۔ الفاظ، جذبات حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ماں جی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں تو ڈاکٹر کو بلانے چلی گئیں۔ واپسی پر ماہ نور کو بیڈ سے نیچے گرے ہوئے پایا تو ماں جی کی چیخ نکل گئی۔ ڈاکٹرز نے سٹاف کی مدد سے ماہ نور کو دوبارہ بیڈ پر لٹایا اور انجکشن دینے لگے۔ عنایت بھائی بھی آ گئے تھے، وہ بھی مانو کی اس حالت سے پریشان ہو گئے تھے۔ مانو اب پُرسکون ہو گئی تھی مگر اس کا دماغ بوجھل ہونے لگا تھا۔ جس سے اس کی آنکھیں بھی بند ہونے لگی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بے دم ہو کر سو گئی۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ عنایت علی نے کچھ سننے کی کوشش کی مگر بے سود رہے۔

مانو کو ابھی تک فیض الحسن اور مراد کی اموات کا نہ بتایا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹروں کی حکمتِ عملی تھی۔ اس واقعہ کو نو دن بیت گئے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے لگی تھی۔ ٹیکوں اور دوائیوں کی وجہ سے اس کی توانائی بحال ہو گئی تھی مگر اس کا ذہن اور خیال مراد اور فیض الحسن میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے ''مراد'' کا نام لیا تو عنایت علی نے ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق اسے آہستہ سے بیڈ سے اتارا، ماں جی اس کے ساتھ تھیں، ان کی آنکھوں نے برسات لگا دی تھی، ماہ نور حیرانگی سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی باہر گاڑی تک پہنچی تھیں۔ وہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو عنایت علی نے گاڑی سٹارٹ کی تو وہ بول پڑی۔

''ہم...... کہاں...... جا رہے...... ہیں؟'' وہ کوئی بھی فقرہ پوری طرح ادا نہ کر سکتی تھی۔

''ہم فیض الحسن اور مراد الحسن سے ملنے جا رہے ہیں۔'' عنایت علی کا جواب سن کر اس کے لبوں پر مسکان اور چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔

مگر گاڑی نہ ہی قصرِ ماہ نور کی طرف مڑی تھی اور نہ ہی صفدر حسین کے گھر کی طرف۔ یہ راستہ تو قبرستان کی طرف جاتا تھا۔ وہ چونک کر عنایت بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر وہ کوئی بھی اذیت ناک اندازہ نہ لگا سکی۔ اس کا دل انجانے خوف سے کانپ کر رہ گیا تھا۔ گاڑی قبرستان کے گیٹ پر رک گئی۔ عنایت بھائی نے حیرت واستعجاب کے سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی مانو کو بازو پکڑ کر گاڑی سے اتارا تو وہ ماں جی اور عنایت بھائی کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔

اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ چلتی ہوئی قبروں کے بیچوں بیچ پہنچ کر رک گئی تو عنایت بھائی نے انگلی کی جانب سے دو قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ جن میں ایک بڑی اور ایک چھوٹی قبر تھی۔ دونوں پر ہی نئے کتبے لگے ہوئے تھے۔ تازہ قبروں سے مشک کافور اور اگربتیوں کی مہک اٹھ رہی تھی۔ ایک قبر پر ایک نوجوان سر جھکائے بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ ان کی آمد سے بے خبر لگ رہا تھا۔

مانو نے کتبے پڑھ کر ایک ہولناک چیخ ماری تو قبرستان میں درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی خوف سے اُڑ گئے۔ فیض الحسن کی قبر پر رونے والا نوجوان بھی تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ مانو نے اسے پہچان لیا تھا، وہ صفدر حسین تھا اور صفدر حسین بھی چاچی کو دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ مانو اپنی حالت کی پرواہ کیے بغیر قبروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ صفدر حسین نے اسے پکڑنا چاہا مگر عنایت علی نے منع کر دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈاکٹروں نے کہا ہوگا کہ وہ کھل کر رو لے ورنہ اس کی ذہنی رو بہکنے کا خطرہ تھا۔

وہ کبھی مراد کی قبر سے لپٹتی اور کبھی فیض الحسن کی قبر سے لپٹتی تھی۔ اس کے بَین سن کر قبروں پر لگے ہوئے پتھروں کے بھی آنسو نکل پڑے ہوں گے۔

”فیض الحسن!“ وہ قبر میں گہری نیند سوئے ہوئے اس فیض الحسن کو پکار رہی تھی جو منوں مٹی تلے سو گیا تھا۔ ”ایک بار اٹھو! مجھے ایک بار آواز دو! مجھے ایک بار پکارو فیض الحسن! میں تمہیں بے وفائی نہیں کرنے دوں گی، اکیلے ہی کیسے چلے گئے ہو؟ مجھے ساتھ لے چلو، مجھے ساتھ لے جاؤ۔“ پھر وہ مراد کی قبر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”بیٹا! دیکھو ماما آئی ہیں۔“ ماں جی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا تو وہ ان کے ہاتھ کو جھٹک کر پھر سے قبر سے لپٹ گئی۔ ”میرے بچے کو بھوک لگی ہے، جاؤ تم لوگ چلے جاؤ یہاں، میرا مراد رو رہا ہے، میرا مراد رو رہا ہے۔“ وہ ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ عنایت علی کو ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں یہ اپنا ذہنی توازن ہی نہ کھو دے لیکن اس کے اندازے کی اگلے ہی لحہ نفی ہو گئی تھی۔ ماہ نور صفدر حسین کو اس کا نام پکار کر بلا رہی تھی۔ وہ بھی ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔

”صفدر حسین! اپنے چاچا کو آواز دو، وہ تمہارا دوست ہے۔ اسے ایک بار پکارو تو سہی وہ ضرور سنے گا، اسے کہو تو سہی، وہ مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتا۔ باتیں کیوں نہیں کرتا۔“ ماہ نو کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی جب دل کا غبار اچھی طرح ہلکا ہو گیا تو وہ پُرسکون ہو کر قبر پر بیٹھ گئی۔

اس کا عشق، اس کی محبت ادھوری ہی رہی تھی۔ اس قبر کی منوں مٹی تلے اس کا شوہر اپنی چاہت اور محبت بھرے جذبوں کو اپنے دل میں لے کر دفن ہو گیا تھا اور مراد...... وہ تو ایسا پھول تھا جو ابھی اپنی لطافت بھی نہ پا سکا تھا۔

دنیا میں کچھ بھی ہو جائے، وقت کبھی نہیں رکتا۔ نہ ہی کوئی مرنے والوں کے ساتھ مر جاتا ہے۔ وقت کا دھارا اپنی مخصوص رفتار سے بہتا رہا۔ ماہ نور کے ہونٹوں کی ہنسی چھن گئی تھی۔ ماں جی اس کی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتی تھیں۔ رحمٰن بھائی اپنے اپنے کاموں میں مگن ہو گئے تھے مگر بہن کی طرف دیکھ کر عنایت علی کا دل لرز جاتا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر ہر وقت سرونٹ کوارٹر کی طرف دیکھتی رہتی تھی یا پھر مراد الحسن کے کپڑوں اور فیڈر کو چوم چوم کر رونے لگتی تھی۔ وہ گھر میں کسی سے بھی بات نہ کرتی تھی۔ بس خاموش تماشائی بن کر قدرت کے کھیل دیکھتی رہتی۔ دونوں بھابیوں کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورت بیٹیوں سے نوازا تھا۔ عنایت علی کی بیٹی کا نام ”ماہم“ اور رحمٰن بھائی کی بیٹی کا نام ”حوریہ“ رکھا گیا۔ زمان اور حنان بہنوں سے کھیل کر دل بہلانے لگے۔ ان بچوں کو جیتے جاگتے کھلونے مل گئے تھے مگر ماہ نور کی گود

سُونی ہو گئی تھی۔ اس کے سر کا تاج اور دل کا سکون ظالم تقدیر نے چھین لیا تھا۔

صفدر حسین نے منڈی کا کام چھوڑ دیا تھا کیوں کہ وہ اتنا بڑا کاروبار چاچے کے بغیر سنبھال نہیں پایا اور پھر منڈی کے ہر کونے سے ہر شخص میں اسے فیض الحسن کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس نے باپ کی طرح اسٹیج پر نوکری کر لی تھی۔ گھر کا خرچہ اچھا خاصا چل جاتا تھا مگر وہ اس کام سے مطمئن نہ تھا۔ وہ اپنی محرومیوں کا بدلہ اس زمانے سے لینا چاہتا تھا حالانکہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں اس زمانے کا کوئی دوش نہ تھا۔

مگر صفدر حسین کچھ ایسا کرنے کے موڈ میں تھا کہ دنیا ایک بار تو اس کا نام یاد رکھے اور وہ اس کاروباری زندگی سے بھی بور ہو گیا تھا۔ وہ زندگی میں ایڈونچر بھرنا چاہتا تھا۔ اس نے تو اب باقاعدہ آخری شو بھی دیکھنے شروع کر دیے تھے اب کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

وہ اپنے فن کی قدر کروانا چاہتا تھا۔ ”کس سے؟“ یہ وہ نہیں جانتا تھا مگر اس کے اندر اک آگ بھڑک رہی تھی جو اسے مجبور کر رہی تھی کہ صفدر حسین کچھ ایسا کرو جس سے روپیہ پیسہ تمہارے گھر کی باندی بن کر رہے اور تم عیش کرو مگر ایسا کیا کرے؟ انہی سوچوں میں دن گزرنے لگے۔

ایک دن ایک رائٹر نے سکرپٹ میں اس کا کردار لکھا کہ وہ عورت کے روپ میں بنک میں ڈکیتیاں کر کے بہت بڑا امیر بن جاتا ہے۔ صفدر حسین نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس کردار میں حقیقت کا رنگ بھر دیا مگر پیسے اتنے کم ملے کہ اس کا گزارا مشکل ہو گیا کیوں کہ اب شراب اور شباب کا خرچہ بھی پورا کرنا تھا۔ اس نے اسی کردار کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ایک پستول بھی خرید لیا۔ کئی دنوں کی محنت اور پستول چلانے کی ٹریننگ لینے کے بعد اس نے اپنا پہلا مشن مکمل کرنے کی ٹھان لی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ جان ہتھیلی پر لیے وہ اپنی مطلوبہ برانچ میں پہنچا تھا۔ اس نے خوبصورت عورت کا گیٹ اَپ کیا ہوا تھا۔ ایک بار تو جوان مردوں کی نظریں اس کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ دور ایسا نہ تھا کہ عورتیں ٹراؤزر اور شارٹ شرٹس پہنتی تھیں۔ پرانا دور تھا اس نے بھی روایتی عورتوں کی طرح شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ وہ بنک میں داخل ہونے لگا تو باہر کھڑے گن مین نے اس کی طرف دیکھا اور نگاہ ہٹا لی مگر صفدر حسین نے نوٹ کر لیا تھا کہ ایک ہی گن مین ہے جس کے پاس اسلحہ بھی بس ایسا تھا جو ہماری پولیس کو ”کارروائی“ پوری کرنے

کے لیے دیا جاتا ہے۔ وہ لرزتے قدموں اور تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس کی خوش قسمتی سے اندر کوئی گن مین نہ تھا۔ اس نے ایک نظر میں ہی جائزہ لے لیا تھا کہ کام آسانی سے ہو جائے گا کیوں کہ بنک میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔

ایک ماڈرن خاتون کو بنک میں داخل ہوتا دیکھ کر افسران کے منہ میں پانی تو بھر آیا مگر وہ اپنی ڈیوٹی پر مامور تھے۔ وہ چلتا ہوا منیجر کے پاس پہنچا اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے استاد اور باپ منظر علی کی سکھلائی ہوئی تراکیب کے مطابق عورتوں کی آوازوں میں بولا۔ ''مجھے کیشیئر صاحب سے ملنا ہے۔''

منیجر خاتون کو دیکھ کر نروس تو ہوا مگر دفتری تقاضے بھی پورے کرنے تھے۔ وہ کرسی سے آگے کی طرف ہوتا ہوا بولا۔

''جی فرمایئے! بنک آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔''

''میں نے اکاؤنٹ شروع کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ کیشیئر صاحب سے مل لیں، آپ یہ فارم لے لیں وہ آپ کی رہنمائی کریں گے۔'' منیجر خوش اخلاقی سے بولا۔

''جی شکریہ'' صفدر حسین نے فارم لیا اور کیشیئر کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ صفدر حسین نے کیشیئر کے سامنے فارم رکھا اسے دیکھ کر کاروباری مسکان لبوں پر لانے کے بعد ایک بار پھر نوٹ گننے میں مصروف ہو گیا۔ اتنی دیر میں صفدر نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک تھیلا نکالا اور پسٹل نکال کر کیشیئر پر تان لیا۔ یہ اس کی پہلی واردات تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے مگر اس جگہ سُستی دکھانے کا مطلب تھا اپنی موت۔ اس نے تھیلا کیشیئر کی طرف بڑھاتے ہوئے سبھی کیش اس میں ڈالنے کا کہا تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہو کر منیجر کی طرف دیکھنے لگا۔ صفدر نے پستول اس پر سے ہٹا کر منیجر کے پاس جا کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''اگر کوئی چالاکی کی تو گولی مار کر بھیجہ باہر نکال دوں گی۔'' اس نے زنانہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''میں دس تک گنوں گی تمام کیش اس تھیلے میں بند کر کے میری طرف اچھال دو۔ اگر نہیں تو پھر تمہارا منیجر ختم اور پھر تمہاری باری آئے گی۔''

بنک میں موجود صارفین گھبرا کر ایک جگہ دبک گئے تھے۔ پستول دیکھ کر سب کی روح فنا ہو گئی تھی۔ کیشیئر نے صفدر حسین کے حکم کی تعمیل کی اور کیش تھیلے میں ڈال کر صفدر حسین کی

طرف اچھال دیا۔ وہ تھیلا کیچ کرتا ہوا چھت کی جانب ہوائی فائر کرنے لگا۔ فائرنگ کی آواز سن کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ گارڈ جلدی سے اندر داخل ہوا تو صفدر حسین جو کہ دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے گن مین کو دھکا دے کر گرایا اور اس کی بندوق چھین کر باہر نکلنے لگا کہ یک دم کوئی سخت ٹھوس چیز اس کی کھوپڑی سے ٹکرائی وہ کراہ کر رہ گیا مگر یہ موقع تکلیف کو سہہ جانے کا تھا۔ بنک منیجر نے پیپر ویٹ اٹھا کر تاک کر اس کی کھوپڑی پر مارا تھا جو کہ ٹھیک نشانے پر لگا تھا مگر صفدر حسین کامیاب واردات کر کے باہر نکل چکا تھا۔ اس نے باہر سے گیٹ بند کر کے بنک بند کر دیا تھا۔ اس کا سر چوٹ کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا بنک کے سامنے والی گلی سے نکل کر مین روڈ پر آ کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اس نے کیش والے تھیلے کو بے اختیار چوم لیا تھا۔ اس کی پہلی ہی واردات کامیاب ہو گئی تھی مگر سر پر چوٹ کا نشان دے گئی تھی۔ اس نے ٹیکسی کو رکوایا، جیب سے کرایہ ادا کر کے سڑک کے دوسری طرف جا کر ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اس طرح مختلف علاقوں اور مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا وہ اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس نے تمام نوٹ بیڈ پر ڈھیر کر دیے وہ انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہونے لگا۔

اس نے نوٹ گننے شروع کر دیے۔ ساری زندگی میں کبھی بھی اتنے نوٹ ایک ساتھ نہ دیکھے تھے۔ اس لیے وہ پہلے تو گھبرا گیا مگر پھر حوصلہ ہوا کہ یہ تمام رقم اپنی ''محنت'' کی ہے تو وہ گننے لگا۔ پورے تو نہ گن سکا تھا کیوں کہ وہ تھک گیا تھا۔ سانس لے کر گنے تو تقریباً گیارہ لاکھ روپے تھے۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمائی تھی۔ اتنی بڑی رقم اس نے سوچا کہ وہ چاہے تو تمام عمر بیٹھ کر بنا کمائے ہی کھاتا رہے تو یہ دولت ختم نہ ہو گی۔

مگر کنویں کی مٹی کنویں کو ہی لگتی ہے جب حرام کی دولت گھر آ جاتی ہے تو خرچے بھی ناجائز نکل آتے ہیں۔ اس نے شراب اور شباب کے لیے دولت کی گڈیاں بنا کر رکھ لی تھیں۔ اتنی ساری رقم کو سنبھالنا بھی مسئلہ تھا مگر اس کے گھر میں کون آنے والا تھا؟

☆=====☆=====☆

فیض الحسن اور مراد کی اموات کو ایک سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ماہ نور کی آنکھیں ابھی بھی انہی راستوں پر لگی ہوئی تھیں جن سے کبھی فیض الحسن آتا تھا مگر جانے والے کبھی نہیں آیا کرتے۔ اس ایک سال میں وہ کئی مرتبہ ان کی قبروں پر جا کر فاتحہ خوانی کر آئی تھی۔ ماں جی اور رحمٰن بھائی کو اس کی فکر ہونے لگی تھی۔ اب بھی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی لان میں بیٹھے ہوئے رحمٰن بھائی، ماں جی اور عنایت بھائی کو دیکھ رہی تھی۔

ملکہ اس کے لیے چائے کا مگ رکھ کر جا چکی تھی۔ ماہ نور نے چھوٹے چھوٹے سپ لینے شروع کر دیے تھے۔ پرندوں کی قطاریں اپنے گھروں کو جا رہی تھیں۔ موسم ٹھنڈا اور خوشگوار ہو رہا تھا مگر مانو کے لیے قدرت کے یہ نظارے اور موسم سب کچھ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی نظروں میں ان قدرتی مناظر اور موسموں کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ اس نے گذشتہ ایک سال سے کبھی بھی موسم سے لطف اندوز ہونے کی کوشش نہ کی تھی اور نہ ہی کبھی پرندوں کی قطاروں سے گفتگو کرنے کی کوشش کی تھی بس اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

''ماں جی! اگر آپ کہیں تو مانو کی شادی کر دیں۔'' رحمٰن بھائی کی بات نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ عنایت علی کے ہاتھوں سے کپ گرتے گرتے بچا تھا۔ رحمٰن بھائی نے ان کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ماں جی کے ماتھے پر بھی پریشانی کی لکیریں تھیں۔

''مجھ سے بھی مانو کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ اس کی شادی کر دی جائے تا کہ وہ اپنے دل کو بہلا کر فیض الحسن اور مراد کی موت کو بھول سکے۔'' ماں جی نے کہا تو عنایت علی ان کا منہ دیکھ کر رہ گئے کیوں کہ انہیں پتا تھا کہ مانو کسی طور بھی نہ مانے گی۔

ماں جی کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ مانو سے بات کریں۔

اس وقت مانو کے کمرے میں ماں جی اور مانو کے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا۔

''مانو!'' ماں جی بات شروع کرنے سے پہلے الفاظ کا ذخیرہ جمع کر کے لائی تھیں مگر بیٹی کا افسردگی اور غم سے ستا ہوا چہرہ دیکھ کر ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ پھر بھی بات تو کرنی تھی، مانو بدستور بیڈ پر بیٹھی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی مگر ماں جی کی بات سن رہی تھی۔

''جیون ساتھی کے بغیر زندگی انتہائی کٹھن اور دشوار ہو جاتی ہے۔'' ماں جی نے کہنا شروع کیا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''لوگوں کی نگاہیں غلط مطلب لینے لگتی ہیں۔ ہر کوئی حرص اور گندی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ میں اس تلخ تجربے سے گزر چکی ہوں بیٹی!''

''بات صاف صاف کیجیے ماں جی!''

''رحمٰن کا خیال ہے کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔'' مانو کے چہرے پر کوئی تاثرات نہ تھے جیسے کہ اسے پہلے سے اندازہ ہو کہ ماں جی اس کے ساتھ اسی موضوع پر بات کرنے آئی ہیں۔

''اور آپ کا کیا خیال ہے؟'' اس نے الٹا ماں جی سے سوال کر دیا۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں......''

''آپ بھی یہی چاہتی ہیں کہ آپ کی مانو زندہ نہ رہے۔'' ماں جی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑی تو ماں جی اس کی بات سن کر تڑپ گئیں۔

''تیری صورت دیکھ دیکھ کر تو میں جی رہی ہوں۔'' وہ رونے لگیں۔

''تو پھر اس موضوع کو ختم کر دیجیے کیوں کہ موت ہی مجھے فیض الحسن کی موت سے غداری کرنے سے روک سکتی ہے۔ اتنی عظیم محبت کو اپنی شادی کی بھینٹ چڑھا دوں؟''

''اس عشق کو قربان کر دوں، جس کی پاکیزگی کا گواہ قرآن کریم ہے۔''

''اس معصوم کی لاش کا سودا کر دوں جس نے ابھی میرا دودھ بھی پوری طرح نہ پیا تھا۔''

''فیض الحسن کی قبر سے ابھی تو پھول بھی خشک نہیں ہوئے اور آپ چاہتی ہیں کہ اس کی قبر کی بے حرمتی کر دوں؟'' وہ ایک سال بعد بولی تھی اور کیا خوب بولی تھی۔ اس کی آنکھوں نے پھر خون برسانا شروع کر دیا تھا۔ ''مجھے یہ غم بھول نہیں سکتا۔ میں مشرق کی بیٹی ہوں اور اپنی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی محبت کی امین ہوں۔ ایک بار ہی کسی کے ساتھ منسوب ہو کر زندگی گزارنے کے تصور کو ہی بہترین زندگی کہتے ہیں۔'' وہ اپنا سانس درست کرتے ہوئے پھر بولی۔

''میں اپنے بیٹے اور شوہر کی یادوں کو سینے سے لگائے اس وقت غم اور حسرت کی تصویر بن کر بہترین زندگی گزار رہی ہوں۔ اگر آپ مزید اصرار کریں گے تو میں اپنے فیض الحسن کے گھر چلی جاؤں گی یا پھر زہر کھا کر مر جاؤں گی۔''

''بس کرو مانو بس کرو!'' ماں جی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

''بس کر دیا ماں جی! آپ لوگ بھی آئندہ مجھ سے یہ میری یادیں چھیننے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ دوبارہ کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی پشت ماں جی کی طرف تھی، ماں جی باہر نکلیں تو سامنے عبدالرحمٰن کو کھڑے دیکھ کر چونک گئیں۔

انہوں نے ماں جی کی طرف ایسے دیکھ کر سر ہلایا کہ انہوں نے ساری بات سن لی ہے۔ وہ وہاں سے چلے گئے۔

مانو نے واپس آ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور آنکھوں کے قید خانوں کے پٹ کھول دیے۔ بس آنسوؤں نے اودھم مچا مچا کر باہر نکلنا شروع کر دیا۔ آنسو موج در موج آ رہے تھے۔ ان کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے بھی دل کھول کر مانو کے دامن کو تر کیا اور مانو کا دل ہلکا کر دیا۔

☆=====☆=====☆

شہر بھر کی پولیس کو چکمہ دے کر نکلنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر اس بار وہ بہت دور نکل آیا تھا۔ سڑک کے کنارے نیچے کی طرف ڈھلان پر لڑھکتا ہوا وہ نیچے دریا کی طرف اُتر رہا تھا۔ کیش والا بیگ اس کے کندھے پر تھا۔ آج اس نے بہت بڑی واردات کی تھی۔ حلیہ اس کا عورت والا ہی تھا۔ ''شہر کی مین برانچ میں ڈاکہ'' اس خبر نے شہر بھر کی پولیس میں تھرتھلی مچا دی تھی۔ انہوں نے گارڈز کی اطلاع پر سٹیج کی مختلف اداکاراؤں کو گرفتار کر لیا تھا مگر وہ سبھی حقیقی ''عورتیں'' تھیں۔ صفدر حسین کی طرف کسی کا بھی دھیان نہ جا سکتا تھا۔

وہ لڑھکتا ہوا نیچے دریا کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اسے اس حالت میں اس طرح نیچے اُترتا ہوا اگر کوئی دیکھ لیتا تو یقیناً مشکوک ہو جاتا۔ صفدر حسین جلدی جلدی اپنے آپ کو کسی محفوظ جگہ پہنچانا چاہتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ اس شہر میں رہتا تھا اور اس جگہ پر پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی تو دور کنارے کے ساتھ ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اس نے اس جگہ چھپنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنی ڈب کے ساتھ لگا ہوا پسٹل چیک کیا اور بالکل ٹہلنے والے انداز میں اس جھونپڑی کی جانب چل پڑا۔

بیگ میں کافی کیش تھا۔ اس نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ اس رقم کے ختم ہونے تک کوئی مزید واردات نہیں کرے گا کیوں کہ پولیس کو بھی اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو آرام دینے کا موقع ملنا چاہیے۔

اگر کوئی جھونپڑی میں ہوا تو یقیناً کوئی درویش یا غریب ہی ہوگا جو کہ چند روپوں کے عوض خاموش ہو جائے گا۔ وہ چلتا ہوا جھونپڑے کے ٹاٹ کے پردے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ اس وقت عورت کے بھرپور میک اپ میں تھا۔ اگر کوئی مرد یا عورت اسے اس وقت دیکھ لیتی تو یقیناً جھونپڑی والے کی جے جے کار ہونے لگتی کیوں کہ وہ کافی امیر عورت لگ رہی تھی اس نے ٹاٹ کا پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہو گیا مگر اندر کا منظر اس کی روح فنا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح اندر موجود شخصیات کو دیکھ کر گنگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ملے جلے تاثرات تھے جنہیں کوئی بھی نام نہ دیا جا سکتا تھا۔ وہ قادر علی، فاطمہ اور ان کے بچے کے علاوہ مراد الحسن اور ایک کونے میں دبکے ہوئے فیض الحسن کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

ایک عورت کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر فاطمہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی جب کہ قادر علی بالکل مطمئن تھا اور مراد الحسن نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا پھر وہ قلقاریاں مارنے لگا۔ اب وہ کچھ بول سکتا تھا۔ صفدر حسین کو دیکھ کر اس کے منہ سے کچھ ٹوٹے ہوئے الفاظ

خارج ہونے لگے۔

''با..... با..... مم..... آ جا..... بابا..... ہوں.....'' اس طرح کے بے ترتیب اور نہ سمجھ آنے والے الفاظ نے صفدر حسین کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے۔ قادر علی نے اٹھ کر اسے گلے لگایا تو فاطمہ نے حیرانگی سے شوہر کی طرف دیکھا جس کی پاکیزگی کی قسم دی جا سکتی تھی۔ وہ ایک نامحرم عورت کو بھینچ بھینچ کر گلے لگا رہا تھا مگر وہ خاموش رہی۔

''بیٹھو! صفدر حسین!'' قادر علی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر فاطمہ کو اچنبھا ہوا مگر صفدر حسین جانتا تھا کہ چاچا قادر علی اللہ کا بندہ ہے وہ اسے پہچان چکا ہے۔ فاطمہ ابھی اس اسٹیج تک نہ پہنچی تھی۔ وہ روتا ہوا فیض الحسن کی طرف بڑھنے لگا تو وہ ڈر اور خوف سے جھونپڑی کی دیوار سے مزید چپک گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور ڈر کی جھلک نمایاں تھی۔

اس نے حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے فیض الحسن کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی جھلک نہ تھی مگر صفدر حسین ان کو زندہ دیکھ کر خوشی کے مارے خود پر قابو نہ رکھ پا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ساون کی بارش بنی ہوئی تھیں۔

اس نے مراد الحسن کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو فیض الحسن نے اچھل کر صفدر حسین کو دور دھکیل دیا اور مراد الحسن کو اپنی گود میں لے لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ فیض الحسن کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ اس نے نمناک آنکھوں سے قادر علی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

''چاچا قادر علی! یہ سب کیا ہے؟ میں نے ان کی لاشیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے انہیں قبر میں اتارا ہے اور..... اب..... انہیں زندہ دیکھ رہا ہوں..... اس حالت میں؟'' قادر علی بھی غمگین ہو گیا تھا۔ فاطمہ نے صفدر حسین کے آگے کھانا رکھا تو اس نے روتی ہوئی آنکھوں سے چاچی کی طرف دیکھا۔

''صفدر حسین! تم ہمارے بیٹے ہو گو کہ عمروں کا زیادہ فرق نہیں ہے مگر رشتوں کی زنجیر باندھنی ہو تو پھر عمروں کی محتاجی نہیں ہوتی۔'' فاطمہ پہلی بار صفدر حسین سے مخاطب ہوئی تھی۔ اسے عجیب بھی لگ رہا تھا کہ وہ ایک مرد ہے مگر ماڈرن عورت کے روپ میں ہے۔

''پہلے تم کھانا کھا لو! باقی تمام داستان تمہارا چاچا تمہیں سنا دے گا۔'' فاطمہ کے کہنے اور قادر علی کے اصرار پر اس نے چند نوالے زہر مار کیے۔ اس نے بے فکر ہو کر اپنا بیگ جھونپڑی میں زمین پر ہی رکھ دیا تھا۔ یہ فقیر کی کوٹھڑی تھی۔ اس میں چوری ڈکیتی کا خطرہ نہ تھا۔

"صفدر حسین! پہلے تم مجھے بتاؤ کہ فیض الحسن کے نکاح کے بعد کیا ہوا تھا؟" قادر علی نے اس سے سوال کیا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال کے تمام واقعات اسے یاد آنے لگے۔ وہ قادر علی اور فاطمہ کو لفظ لفظ بتانے لگا۔ اس کی نگاہیں فیض الحسن کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں۔ مراد الحسن اب اس کی گود میں سو گیا تھا۔ فیض الحسن نے مانو کے لڑ کر گھر چھوڑ کر آ جانے سے لے کر فیض الحسن کے خان پور جانے تک کے تمام واقعات انہیں دکھ اور تاسف سے بتائے تو ان کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

"چاچا! مجھے اللہ نے آج نئی زندگی سے نوازا ہے۔ فیض الحسن اور مراد کو زندہ دیکھ کر میں کتنا خوش ہوں......" اس کی آنکھیں پھر ساون برسانے لگیں۔ "میں...... الفاظ میں...... بیان نہیں کر سکتا۔ بس...... میرا باپ میرا بھائی میرا یار مجھے مل گیا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تقدیر ایک دن مجھے اس چوکھٹ پر بھی لائے گی۔ ان حالات میں مجھے تم لوگوں سمیت میرا پورا خاندان ہی مل جائے گا۔ چاچا! چھوڑو...... یہ سب کچھ...... ہم واپس چلتے ہیں۔ ہم چاچا فیض الحسن کا علاج کرائیں گے۔ ان بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کا بندوبست کریں گے۔"

"صفدر حسین!" قادر علی ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولا۔ "میں نے تمہیں یہاں بلوانے کے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں۔ اس رب رحیم نے جس کام میں تمہارا رزق لگایا ہے وہی بہتر جانتا ہے۔ اس کام کی بدولت تم گرتے پڑتے اس جھونپڑی تک پہنچ گئے ہو۔" قادر علی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے باور کرا دیا تھا کہ تم جو "کام" کرتے ہو اسے اللہ کی رحمت سے معلوم ہے۔

"اس جھونپڑی میں اس جگہ پر ابھی نامعلوم کتنی ڈیوٹی ہے؟ یہ میرا رب ہی بہتر جانتا ہے۔ میں اس جگہ پر بیٹھ کر اس عظمتوں والے رب سے جو بھی مانگتا ہوں وہ مجھے اپنی رحمت کے خزانوں سے نواز دیتا ہے۔ میں ابھی یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا مگر تمہاری یہ امانتیں مجھ تک اس نے جیسے بھی پہنچائی ہیں۔ میں تمہیں لوٹانے کے لیے بے قرار تھا۔ میں دن رات تمہارے یہاں آنے کی دعائیں کرتا تھا۔ آج میری دعائیں بر آئی ہیں اس عظیم پروردگار نے میری سن لی ہے۔ اب فیض الحسن کا علاج بھی ہو سکے گا اور مراد الحسن کی تعلیم کا بھی مناسب بندوبست ہو جائے گا۔" قادر علی خاموش ہوا تو صفدر حسین بول پڑا۔

"مگر یہ لوگ آپ تک کیسے پہنچے؟" اس کی حیرانگی بجا تھی کیوں کہ عنایت علی اور عبدالرحمٰن کا ان لاشوں سے لپٹ لپٹ کر رونا اور پھر قبرستان میں ماہ نور کا ان دونوں "زندوں" کی قبروں پر بین کرنا، اسے اچھی طرح یاد تھا۔

"تمہارے گھر میں آخری رات مجھے خواب میں اس جگہ پر ڈیوٹی دینے کے لیے حکم ہوا۔" قادر علی نے کہنا شروع کیا تو وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ "میں حیران تھا کہ فوراً ہی ڈیوٹی کا علاقہ تبدیل ہو گیا تھا کیوں کہ مجھے حکم تھا کہ فیض الحسن کی "مدد" کرو۔ خیر اللہ کی رحمت کی جہاں جہاں خاص ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ مقدس کو ظاہر کرنے کے لیے اپنے بندوں کی ڈیوٹیاں ان جگہوں پر لگا دیتا ہے۔ میں تمہیں خط کے ذریعے نامعلوم مقام کا بتا کر چلا آیا۔ یہاں آ کر ڈیرہ لگایا تو اللہ نے ایک خوبصورت بیٹے سے نوازا۔ یہ اس کا کرمِ خاص ہے اس عظیم پروردگار کی شان اور رحمت کا میں اس دن مزید مطیع اور گرویدہ ہو گیا جب میں وضو کرنے کے لئے دریا کے کنارے بیٹھا تھا تو اوپر سڑک پر ایک نیلے رنگ کی گاڑی جس کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا لڑھکنیاں کھاتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ میں اس سے پہلے کہ کچھ سمجھتا کھلے ہوئے دروازے سے ایک بچہ اُچھل کر ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا میری جھولی میں آ گرا۔

میں ابھی تمام معاملہ سمجھ نہ پایا تھا کہ ایک نوجوان اسی دروازے سے لڑھکتا ہوا درختوں میں آ کر گر گیا۔ اس کا جسم درختوں کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گیا جب کہ گاڑی ایک زوردار دھاکے سے دریا کے کنارے آ گری۔ میں خوف زدہ انداز میں بچے کو لے کر وہاں سے بھاگا، مجھے اس نوجوان کا کوئی ہوش نہ تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ اتنی دیر میں مَیں نے اپنے پیچھے ایک ہولناک اور زوردار دھاکہ سنا میں لڑکھڑا کر گر گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو گاڑی بری طرح جل رہی تھی۔ اس کے پٹرول ٹینک میں آگ لگ گئی تھی۔ میں دوڑتا ہوا بمشکل جھونپڑی تک پہنچا تو بچہ جو کہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے فاطمہ کی گود میں ڈال دیا۔ میں سمجھا کہ اتنی اوپر سے گرنے کے بعد یہ مر گیا ہو گا مگر فاطمہ کی گود میں جاتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا تو مجھے سکون ہوا۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ والا محاورہ میری آنکھوں کے سامنے اس کی موجودگی کا منہ بولتا زندہ ثبوت تھا۔

مجھے لگا کہ وہ نوجوان درختوں کی شاخوں میں الجھ کر مر گیا ہو گا۔ میں اپنی جھونپڑی میں دبک کر بیٹھ گیا۔ رات گہری ہوئی تو میں اپنے ذہن کی تشفی اور شک کی یقین دہانی کے لیے واپس اسی راستے اور اسی جگہ کی طرف چل پڑا مگر پولیس اور بہت سے لوگوں کو دیکھ کر میں واپس آ گیا۔ اسی رات میرے مرشد صاحب کی آمد ہوئی۔ انہوں نے بچے کو پیار کیا اور اس کی پیشانی دیکھ کر بولے۔ ماں باپ کی زندگی میں بھی یتیموں جیسی زندگی گزارے گا۔ میں ہونقوں کی طرح مرشد کی باتیں سن رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ قادر علی! اس کائنات کے تین جھگڑے

ہیں۔ زن، زر، زمین بچہ ان جھگڑوں کے انتقام کا نشانہ بنا ہے۔ اس کے اور اس کے باپ کے مجرم اپنے ہی ہیں۔ ان سے لمبی مدت تک ہوشیار رہنا۔ تب تک جب تک یہ اپنے دل و دماغ کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔ اس کا باپ بھی زندہ ہے، کل تمہیں مل جائے گا اور یقیناً تمہاری حیرانگی کا سبب بھی بنے گا۔ مرشد یہ کہہ کر چلے گئے مگر میں ناسمجھی کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

اگلے دن میں مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو وہ نوجوان درختوں سے گر کر اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کوئی نہ تھا۔ میں منہ اندھیرے گیا تھا اور ویسے بھی اس طرف بہت کم ہی لوگ آتے تھے۔ میں نے اس نوجوان کی نبض دیکھی تو وہ چل رہی تھی۔ میں نے بمشکل اسے کھڑا کر کے کندھے پر اٹھایا۔ یہاں تک لاتے ہوئے میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے اسے لا کر لٹایا۔ فاطمہ نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا تو اس نوجوان کا چہرہ خون سے تر بتر ہو رہا تھا، یہ ڈر کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا تو اس کے سر سے خون بہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے پانی سے اس کا چہرہ دھونا شروع کیا تو طلوع ہونے والے دن کی پہلی کرن نے ہی مجھے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

میرے ہاتھ رک گئے۔ میری سانس فیض الحسن کو پہچان کر رکنے لگی۔ میرے دل کی دھک نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ میرا بھائی فیض الحسن میرے سامنے زندہ لاش کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔ میں رونے لگا مگر فاطمہ نے مجھے حوصلہ دیا اور رب کریم پر تقویٰ کرنے کی تلقین کی۔ ہوش میں آنے کے بعد فیض الحسن ادھر اُدھر کچھ ڈھونڈنے لگا۔ وہ دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں نے اس کا نام لے کر اسے پکارا مگر بے سود۔ آخر اس کا دھیان جھونپڑی میں سوئے ہوئے بچے پر پڑ گیا۔ اس نے جا کر غور سے بچے کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جیسے کہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ دونوں بچے سوئے ہوئے مگر خون کی کشش نے جوش مارا اور اپنے ہی بیٹے کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا مگر اپنے بیٹے کے علاوہ کسی کو بھی نہیں پہچانتا یا جانتا تھا۔ میں نے اسے آیاتِ قرآنی کا ترجمہ بھی سنانا شروع کر دیا۔ میں قرآن کریم پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکا کرتا تھا مگر یہ اپنی اصلی اور درست حالت میں نہ آسکا مگر ایک بات تھی جب قرآن کریم پڑھا جاتا تو یہ بالکل خاموشی اور محویت سے سننے لگتا یہ میرے لیے حیران کن بات تھی۔ میں دن رات تمہاری یہاں آمد کی دعائیں مانگنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم کیا، تم یہاں آن

پہنچے۔'' قادر علی کی طویل داستان ختم ہوئی تو فیض الحسن بھی سو چکا تھا مگر صفدر حسین کے گالوں پر آنسوؤں نے اپنی لکیریں بنا دی تھیں۔ وہ فیض الحسن کے پاؤں پکڑ کر چومنے لگا تو فاطمہ اور قادر علی بھی مغموم ہو گئے۔

''صفدر حسین! فیض الحسن کا علاج شہر کے مینٹل ہسپتال سے ممکن ہے۔ میں اتنا سرمایہ نہیں لگا سکتا مگر تم لگا سکتے ہو۔'' قادر علی کی آنکھوں کا اشارہ بیگ کی طرف تھا۔ ''مگر ایک بات کا خیال رکھنا، اس کے سسرال میں اس کی زندگی کا کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔ حتیٰ کہ اس کی بیوی کو بھی نہیں۔ مرشد نے فرمایا تھا کہ اس کے ''اپنے'' ہی ان کے مجرم ہیں۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم انہیں کیسے سنبھال سکتے ہو اور آنے والے حالات سے کیسے نبرد آزما ہوتے ہو؟''

قادر علی کی بات سن کر وہ سر ہلا کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اس کے سسرال میں اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟ مگر یہ بات اس وقت سوچنے کی نہیں تھی بلکہ ان دونوں باپ بیٹے کی زندگی بچا کر انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا اور صفدر حسین یہ بہتر طور پر کر سکتا تھا کیوں کہ اس کے پاس وافر روپیہ تھا۔ وہ رات اس نے وہیں کاٹی، اس کے لیے ضروری بھی تھا اور مجبوری بھی۔

اگلی صبح اس نے گاڑی کا بندوبست کیا اور فیض الحسن اور مراد کو اپنے گھر لے گیا۔ فیض الحسن نے عجیب سی نظروں سے گھر کو دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں ایسی کوئی چمک نہ ابھری۔ جس سے یہ تاثر ملتا ہو کہ اس نے اس گھر کو پہچان لیا ہے۔

اب صفدر حسین کے لیے مسئلہ تھا تو مراد الحسن کی مناسب دیکھ بھال کا۔ پہلے اس نے سوچا کہ اس گھر میں مراد الحسن کے لیے ایک آیا رکھ لے مگر یہ ارادہ اس نے ترک کر دیا کیوں کہ جب صفدر حسین کی بیوی ہی نہیں ہے تو وہ بچے کی طرف سے مشکوک ہو جائے گی اور پھر وہ فیض الحسن کا بھی گھر میں ہی علاج کرانا چاہتا تھا تا کہ اس کے سسرال والوں کو فیض الحسن کی زندگی کا پتا نہ چل سکے۔

دونوں کی خدمت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ صفدر حسین کے پاس جتنا بھی روپیہ تھا۔ اس نے پانی کی طرح بہانا شروع کر دیا۔ ایک سال تو سکون سے گزر گیا تھا مگر پیسے ختم ہونے پر اس کو پھر سے ایک واردات کرنا پڑی۔ جس نے اس کو کافی سہارا دیا تھا۔ اب اس کے ساتھ باقاعدہ ساتھی مل گئے تھے، کئی بار پولیس سے بھی ٹکرا ہوا تھا مگر وہ ہر بار قسمت کی یاوری سے بچ کر نکل آتے تھے۔

ڈاکٹروں نے انتہائی رازداری برتنے کے وعدے پر فیض الحسن کو ہسپتال داخل کر لیا تھا۔ اس کا اچھا علاج شروع ہو گیا تھا مگر وہ اتنا ہی کر سکتے تھے کہ وہ صفدر حسین کی طرف دیکھ کر ڈرتا نہ تھا بلکہ اچھا ردِعمل ظاہر کرتا تھا۔ مراد الحسن کو سکول چھوڑ کر آنا اور وقت پر لے کر آنا صفدر حسین کی ڈیوٹی تھی وہ اپنی ڈیوٹی پوری فرض شناسی سے انجام دیتا تھا۔

وقت کا پنچھی تیزی سے اُڑتا رہا۔ مراد نے میٹرک کر لیا تو صفدر حسین کو خوشی ہوئی۔ اس نے مراد کی خواہش پر اسے کالج میں داخل کرا دیا۔ وہ اچھا اور لائق طالب علم تھا۔ صفدر حسین اپنی ادھوری تعلیم کی حسرت مراد الحسن کی تعلیم پوری کروا کے پوری کرنا چاہتا تھا۔

وہ مراد الحسن کو باقاعدہ فیض الحسن سے ملوانے بھی لے جاتا تھا۔ فیض الحسن کو بھی مراد کا چہرہ یاد تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہتا اور پھر پیار کرنے لگتا۔ مینٹل ہسپتال میں وہ کسی کو بھی تنگ نہ کرتا تھا۔ بس اپنی جگہ پر بیٹھا منہ سے گاڑی چلانے کی آواز نکالتا رہتا تھا۔

مراد الحسن نے ایف اے اور پھر بی اے کیا تو صفدر حسین نے اپنی ''کمائی'' سے ایک بڑا سا گھر اس کو لے کر دیا، پرانے گھر کو تالا لگا دیا گیا۔ اس دوران فیض الحسن کو کبھی کبھار دو تین ہفتوں کے لیے گھر بھی لایا جاتا تھا۔ اس کا رویہ گھر میں بھی بالکل ٹھیک تھا اور پھر ایک دن ڈاکٹروں نے صفدر حسین کو بلایا اور فیض الحسن کو مستقل طور پر گھر لے جانے کو کہا۔

''مسٹر صفدر حسین! اب آپ کے والد کی طبیعت بہتر ہے مگر جس وجہ سے ان کی یادداشت کھوئی تھی آپ کوشش کریں کہ اس مقام پر یا پھر ان لوگوں کے بیچ انہیں لے جا کر چند دن گزاریں ان کے ساتھ ملنے پر انہیں کوئی نہ کوئی جھٹکا، ان کی یادداشت واپس لانے کے لیے مفید ثابت ہوگا۔''

☆=====☆=====☆

حمود کے ملنے کے بعد صفدر حسین اب اسی شہر میں اکیلا رہتا تھا مگر مراد اور حمود کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس محلہ اور کس شہر کس گلی میں رہتا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ صفدر حسین بہت بڑا کاروباری بندہ ہے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ فیض الحسن آہستہ آہستہ حمود اور مراد کا عادی ہو گیا تھا۔ صفدر حسین نے واقعی برخورداری اور دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بھرپور جوانی اپنے چچا اور بھائی مراد کی خوشیوں اور صحت کی نذر کر دی تھی۔ اس کی زندگی میں نہ کسی عشق کی کوئی گنجائش تھی اور نہ ہی کسی شادی کی۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ مراد الحسن کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی۔ اس نے کسی بھی سرکاری

نوکری کو ترجیح دینے کی بجائے اپنا کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مَوویز کی طرف توجہ دی اور صفدر حسین نے اس کی خواہش پر اُف تک نہ کی اور وافر روپیہ اسے کام کرنے کے لیے دے دیا۔

مراد الحسن نے بھی اس روپے کو ضائع نہ کیا بلکہ بڑھانا شروع کر دیا تھا کیوں کہ اس کی محنت اور اچھے اخلاق کی بدولت شہر بھر میں اس کا نام مشہور ہو گیا تھا۔ حمود الحسن اس کا بہترین ساتھی ثابت ہو رہا تھا۔

حمود الحسن نے بابا کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ فیض الحسن کے پہچانے جانے کے چانس بہت کم ہو گئے تھے جب کہ مراد الحسن تو بھرپور مرد بن گیا تھا۔ اس لیے اتنی دیر میں ان کے دشمن بھی ان کی طرف سے بے فکر ہو گئے ہوں گے۔ صفدر حسین اس وجہ سے ان دونوں کی طرف سے مطمئن تھا۔

ان بیس سالوں میں قادر علی اور فاطمہ سے ایک بار ہی ملاقات ہو سکی تھی مگر دوسری بار جب صفدر حسین وہاں گیا تو ان کی جھونپڑی تو تھی مگر وہ اپنی ڈیوٹی کرنے کے لیے کہاں گئے تھے۔ یہ صفدر حسین نہ جانتا تھا اور یہ باتیں بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں کیوں کہ وہ اللہ کے کاموں سے خاصا دور تھا اور اللہ نے بھی اس کی ڈور فی الحال ڈھیلی چھوڑی ہوئی تھی۔

☆=====☆=====☆

زمانے میں ترقی اور جدت نے بنک لوٹنے والی عورت کو بھی جدید بنا دیا تھا۔ اب اس نے کچھ عرصہ سے بنک لوٹنے بند کر دیے تھے مگر اب جیولرز کی شامت آ گئی تھی۔ پولیس اس خطرناک اور حیران کن وارداتیں کرنے والی عورت کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی اور جو پرسوں واردات ہوئی تھی اس نے تو سبھی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ انتظامیہ کے خلاف عوام نے بھرپور جلوس نکالا تھا۔ پولیس والوں پر خوب لے دے ہو رہی تھی۔

شہر کے مشہور و معروف ڈاکٹر آصف علی کے کلینک میں ہمیشہ کی طرح رش تھا۔ مریض اپنی اپنی باری پر چیک اَپ کرواتے اور انہیں فیس ادا کر کے اپنی طبیعت اور صحت کے مطابق دوائیوں کی پرچی لیتے اور چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر آصف کا کلینک شہر کے مشہور ٹاؤن ''سرسید ٹاؤن'' کی کوٹھی میں ہی تھا۔ ان کی چیک اَپ فیس ہزار روپیہ تھی اور بہت دنوں پہلے ان سے ٹائم لینا پڑتا تھا۔ امیر کبیر عورتیں اور مرد سبھی ان کے مریضوں میں شامل تھے۔

صفدر حسین بھی ایک خوبصورت عورت کے روپ میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسری عورتیں اس کے چست لباس کو دیکھ کر حسد محسوس کر رہی تھیں۔ اس لباس میں اس کی

پرسنالٹی ڈیشنگ لگ رہی تھی۔ اپنی باری آنے پر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جی کہیے محترمہ! کیا تکلیف ہے آپ کو؟''

''وہ جی! دراصل تکلیف مجھے نہیں بلکہ میرے خاوند کو ہے۔'' اس کا نسوانی آواز میں بھرپور لہجہ ڈاکٹر کو متاثر کر گیا تھا مگر وہ حیرت سے بولا۔

''تو پھر آپ اپنے میاں کو بلائیں تا کہ ان کا چیک اپ کیا جا سکے۔''

''دراصل!...... مجھے...... بات کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔'' وہ نروس ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بات کروں؟'' وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑنے لگا تو ڈاکٹر ہمدردی سے بولا۔

''آپ بے فکر ہو کر کہیے جو بھی مسئلہ ہے اس کا حل ڈھونڈ لیں گے۔''

''ڈاکٹر صاحب! ہم نا ابھی ابھی دائرہ اسلام میں داخل ہو کر مسلمان ہوئے ہیں اور میرے شوہر کے ختنے......نہیں ہوئے۔ اگر کائینڈلی آپ زحمت کریں تو...... گھر جا کر......'' وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ڈاکٹر کے چہرے پر تاثرات دیکھنا چاہتا تھا۔

''دراصل محترمہ! میں کبھی کسی کے گھر نہیں گیا اور ختنے وغیرہ تو میں بچوں کے ہی کرتا ہوں۔ آپ اپنے شوہر کو ہاسپٹل لے جائیں۔ میں ایک ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب پرچی پر کچھ لکھنے لگے تو صفدر حسین کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش ہو گئی۔ ڈاکٹر کا ہاتھ رک گیا، وہ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہمیں اسلام قبول کرنے کے بعد اس طرح جگہ جگہ ذلیل ہونا پڑے گا؟ اس سے ہم غیر مسلم ہی ٹھیک تھے۔ آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے میاں کو ہاسپٹل میں لے کر جائیں تا کہ لوگ اور ہمارے سابقہ برادری والے ذلیل کریں۔ ہمارے اسلام پر ہنسیں اور ہمارا مذاق اُڑائیں......'' وہ باقاعدہ رونے لگا تو ڈاکٹر کا دل پسیج گیا وہ ہمدردی سے بولا۔

''اوکے، اوکے آپ روئیں نہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ آپ اپنے میاں کو یہاں ہی بلوا لیں۔ میں فارغ ہونے کے بعد ان کے ختنے کر دوں گا۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب! ہمارے پاس تو گاڑی نہیں ہے۔ آپ اگر پلیز مہربانی کریں اور اپنی گاڑی بھیج دیں تو...... آپ گھبرائیں نہیں جتنا بھی خرچ ہو گا میں ادا کر دوں گی۔'' اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈی نکالی تو ڈاکٹر ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ یہ لمبا ہی

''دیہاڑ'' تھا۔ اس نے گھنٹی بجا کر ملازم لڑکے کو بلایا اور ڈرائیور کو بلانے کا کہا۔

ڈرائیور کے آنے پر ڈاکٹر صاحب نے صفدر حسین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ اور...... جائیے آپ۔'' آخری الفاظ اس نے صفدر حسین کو کہے کر تھے۔ صفدر حسین اپنا آدھا مشن مکمل کر چکا تھا۔ اب اس نے جیولرز شاپ پر جانا تھا۔ جہاں اس نے بہت قیمتی قسم کے تین ڈائمنڈ سیٹ پسند کیے ہوئے تھے۔

وہ اپنی متعلقہ شاپ پر پہنچ کر اندر داخل ہو گیا اور باہر گاڑی کی جانب اشارہ کر کے بولا۔

''ڈاکٹر صاحب نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور کو بھیجا ہے، آپ یہ بل شام کو ان کے کلینک بھجوا دیجیے گا۔'' جیولرز شاپ کے مالک نے ملازم کو اشارہ کیا وہ باہر ڈرائیور سے پوچھنے گیا۔

''یہ بیگم صاحبہ کون ہیں؟''

''انہیں ڈاکٹر صاحب نے بھیجا ہے، پلیز انہیں جلدی فارغ کر دیں۔'' ڈرائیور کی بات بن کر ملازم نے مالکوں کو سبز جھنڈی دکھائی اور ڈائمنڈ سیٹ جو کہ پہلے ہی پیک تھے۔ اس کے حوالے کر دیے گئے۔ مالک جو کہ ڈرائیور کو کئی بار ڈاکٹر صاحب کی مسز کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔ اب نئی میڈم کے ساتھ دیکھ کر حیران تو ہوئے تھے مگر ان کو کیا؟ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان کا بل شام کو کیش ہو جانا تھا۔

جیولرز بازار سے نکل کر صفدر حسین نے گاڑی رکوائی اور جیولری والا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ڈرائیور کو وہیں انتظار کرنے کا کہا اور کپڑے کی ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ کوئی آدھا گھنٹہ صرف کر کے اس نے کچھ نہ خریدا اور باہر آ کر ڈرائیور کو کہا۔

''ایسا کرو کہ تم جاؤ، مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔ میں ڈاکٹر صاحب کو فون پر بتا دوں گی۔ وہ تمہیں دوبارہ بھیج دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بے نیازی سے ایک بازار سے دوسرے بازار میں جانے والی گلی میں مڑ گیا۔ دوسری طرف آ کر اس نے ٹیکسی پکڑی اور دو تین ٹیکسیاں بدل کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اس واردات نے پولیس کی دوڑیں لگوا دی تھیں۔

ایس پی زمان ملک کی تازہ تازہ اس شہر میں تعیناتی ہوئی تھی اور آج پہلی واردات کا تحفہ اسے مل گیا تھا۔ وہ اپنے ماتحت تمام تھانوں کے انسپکٹروں پر غصہ جھاڑ رہا تھا مگر معاملہ اس کی توقع سے بھی زیادہ گھمبیر تھا۔ اس عورت کی واردات اور کردار نگاری اتنی شاندار اور جاندار ہوتی تھی کہ پولیس لکیر پیٹتی رہ جاتی تھی۔

ایس پی زمان انتہائی ذہین اور سمجھدار بندہ تھا۔ نہ وہ رشوت لیتا تھا اور نہ ہی لینے دیتا تھا۔ جس شہر بھی جاتا تھا مجرم اس شہر سے غائب ہو جاتے تھے۔ منشیات فروش، جواری، چور اور ڈاکو اپنے علاقے بدلنے پر مجبور ہو جاتے تھے مگر ایک عورت نے اس شہر میں آتے ہی انوکھی اور مہنگی واردات کر کے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اب وہ سٹی تھانہ میں بیٹھا اسی واردات کے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ ایڑیاں بجنے کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر آنے والے انسپکٹر کو دیکھا جس کی پیشانی پر اب بھی ہاتھ تھا۔

”محمد مظہر ولد غلام رسول، قوم آرائیں، انسپکٹر آف پولیس آن ڈیوٹی سر!“ زمان اس کے س طرح تعارف کروانے پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس نے محمد مظہر کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے کرسی پر بیٹھنے کا کہا تو وہ ”تھینک یو“ کہتا ہوا بیٹھ گیا۔

”ابھی تک یہیں خجل ہو رہے ہو؟“ ایس پی زمان نے پہلا سوال کیا۔ تو وہ بے تکلفی سے بولا۔

”کیا بتاؤں یار!......“

”یہ آفس ہے۔ نہ یار، نہ کلاس فیلو، نہ کوئی دوستی اور نہ ہی زیادہ فری ہونے کی کوشش کرنا۔“ زمان نے اسے ڈانٹ دیا تو وہ کھسیانا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے سر! دراصل حلال کی کمائی کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔ بس اسی لیے پولیس کی نوکری کر لی اور آپ دیکھیں کہ حلال میں کتنی طاقت ہے۔ بس گزشتہ چار برسوں سے انسپکٹر ہی ہوں۔“

”پولیس کی نوکری صرف حق حلال یا حرام کے چکروں میں پڑ کر مت کرو۔“ زمان مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بس اپنا فرض سمجھ کر کرو۔ پھر دیکھنا تمہیں بہت ترقی ملے گی۔“ وہ فائل دیکھنے میں مصروف ہو گیا تو محمد مظہر بول پڑا۔

”سر! آج کل لیڈی ڈکیت نے جو سلسلہ واردات شروع کر رکھا ہے آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟“

”دیکھو محمد مظہر ولد غلام رسول، قوم آرائیں، سکنہ 213 ر، ب! میں اس سلسلہ میں کافی دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔ تم جیسے حق حلال کھانے اعلے تعاون کریں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

ملک زمان نے اسی کے انداز میں کہا تو وہ اپنا تعارف سن کر دل و جان سے خوش ہو گیا۔

”مجھے اجازت سر؟“ اس نے کھڑے ہو کر اپنی سٹک اور کیپ پکڑی تو زمان نے سر ہلایا۔

محمد مظہر اور ملک زمان کلاس فیلوز تھے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ پولیس فورس جوائن کریں گے۔ اب ایک ہی تھانہ میں دو مختلف عہدوں پر تعینات دونوں کلاس فیلوز انسپکٹر اور ایس پی کی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔

زمان نے شہر کا نقشہ منگوا کر اس پر مختلف جگہوں پر نشان لگانے شروع کر دیے تھے۔ وہ لیڈی ڈکیت کو جلد سے جلد گرفتار کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلہ میں اسے بہت کام کرنا تھا۔

☆=====☆=====☆

حوریہ کے سامنے شاعری کی کتاب پڑی ہوئی تھی اور وہ شاعر کے احساسات اور جذبات کی قدردان ہو گئی تھی۔ الفاظ کا ایسا تیکھا استعمال کہ معاشرے کی ہر قسم کی ناہمواریوں کی نقاب کشائی کی تھی۔ محبت اور عشق کے موضوع پر لکھا تو الفاظ موتی بن کر چاہتوں کی مالا بن گئے تھے۔ غزل کا انتہائی حسین روپ دھارنے والے ایک ایک شعر کا ہر لفظ یقیناً شاعر کی دلی کیفیت کی ترجمانی کرتا تھا۔ حوریہ کو شادی کے ہنگاموں میں یاد ہی نہ رہا تھا کہ اس نے عدنان سے شاعر کا پتا اور فون نمبر مانگا تھا۔ بس اس نے اپنی موبائل ڈائریکٹری سے بک سپاٹ کے نمبر ڈھونڈے اور کلک کر دیا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی تو کسی نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

”ہیلو! مسٹر عدنان؟“

”جی فرمائیے! بول رہا ہوں۔“

”حوریہ آپی بول رہی ہوں۔“ حوریہ نے اپنا تعارف کروایا تو وہ چونک گیا کیوں کہ اس نے پہلی بار اسے فون کیا تھا۔ فوراً ہی سلام کر دیا۔

”کیسے ہو عدنان؟“

”بالکل ٹھیک ہوں آپی۔ آپ سنائیں کیسی طبیعت ہے؟“

”میں نے تم سے ایک کام کہا تھا۔“

”سوری۔ بھول گیا ہوں، یاد دلا دیں۔“ اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”شاعر کا پتا اور فون نمبر۔“

”اوہ۔ ہو...... وہ تو میں نے کب کا معلوم کر لیا ہے، لکھیں۔“

دوسری طرف ایک نمبر اور شاعر کا پتا لکھوایا گیا تو وہ حیرانگی سے اس ایڈریس کو دیکھ رہی تھی کیوں کہ یہ تو اس کے شہر کا ہی پتا تھا۔

”شکریہ عدنان!“

''حوریہ آپی! ایک درخواست ہے۔'' وہ جلدی سے بولا تھا کہ کہیں حوریہ موبائل ہی نہ بند کردے۔

''کہو۔''

''آپ میرا نام نہیں بتائیں گی۔ بس کہہ دیجیے گا کہ پبلشرز سے معلوم کیا ہے۔''

''او کے۔ او کے۔ اللہ حافظ!'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اس کتاب کی شاعری نے اس کے دل میں ہل چل پیدا کر دی تھی۔ وہ اس شاعر سے ملنا چاہتی تھی۔ فوراً۔ مگر کس کو ساتھ لے جائے؟ اس کا بڑا مسئلہ تھا کیوں نہ شاعر صاحب سے ہی ملاقات کا وقت مانگ لے۔ وہ ماہ نور بوا کو ساتھ لے کر جائے گی مگر کیا وہ جائیں گی؟ نہیں...... اسے خود ہی ملنا چاہیے۔ وہ بھی انسان ہے، کون سا بندے کھاتا ہوگا؟ بس میں اکیلی ہی ملوں گی۔ اس نے پختہ ارادہ کر کے نمبر ملانا شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف بیل ہونے پر کسی نے کال اٹینڈ کی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''ہیلو!''

''ہیلو جی! مجھے مراد الحسن صاحب سے ملنا ہے۔'' وہ نروس ہو رہی تھی مگر کم از کم فون پر تو وہ اسے کھا نہیں جائے گا۔ اس نے اپنے دل کو دلاسہ دیا اور جی کڑا کر کے بات کرنے لگی۔

''مگر...... آپ کو یہ میرا نمبر کہاں سے ملا؟ اور آپ کون بول رہی ہیں؟''

''آپ کی شاعری کی پرستار ہوں سر! اور آپ کا نمبر نہ ملنا تو کوئی بات ہی نہیں کیوں کہ پبلشرز حضرات تو آپ سے رابطہ کرتے ہی ہوں گے۔''

''تو فرمایئے!؟''

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''مگر کیوں اور کس سلسلہ میں؟''

''میں آپ کی شاعری کی مداح ہوں اور اس عظیم انسان کو دیکھنا چاہتی ہوں جو جذبات اور احساسات کو الفاظ میں پرو کر اپنے غم اور حسرتوں کا مداوا شاعری سے کرنا چاہتے ہیں۔ آپ واقعی عظیم ہیں سر! اور میں عظیم لوگوں سے ملنا پسند کرتی ہوں۔'' اس کی آواز میں جوش تھا مگر دوسری طرف سے سوال سن کر وہ جوش کچھ سرد پڑ گیا۔

''اب تک کتنے عظیم لوگوں سے مل چکی ہیں آپ؟'' اس سوال کا جواب جھوٹ میں ہی دینا پڑے گا کیوں کہ اس کا جواب تو سچائی میں ممکن نہ تھا۔

''بہت سے عظیم شعراء اور صدر پاکستان سے بھی مل چکی ہوں۔'' جواب کچھ زیادہ ہی جھوٹا ہو گیا تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے میں بھی اس عظیم ہستی سے مل لیتا ہوں جس نے صدر پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ملاقات کی ہے...... بتایئے کہاں ملاقات ہوگی؟''

حوریہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے وہ کیا بات کرے؟ یا پھر کون سی جگہ بتائے کہ ملاقات ممکن ہو سکے، تھوڑا سا سوچ کر اس نے جگہ کا تعین کر لیا تھا۔

''سر آپ! اسٹیڈیم کے پاس ''پیزا ہٹ'' پر آ جائیں لیکن یہ ملاقات اور دعوت میری طرف سے ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر کل شام پانچ بجے آپ سے ملاقات ہوگی۔'' دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ ہُرے کا نعرہ لگا کر خوش ہو گئی تھی۔ اس نے کمپیوٹر پر اپنی پسند کی غزلوں کو محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ شاعری کی وہ دیوانی تھی۔ اچھے اچھے شعرا کا کلام اس نے کمپیوٹر میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ اب بھی وہ یہی کام کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے دیکھے بغیر ہی ''کھلا ہے'' کی صدا لگائی، کوئی اندر داخل ہوا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے بالکل پیچھے آ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں پر دو مضبوط اور نرم ہاتھوں نے اپنا حصار باندھا تو اسے نظر آنا بند ہو گیا مگر اس نے فوراً ہی ہاتھ پکڑ کر ''حنان بھائی'' کا نعرہ لگایا تو نوجوان کے قہقہوں سے کمرے کا ماحول مزید خوشگوار ہو گیا۔ وہ مڑی اور حنان بھائی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''کیا کر رہی تھی؟'' گورے چٹے اور لمبے قد والے حنان نے ''ماؤس'' پکڑ کر کمپیوٹر سے کھیلنا شروع کر دیا مگر پھر فوراً ہی اپنی بات کا خود جواب دے دیا۔

''اچھا! شاعری کا بخار چڑھا ہوا ہے۔'' وہ ہنسنے لگی۔

''کب آئے ہو بھیا؟''

''ابھی آیا ہوں اور حسب معمول تمہارے کمرے میں پہلا قیام کیا ہے۔''

''آپ کی چاہت ہی میری زندگی ہے حنان بھائی!'' وہ تھوڑا سا جذباتی ہو گئی۔

''پگلی! تمہاری صورت نہ دیکھوں...... تو دل چاہتا ہے کہ بس فوراً اُڑ کر اپنے ملک چلا جاؤں اور اپنی پگلی بہنا کا درشن کر لوں۔'' حنان بھی بہن سے بہت پیار کرتا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس نفسا نفسی کے دور میں آپ واحد بھائی ہیں جو اپنی بہن سے اتنا زیادہ پیار کرتے ہوں گے۔'' حوریہ اب کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور حنان بھی اس کے برابر والی

کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بہن بھائی کے پیار کی مثالیں تو دینا ہی کم عقلی ہے۔ یہ تو بے لوث اور مخلص رشتے ہوتے ہیں۔'' حنان بھائی نے آواز کی سمت دیکھا تو حوریہ بھی چونک کر دیکھنے لگی۔ دروازے میں ماہ نور بوا کھڑی تھیں، وہ پھر بولیں۔

''میرے بھائیوں نے جتنا پیار مجھ سے کیا ہے اس کی نظیر ملنا محال ہے۔'' اب وہ اندر چلی آئیں تو دونوں ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حنان نے آگے بڑھ کر بوا کو سلام کیا تو وہ مسکرانے لگیں۔

''بیرونِ ملک سے آتے ہی تمہیں ڈھونڈنا پڑے تو میں حوریہ کے کمرے کا رخ کر لیتی ہوں۔''

''آپ بھی تو بے پناہ محبت کی مثال ہیں بوا۔'' حنان بھائی نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تو وہ سوگواری سے بولیں۔

''بس مثالیں ہی زندہ رہ جاتی ہیں۔ جن لوگوں کی وجہ سے نام، مقام اور مثال بنتی ہے۔ وہ منوں مٹی تلے سو جاتے ہیں۔'' ان کے لہجے میں سوگواری کو محسوس کر کے حنان نے موضوع بدلنے کا سوچا۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں فوراً کسی اچھی سی جگہ پر جا کر لنچ کرتے ہیں۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تو وہ دونوں بھی ہنسنے لگیں۔

''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں کھانا کھا چکی ہوں، تم لوگ چلے جاؤ اور غزنوق کو بھی ساتھ لے لو۔ وہ بے چاری تو ابھی تمہاری آمد سے لاعلم ہے۔'' بوا یہ کہہ کر جانے لگیں تو حوریہ ان کے آگے کھڑی ہو گئی۔

''آپ ہمارے ساتھ جائیں گی ورنہ ہم بھی نہیں جائیں گے کیوں حنان بھائی؟'' اس نے اپنی بات کی تصدیق چاہی تو حنان نے بھی فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ ان دونوں کی ضد کے آگے بوا کو ہار ماننا پڑی۔

غزنوق اس اچانک سرپرائز سے بہت خوش ہوئی۔ سبھی لوگ جانے لگے تو سلمیٰ بھابی اور رحمٰن بھائی جو کہ لان میں بیٹھے ہوئے تھے، حنان ان کی طرف بڑھ گیا۔ سلام دعا کے بعد ملک رحمٰن اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''بہن کے پیار میں تم اخلاقی حدیں بھی پار کرنے لگے ہو حنان!''

''میں سمجھا نہیں بابا۔'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

''کتنی دیر سے آئے ہو اور حور کے کمرے میں ہی ہو۔ میں اور تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''آئی۔ ایم سوری بابا۔'' وہ نروس ہو گیا تھا۔ ''آپ کو تو معلوم ہے کہ حور مجھے نظر نہ آئے تو میری جان پہ بن جاتی ہے۔'' وہ اپنی بات کہہ گیا تھا۔

''بہن بھائی کا پیار اچھی بات ہے مگر والدین کے حقوق بھی اٹل حقیقت ہیں۔'' ملک رحمٰن کا لہجہ ابھی تک تلخ اور دبنگ تھا۔

''آئی ایم سوری بابا۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' وہ حنان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''لنچ کرنے۔'' مختصر سے جواب نے ملک عبدالرحمٰن کو لاجواب کر دیا تھا۔ وہ خاموش ہو کر بیگم سلمیٰ کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ ان کے اثبات میں سر ہلانے پر حنان وہاں سے اپنی شاندار گاڑی کی جانب چلا گیا۔ وہ سبھی اس میں پہلے ہی سوار ہو گئی تھیں۔ حوریہ اور ماہ نور جانتی تھیں کہ حنان ملک رحمٰن جیسے سخت گیر آدمی کو قائل کر لے گا کیوں کہ اب وہ خود مختار تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ فرم کا مالک تھا۔ بیرون ملک اس کے دورے ہر مہینہ میں دو تین ہو جاتے تھے۔ اس لیے بابا رحمٰن اس پر اپنی طبیعت کا رعب کم ہی جھاڑتے تھے۔ ابھی گاڑی گیٹ سے نکلی نہ تھی کہ پولیس جیپ اندر داخل ہونے لگی تھی مگر ان کی گاڑی کو دیکھ کر جیپ ریورس ہو کر باہر ہی رک گئی۔ حنان نے اپنی گاڑی باہر نکال کر روک لی اور گاڑی سے اُتر کر پولیس جیپ سے اترنے والے ایس پی زمان کے گلے لگ گیا۔

''کب آئے ہو؟'' ایس پی زمان زندہ دل اور خوشگوار طبیعت والا پولیس مین تھا۔ حنان سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی آخر دونوں ہی فسٹ کزن تھے۔

''ابھی آ رہا ہوں اور اچھا ہوا کہ تم بھی آ گئے، چلو لنچ پر چلتے ہیں۔'' حنان کا انداز بے تکلف تھا مگر زمان نے انکار کر دیا۔ اس نے بوا کو بھی سلام کیا اور حوریہ کی چٹکی بھی بالوں سے اتار دی۔ غزنوق پیچھے تھی اس لیے اس کے کسی بھی قسم کے شرارتی ہاتھ سے محفوظ رہی۔

''زمان بھائی! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔''

''اوئے ہوئے...... کیسی زیادتی؟'' وہ حیرانگی سے حوریہ کی بات کا جواب دینے کے لیے چہرے پر مصنوعی حیرانگی جمانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"آپ بھی چلیے نا! ہمارے ساتھ کچھ لطف دوبالا ہو جائے گا۔" حوریہ نے اصرار کیا تو وہ حنان کی طرف مڑا۔

"یار! میں تو کہتا ہوں ماہم کے بعد اس کی بھی رخصتی کا پروگرام کرو، یہ بہت تنگ کرتی ہے۔"

"زمان بھائی....." حوریہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی جب کہ بوا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کی لکیر بن کر مٹ گئی۔ ان کی گاڑی آگے بڑھ گئی تو جیپ اندر داخل ہوگئی۔

زمان نے لان میں بیٹھے ہوئے تایا جی اور تائی امی کو سلام کیا ان کی خیریت پوچھی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ممتاز بیگم نے بیٹے کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور کھانا خود لے کر اسے کھانے کو دیا۔

"بس! اسی لیے میں باہر کے کھانے نہیں کھاتا ہوں۔ آپ کے ہاتھوں میں جو جادو ہے، وہ باہر کے کھانوں میں کہاں امی جی؟" بیٹے کو سامنے دیکھ کر ممتاز بیگم اس پر واری جا رہی تھی۔ ماہم کے بعد وہ اکثر اس گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ عنایت علی زمینوں کے جھنجھٹ میں پڑ کر گھر سے دور رہتے تھے اور زمان مصروفیت کی بنا پر ان سے کم ہی ملتا تھا۔

حنان بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ وہ بڑے محتاط انداز سے گاڑی ڈرائیو کرتا تھا۔ چوراہے پر سگنل آف تھا۔ اس لیے اس نے بھی گاڑی روک لی۔ انہوں نے کبھی بھی زمان کے نام اور وردی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا تھا بلکہ قانون کی پاسداری کو اپنا شعار بنایا تھا۔ ماہ نور کی نظریں باہر ٹریفک کے اژدھام پر لگی ہوئی تھیں۔ حوریہ حنان کے کان کھا رہی تھی۔ غزنوق بھی ٹریفک کے بہاؤ کا جائزہ لے کر کوئی تجزیہ کرنا چاہتی تھی۔ ایک گاڑی حنان کی گاڑی کے برابر میں آ کر رکی۔ جس میں ایک مخبوط الحواس شخص بچوں کی طرح گاڑی کی آواز منہ سے نکال رہا تھا۔

وہ ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہاتھوں اور منہ سے گاڑی چلا رہا تھا۔

اچانک اس کی نظر ان کی گاڑی پر پڑی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ منہ سے گاڑی کی آواز نکالنا بھول گیا۔ اس نے اپنے برابر کھڑی گاڑی میں ماہ نور کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ذہن پر یادیں ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عورت کو دیکھ کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اشارہ گرین ہونے پر گاڑی آگے نکل گئی مگر مخبوط الحواس شخص کی گاڑی نے یوٹرن لیا اور واپس مڑ گئی۔ اس نے گاڑی میں چھوٹی چھوٹی چیزیں جو کہ کھلونوں کی مانند تھیں اٹھا اٹھا کر ڈرائیور کو مارنا شروع کر دیں۔

ڈرائیور جو کہ مراد الحسن تھا، اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور پیچھے مڑ کر بابا کو دیکھا اور پوچھنے لگا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بابا کوئی بھی جواب نہیں دے سکے گا۔

"کیا، کیا، کیا ہوا بابا۔ آپ اتنے بے چین کیوں ہیں؟" وہ بابا کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا تو اسے جھٹکا لگا کہ بابا کو تو بہت تیز بخار ہے۔ گھر سے نکلے تو اچھا بھلا تھا۔ وہ بس یونہی شہر کی سڑکوں پر بابا کو گھمانے لایا تھا۔ اس طرح کا رویہ اس کے لیے عجیب تو نہ تھا مگر حیران کن تھا۔ بابا اس کی بات کا کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔ بس حسرت و یاس سے گزرتی ہوئی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں ہلکے ہلکے جھپاکے ہونے لگے۔ جیسے کہ کسی کیمرہ سے تصویر کھینچنے پر فلیش کے ہوتے ہیں۔ وہ اپنا سر پکڑ کر زور زور سے گاڑی کے شیشے سے ٹکرانے لگا۔

مراد الحسن یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا۔ وہ گاڑی میں بابا کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بابا اس کے ہاتھوں میں ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔ مراد الحسن نے گاڑی احمد ندیم کے کلینک کی طرف دوڑا دی۔

اس نے بابا کا ٹمپریچر چیک کیا اور گہری سوچ میں کھو گیا۔

"مسٹر جاذب! مجھے لگتا ہے کہ ان کو ماضی کا کوئی چہرہ یا پھر کوئی واقعہ یاد آیا ہے۔"

جاذب اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا، وہ کہہ بھی سکتا تھا اس لیے خاموش ہو کر سنتا رہا۔

"ان کا اس طرح ری ایکٹ کرنا ان کی صحت یابی کے حق میں جاتا ہے۔ ایسے کیسز میں مریض اگر اپنے ماضی کو کھنگالے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہوسکتا ہے۔ آپ میرا مشورہ مانیں، ان کی ذات سے جڑے ہوئے ایسے شخص کو لائیں۔ جس نے ان کے ساتھ بہت سا وقت گزارا ہو۔" جاذب مراد الحسن سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ صفدر حسین کا چہرہ اس کے سامنے گھوم گیا۔

اس نے بابا کی طرف دیکھا جو اب پرسکون ہو کر سٹریچر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ مراد الحسن کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے دیکھ کر ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دلاسہ دینے والے انداز میں بولا۔

"آپ خوش قسمت ہیں مسٹر جاذب! اپنے باپ کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ بھی تقدیر کی طرف سے ایک اعزاز ہوتا ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا اور...... مجھ جیسا ڈاکٹر بھی تقدیر کے اس اعزاز سے محروم ہے...... آپ فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ سب بہتر ہوگا۔"

وہ بابا کو لے کر گھر آ گیا۔ حمود علی حوریہ کی فلم کی مکسنگ کر رہا تھا۔ وہ بابا کو لے کر مکسنگ

روم میں ہی چلا گیا۔ بابا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حمود علی نے بابا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ مگر اس نے کوئی تاثر نہ دیا بلکہ اٹھ کر باہر جانے لگا تو ڈھولک پر گائے جانے والے گیت نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ واپس مڑا اور ہنسنے لگا، مراد الحسن بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جب بھی وہ کسی فلم کی مکسنگ کرتے تو بابا کبھی کبھار آ کر فلم دیکھنے لگتا اور ڈھولک بجنے پر گیت گانے لگتا تھا اب بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ بے ہنگم ناچنے لگا اس کی نظریں ٹی وی سکرین پر تھیں وہ اپنے منہ سے عجیب سے بے سرے سر نکال کر گیت بھی گاتا تھا۔

مراد الحسن اور جاذب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہو مبارک تجھ کو اماں کہ تیرا بیٹا لاڑا بنا ہے۔'' وہ ایک ہی مصرعہ بار بار دہرا کر گھوم گھوم کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ سکرین پر لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر گیت گا رہی تھیں جب کہ کیمرہ گھومتا ہوا ''قصرِ ماہ نور'' کی تختی پر پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں بابا بھی گھوم کر اپنا منہ ٹی وی کی طرف کر چکا تھا مگر اس کے نظریں جھپکتے ہی منظر بدل گیا تھا۔

مگر دوسرے منظر نے بابا کی بولتی بند کر دی تھی۔ اس کی چابی ختم ہو گئی تھی۔۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے سکرین پر سٹل ہونے والے سوگوار چہرے کو دیکھ کر اپنی جگہ پر جم گیا تھا۔ سکرین پر ایک لمحہ اس چہرے نے آ کر بابا فیض الحسن کو تڑپا دیا تھا۔ حمود علی نے وہ منظر بدلا تو بابا کی حالت بھی بدل گئی۔ اس نے حمود علی کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا اور کرسی سمیت نیچے گرا لیا۔ جاذب مراد الحسن اسے پکڑتا ہی رہ گیا تھا مگر حمود علی کا سر زمین سے بری طرح ٹکرا گیا تھا۔ بابا نے آگے بڑھ کر ٹی وی کو چومنا شروع کر دیا مگر حمود اور مراد نے انہیں پیچھے سے پکڑ کر زور لگا کر باہر کی طرف کھینچا۔ وہ بابا کو صحن میں لے آئے تو وہ ان سے اپنا آپ چھڑا کر پھر اس کمرے کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگا۔

حمود اور مراد کے لیے یہ حیران کن واقعہ تھا مگر انہوں نے بابا کو زبردستی اس کے کمرے میں بند کر دیا۔ وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ وہ دیوانوں کی طرح دیواروں کو ٹٹولنے لگا تھا۔ وہ باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا مگر بے سود۔ اس کے دماغ میں سوگواری کی تصویر بن کر خاموش بیٹھا ہوا وہ پُر وقار چہرہ گھوم رہا تھا۔

اس کے ہونٹ کانپنے لگے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ کھڑا رہ پاتا۔ وہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا مگر ہر بار الفاظ اس کے ہونٹوں پر آ کر دم توڑ دیتے تھے۔ اس کے دماغ میں زمانہ پیچھے کی جانب گھومنے لگا

تھا۔ اس کے سامنے فلم چلنے لگی تھی۔ اسے بہت کوشش کے بعد ایک نام یاد آیا۔ بس مانو...... وہ اس نام کو اپنی ساری قوت مجتمع کر کے پوری آواز سے پکار اٹھا۔ ''مانو...... مانو...... مانو...... مانو......'' مگر آہستہ آہستہ اس کی آواز دم توڑ گئی۔

جاذب اور حمود نے بابا کے منہ سے معمول سے ہٹ کر یہ الفاظ کسی نام کی صورت میں سنا تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔

انہوں نے فوراً دروازہ کھول دیا، بابا بے ہوش ہو کر گرا ہوا تھا۔ اسے اٹھا کر پلنگ پر لٹایا اور دونوں ہی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ ایسا پہلے کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ بابا کا اس طرح کا ردِعمل ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

مراد نے حمود علی کو بازار میں پیش آنے والا واقعہ بھی بتایا تو وہ احمد ندیم کی بات سن کر چونک پڑا کہ بابا کو کسی ماضی کی یاد یا پھر کسی چہرے نے تڑپایا ہے۔ ''میں تو کہتا ہوں جاذب بھائی، صفدر حسین بھائی کو فون کرو۔''

''ہاں! حمود علی! میں نے بھی صفدر بھائی کا ہی سوچا تھا کیوں کہ وہ بچپن سے لے کر اب تک بابا کے بہت قریب رہے ہیں۔''

مراد الحسن نے صفدر حسین کا نمبر ملانا شروع کر دیا...... مگر ہر بار ملانے پر نمبر سے رابطہ نہ ہونے کا جواب ملتا تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ بابا کی اس حالت نے اسے یک دم پریشان کر دیا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

تقریباً پون گھنٹے بعد صفدر حسین نے فون اٹینڈ کیا۔

''ہاں بھئی مراد! کیا بات ہے؟'' اس نے سی ایل آئی پر مراد کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ اس کے پاس بھی قیمتی موبائل تھا۔ جیسا ''کام'' صفدر حسین کرتا تھا موبائل تو کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

''صفدر بھائی! آپ کہاں ہو؟'' مراد الحسن کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔

''کیا ہوا مراد، میری جان! تم پریشان لگتے ہو۔'' دوسری طرف سے صفدر حسین کی پریشانی میں ڈوبی ہوئی آواز نے انہیں اپنے آپ کو حوصلہ رکھنے پر مجبور کیا تو مراد الحسن ذرا لہجہ سنبھال کر بولا۔

''نہیں صفدر بھائی! میں پریشان نہیں ہوں...... آپ اس وقت یہاں آ سکتے ہیں کیا؟''

''کوئی ضروری کام ہے تو بتاؤ، میں ابھی پہلی فلائٹ سے ہی آ جاتا ہوں۔'' صفدر حسین کی آواز سن کر وہ حیران ہوا۔

''پہلی فلائٹ؟ کیا آپ اس وقت شہر میں نہیں ہیں؟''

''نہیں میری جان! میں اس وقت تم سے سینکڑوں میل دور کراچی میں ہوں اور ابھی پہنچا ہوں۔ کل تک میرا کام ختم ہو جائے گا۔ میں پہلی فرصت میں ہی واپس آ جاؤں گا۔''

صفدر حسین کی بات سن کر اس نے ایک سانس خارج کی۔ اب وہ پوری تفصیل فون پر نہ بتا سکتا تھا۔ ''ٹھیک ہے! آپ کل پہلی فرصت میں ہی میرے پاس پہنچیے۔''

''مجھے تھوڑا سا بتا دو تا کہ میں پریشان نہ ہوں۔'' دوسری طرف صفدر بھی اتنی ایمرجنسی کال سن کر پریشان ہو گیا تھا۔

''آپ پُرسکون ہو کر اپنا کام کیجیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس آپ کو دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔''

''دھت تیرے کی ڈنگرا۔'' مرادالحسن کے مطمئن کرنے پر صفدر حسین نے مسکرا کر فون بند کر دیا۔ وہ حمود علی کو بتانے لگا۔

''اب تو بابا کے ہوش میں آنے پر ہی ان کا رویہ دیکھا جائے گا۔'' مرادالحسن نے خود کو تسلی دی۔ شام ڈھلے فیض الحسن کو ہوش آیا تو وہ کچھ نہ بولا اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت کی جو ان کی نظروں میں اس کی پہلے والی حالت سے جوڑی جاتی وہ بھی مطمئن ہو گئے۔

رات کا اختتام بخیر و عافیت ہو گیا تھا مگر صبح بھی ان کے لیے حیران کن تھی۔ بابا اپنی پہلی والی پوزیشن پر تھا، وہ کسی بھی قسم کی حرکت نہ کر رہا تھا۔ بس کل سے پہلے کی طرح بیٹھا ان کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مسکرانے لگا اور پھر منہ سے گاڑی چلانے کی آوازیں نکالنے لگا۔

بابا کی اس حرکت پر انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

''میرا خیال ہے کہ کوئی بھولا بھٹکا خیال بابا کو پریشان کرتا ہے۔'' حمود علی نے اپنی رائے دی تو مراد اس کی بات کی تائید میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

''ڈاکٹر احمد ندیم کہتا ہے کہ ایسا ہونا، مریض کے صحت یاب ہونے کی پہلی نشانی ہے اور بہت ہی زیادہ چانسز ہوتے ہیں کہ مریض اپنے ماضی کی زندگی کی طرف لوٹ کر اپنا پاگل پن کھو دیتے ہیں اور بالکل عام انسانوں جیسی اچھی زندگی گزارنے لگتے ہیں، بالکل نارمل لوگوں کی طرح۔''

''اچھا تو پھر!...... ذرا گھڑی کی طرف دیکھ لینا۔'' حمود علی نے مراد کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تو وہ پہلے گھڑی کو اور پھر حمود کو حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب؟'' وہ استفہامیہ انداز میں حمود علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''سر! اسٹیڈیم کے نزدیک ''پیزا ہٹ'' پر آ جایئے گا۔'' وہ نسوانی آواز میں بولا تو مرادالحسن اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔

''اوہ، مائی گاڈ! مجھے تو پہلے پہنچنا چاہیے تھا۔'' وہ بھاگ کر باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

حمود علی نے اس کی گھڑی پر وقت دو گھنٹے پیچھے کر کے پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم سے ملا دیا کیوں کہ دو گھنٹے آگے بھی اسی نے کیا تھا۔ وہ مراد کی ذہنی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

مراد بہترین پینٹ شرٹ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ وہ اور حمود سمجھ گئے تھے کہ حوریہ کی آواز ہے مگر حوریہ مرادالحسن کی آواز نہ پہچان سکی تھی۔ اس نے بالکل تیار ہو کر گھڑی پر نگاہ ڈالی تو حیران رہ گیا، کیوں کہ ابھی تو تین ہی بجے تھے۔

''حمود علی!...... حمود کے بچے!'' وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ حمود کی شرارت ہے۔ اس نے گھڑی کی سوئیاں آگے پیچھے کر دی تھیں مگر حمود باتھ روم میں گھس گیا تھا۔

مراد کا موڈ تھا کہ وہ حوریہ کو ذرا ستائے گا۔ اگر وہ ذہین ہوتی تو خود ہی ''گیس'' کرے گی کہ مرادالحسن جاذب ہی ہے۔ اگر نہ کر سکی تو وہ خود ہی بتا دے گا۔ اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے اس کا پہلے پہنچنا ضروری تھا۔

وہ ٹھیک ساڑھے تین بجے پیزا ہٹ کی ایک ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کولڈ ڈرنک منگوا کر ویٹر کو آرڈر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ جب کوئی میڈم ان کے سامنے بیٹھے تو اس کے اشارے پر ہی پیزا لے کر آئے۔

ٹھیک چار بجے حوریہ اندر داخل ہوئی تو یہ بات کنفرم ہو گئی کہ انہوں نے حوریہ کی آواز کو ٹھیک پہچانا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی ہوئی مختلف ٹیبلز پر دیکھ رہی تھی۔ مرادالحسن نے جان بوجھ کر منہ نیچے کر لیا تھا مگر حوریہ نے مراد کو دیکھ لیا تھا وہ سیدھی اسی طرف بڑھی۔

''السلام علیکم!'' اس کی آواز سن کر مراد نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔

''وعلیکم السلام! آپ......؟'' اس نے حوریہ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ اس طرح آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔'' حوریہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! اب ملاقات تو ہو ہی گئی ہے ہماری مووی کا کیا بنا؟''

''سب سے پہلے تو آپ بتائیں کہ کیا لیں گی؟ کولڈ ڈرنک؟...... یا پھر پیزا؟'' مراد

الحسن نے مہمان نوازی کی۔ لات پر لات رکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''دراصل میں یہاں کسی سے ملنے آئی ہوں مگر پرابلم یہ ہے کہ..... یہاں پہنچ کر سمجھ میں نہیں آیا کہ جن سے ملنا ہے میں اسے کیسے پہچانوں گی؟'' وہ فکرمند ہو رہی تھی اور یہ بات بھی تھی کہ ان دونوں نے ملاقات کا وقت اور جگہ کا تعین کر لیا تھا مگر پہچان بتانا بھول گئے تھے۔

''تو..... کیا آپ ان سے پہلی بار ملنے والی ہیں؟''

''جی ہاں! اتفاق ہے کہ آپ بھی شاید ان سے مل کر خوش ہوں؟''

''میں؟..... مگر کیوں؟'' وہ حیرت سے بولا تو حوریہ نے جواب دیا۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ بک سپاٹ پر پہلی بار جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے بھی وہی کتاب پسند کی تھی جو میں پکڑنے کے لیے بڑھی تھی۔''

''ہاں..... ہاں مجھے یاد ہے۔'' وہ ذہن پر مصنوعی سا زور دیتا ہوا بولا۔

''بس اس کتاب کے شاعر سے ملنا ہے اور انہوں نے مجھے یہیں ملنے کا کہا تھا۔'' حوریہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی مگر مایوسی ہوئی۔ بہت سے ایسے مرد تھے جو بالکل اکیلے ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر وہ ان سے جا جا کر تو نہ پوچھ سکتی تھی کہ آپ میں سے مرادالحسن کون ہیں؟

''میرا خیال ہے کہ آپ کے شاعر صاحب نے آپ کو فاؤل کیا ہے؟'' مرادالحسن نے ویٹر کو اشارہ کر دیا۔ اسی نے کولڈ ڈرنک سرو کیا اور دوبارہ پیزا لینے چلا گیا۔ حالانکہ وہاں پر سیلف سروس تھی لیکن مراد نے ان کی منت کر کے ایک ویٹر کو منا لیا تھا۔ حوریہ کولڈ ڈرنک کے ہلکے ہلکے سپ لینے لگی تو اس کی نظریں بھی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں مرادالحسن بڑے انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا۔

قدرت نے کوئی بھی کمی نہ رکھی تھی۔ حسن کی دولت سے تو مالا مال کیا ہی تھا۔ قد کاٹھ اور پھر اس کی چال بھی ہوش بھلا دینے کے لیے کافی تھی۔ اس کی گفتگو کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی باغبان اپنے گلستان میں لگے ہوئے خوبصورت پودوں اور پھولوں کی دیکھ بھال کے لیے نرم اور محبت بھرے ہاتھ استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے منہ سے الفاظ ایسے ادا کرتی تھی جیسے کہ پیار اور محبت سے ادا نہیں کرے گی تو الفاظ زخمی ہو جائیں گے۔

مرادالحسن نے اسے کئی طرح کے مختلف لباسوں میں دیکھا تھا اور ہر بار ایسا ہی لگا تھا کہ بالکل ہی پرفیکٹ۔ اب بھی وہ سیاہ جینز اور کاٹن کی شرٹ کے اوپر جیکٹ زیب تن کیے ہوئے تھی۔ اس کا رنگ کھلا ہوا تھا، اس کے سرخ یاقوتی ہونٹ گلابوں کی رنگت کو بھی ماند کر رہے تھے۔

ویٹر کے آنے پر وہ چونکا تو حوریہ بھی حیران رہ گئی۔

''آپ نے خواہ مخواہ ہی تکلف کیا، دراصل میں نے آج ان کو ملنا تھا اور بل بھی میں نے ہی ادا کرنا تھا۔'' وہ خاصی کنفیوز ہو رہی تھی۔

''یہ کوئی تکلف نہیں بلکہ میرے لیے اعزاز ہے کیوں کہ میں اکیلا ہی آیا تھا اور اب آپ کا ساتھ مل گیا ہے تو ذرا انجوائے ہو جائے گا۔'' مرادالحسن نے پیزا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تھینکس!'' وہ دونوں ہی پیزا کھانے میں مصروف تھے۔ اپنا کام بھول کر حوریہ کو بھی مراد کی قربت نے مسحور کر دیا تھا۔ وہ بھی کن انکھیوں سے مراد (جاذب) کا جائزہ لے رہی تھی۔

وہ مردانہ وجاہت کا شاندار نمونہ تھا اور جنسِ مخالف کے لیے بہت پُرکشش نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر حوریہ نے مایوسی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو وہ بول پڑا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ بھی آپ کو ڈھونڈ رہے ہوں؟''

''مگر مجھے تو کسی بھی ٹیبل پر میری طرح بے چین کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔'' وہ خفت مٹاتے ہوئے بولی تو مرادالحسن ہنسنے لگا۔

''وہ شاعر ہیں، ان کی طبیعت میں بے چینی اور بے قراری تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی بے قراری کو قرار آ گیا ہو؟''

''مسٹر جاذب! باتیں تو آپ بھی اچھی کر لیتے ہیں پھر شاعری کیوں نہیں کر لیتے؟''

''مس حوریہ! اپنے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہم تو ٹھہرے پروفیشنل ویڈیوگرافر اور شاعری تو حساس ترین جذبوں کا نام ہے۔ نہ..... بابا..... میں تو باز آیا اس کام سے۔''

حوریہ اس کے اس انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اچھا تو ہماری مووی؟ آپ کے وعدے کے مطابق کل پندرہ دن ہونے والے ہیں۔''

''میں اپنے کام سے محبت کرنے والا آدمی ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

''تو پھر کل کس وقت آؤں؟''

''آپ کا مطلب ہے کہ دکان پر؟''

''ہاں!'' اس کی مختصر سی ہاں میں بھی کئی الفاظ چھپے ہوئے تھے مگر ان کو زبان دینے کی ضرورت تھی۔

''کل......آٹھ بجے شام کو آجایئے گا۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

''آٹھ......رات کو بجتے ہیں شام کو نہیں۔'' وہ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگی۔ وہ اچانک چونک پڑی۔ اس نے خوش ہو کر چٹکی بجائی تو مراد بھی حیران رہ گیا۔ اس نے ہینڈ بیگ سے اپنا موبائل نکالا اور اس پر شاعر مرادالحسن کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''میں بھی کتنی بیوقوف ہوں، یونہی وقت برباد کر دیا۔''

''برباد......؟''

''آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تھا کہ مجھے عقل ہی نہ آئی کہ ان کے موبائل پر ہی رِنگ کرلوں۔'' اس نے ڈائل کرنے کے بعد موبائل اپنے کان سے لگایا تو مراد کی روح فنا ہو گئی مگر اس کی کسی بھی پاکٹ میں رِنگ کی آواز نہ ابھری تو وہ مطمئن ہو گیا۔ تیزی میں آنے کی وجہ سے اس کا موبائل گاڑی میں ہی تھا اور پیزا ہٹ کے باہر پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں کہیں بیل ہو رہی ہو گی۔

حوریہ نے کئی مرتبہ ٹرائی کرنے کے بعد مایوس ہو کر موبائل بند کر دیا۔ اس دوران مراد بل ادا کر چکا تھا۔ وہ دونوں ہی مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''او کے! پھر کل شاپ پر ملاقات ہو گی۔'' حوریہ کو شاید جلدی تھی اور مراد کو بھی جلدی گھر پہنچنا تھا کیوں کہ صفدر بھائی آگئے ہوں گے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی موبائل پر مسڈ کال دیکھیں تو حوریہ کا نمبر تھا۔ حمود علی کی طرف سے کوئی مسڈ کال نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ صفدر بھائی ابھی تک نہیں پہنچے ہوں گے۔

☆=====☆=====☆

اس نے بے دلی سے اپنا بیگ بیڈ پر پھینک دیا، اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے کیوں نہیں پوچھا کہ وہ کون سا لباس پہنے ہوں گے؟ یا پھر کون سی ٹیبل پر بیٹھے ہوں گے؟ ہوسکتا ہے وہ وہیں پر موجود ہوں اور اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں مگر انہیں بھی کیا پتا کہ میں ہی حوریہ ہوں اور ان سے ملنے آئی ہوں۔ اس نے ڈائری نکال کر شاعر مراد الحسن کا ایڈریس پڑھنا شروع کر دیا۔

کچھ بھی ہو جائے وہ اس شاعر سے ضرور ملے گی۔ پتا نہیں کیسے ہوں گے۔ گنجے سے، بھدے سے، موٹے سے یا پھر سمارٹ، دبلے یا پھر بالکل ہی ینگ، جیسے......؟ کیسے......؟ وہ کوئی بھی تشبیہہ نہ دے سکی مگر فوراً ہی چہک اٹھی۔ جیسے جاذب ہیں......مگر جاذب ہی کیوں؟ زمان اور حنان کی طرح بھی تو ہوسکتے ہیں۔

ہاں ہو تو سکتے ہیں اگر شخصیت کا موازنہ نہ کریں تو جاذب گریس فُل ہے۔ بس یہ میرے دل کا فیصلہ ہے کہ مراد الحسن جاذب جیسے ہی ہوں گے۔ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اونگھنے لگی۔ ماہ نور بوا نے اسے اونگھتا دیکھ کر اس پر لحاف دینا چاہا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا مگر بوا کو دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اس کے سامنے آکر بیٹھ گئیں۔

''کیا ہوا؟......وہ تمہاری ملاقات شاعر صاحب سے ہوئی یا نہیں؟'' بوا نے پوچھا تو اس نے تمام داستان سنا دی۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ ''وہ تو وہاں پر جاذب مل گئے تو وقت کا پتا ہی نہیں چل سکا ورنہ میں تو سخت بور ہو جاتی۔'' وہ بوا کو بتا رہی تھی تو بوا جاذب کا نام سن کر چونک گئیں۔ یہ نام انہوں نے پہلے بھی سنا تھا، کہاں سنا تھا؟ انہیں ذہن پر زور دینے کی ضرورت تھی۔

''یہ جاذب کون ہے؟''

''وہی......جنہوں نے ماہم کی ویڈیو گرافی کی ہے۔'' وہ پھر لیٹ گئی تھی۔

''میں بھی کہوں کہ یہ نام سنا سنا سا لگ رہا تھا مجھے یاد نہیں آ رہا تھا تم پورا نام بتاتیں تو مجھے فوراً یاد آ جاتا۔''

''پورا نام......؟'' وہ چونکی۔

''ہاں پورا نام! جاذب مرادالحسن!'' بوا نے کہا تو وہ مزید چونکی ہوگئی۔ ''اچھا تم آرام کرو۔'' یہ کہہ کر بوا اس کے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر گئیں مگر اس کے ذہن میں شک کا کانٹا بو گئی تھیں۔ ''کہیں جاذب ہی تو مرادالحسن نہیں ہیں؟'' وہ سوچنے لگی۔

اس کا فون کرنا اور جاذب کا اس سے پہلے وہاں موجود ہونا اور پھر پیزا کا آرڈر بھی غالباً پہلے ہی دیا ہوگا......مگر موبائل پر بار بار رنگ ہو رہی تھی۔ وہ تو جاذب کے پہلو میں کھڑی تھی، پھر جاذب کا موبائل کیوں نہیں چیخا؟ وہ اپنے اندازوں کو کسی بھی منزل تک پہنچانے میں قاصر ہوگئی تو اونگھنے لگی۔

☆=====☆=====☆

صفدر بھائی فیض الحسن، مرادالحسن اور حمودعلی اس وقت گھر کے صحن میں کھانا کھا رہے تھے۔ صفدر حسین نے کوئی بھی بات کھانا کھانے کے بعد کرنے کو کہا تو سبھی نے خاموشی سے کھانا شروع کر دیا۔ فیض الحسن تو سدا کا خاموش تھا۔ اس کی زبان کو تالا لگ گیا تھا۔ وہ کوئی بھی بات کرتا تو اس کا مقصد کچھ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ اُوٹ پٹانگ الفاظ بول کر خاموش ہو جاتا تھا۔

''ڈاکٹر احمد ندیم کیا کہتا ہے؟'' اس نے مراد سے پوچھا تو وہ کل دن بھر کی داستان سنانے لگا۔

''صفدر بھائی! بابا نے کبھی بھی ایسا ری ایکٹ نہیں کیا۔ بس چوراہے تک بالکل ٹھیک تھے۔ اس کے بعد سگنل پر گاڑی رکی تو وہ خاموش رہے مگر جیسے ہی میں نے یوٹرن لیا۔ انہوں نے کھلونے اٹھا اٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دیئے۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی کیفیت سمجھتا۔ انہوں نے اپنا سر گاڑی کے شیشوں سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ میں پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ کوئی ماضی کی یاد یا پھر کوئی ایسا چہرہ ان کی نظروں کے سامنے گھوم گیا ہے۔ جس سے ان کی یہ حالت ہوئی ہے اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ایسے کیسز میں مریض بہتری کی جانب رجوع کرتا ہے۔'' مرادالحسن۔ نے بتایا تو صفدر حسین سنجیدگی سے بولا۔

''اس میں پریشانی والی تو کوئی بات نہیں ہے تم تو بہت زیادہ گھبرائے ہوئے تھے۔''

''ہم جب بھی کسی فلم کی ایڈیٹنگ کرتے ہیں تو بابا کو بھی ساتھ کمرے میں بٹھا لیتے ہیں تاکہ ان کا دل بہل سکے اور وہ اپنا دھیان بٹا سکیں مگر کل کی ایڈیٹ ہونے والی فلم دیکھ کر بابا نے عجیب ری ایکٹ کیا۔ انہوں نے حمودعلی کو گریبان سے پکڑ کر کرسی سے نیچے گرایا اور پھر آگے بڑھ کر ٹی وی کی سکرین پر دیوانگی کی حدوں سے بڑھ کر چومنے لگے۔ ہم دونوں کے لیے یہ عجیب جھٹکا تھا ہم نے بابا کو بمشکل قابو کر کے کمرے میں بند کر دیا۔ انہوں نے دروازہ زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ اگر دروازہ نہ کھلا تو یہ توڑ دیں گے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ان کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور ایک لفظ......''مانو'' بھی نکلا، جس کی شدت......''

''کیا لفظ نکلا......؟'' صفدر حسین نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور چونک کر پوچھا۔

''مانو!'' ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر یک زبان ہو کر کہا تو صفدر حسین کے چہرے پر تناؤ آ گیا۔ اس کے اعصاب تن گئے، وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے وہ شادی کی فلم دکھا سکتے ہو جس کو دیکھ کر بابا کی یہ حالت ہوئی تھی۔''

''ہاں! صفدر بھائی! وہ میں نے آج ہی مکمل کی ہے اور ہم آج ہی انہیں دینے والے تھے۔''

حمودعلی نے کہا تو وہ تینوں ہی اٹھ کر مکسنگ روم میں آ گئے۔ حمودعلی نے مکس کی ہوئی کاپی چلا دی۔ صفدر حسین نے فارورڈ کرنے کا کہا تو فلم فارورڈ ہونے لگی۔

ایک کمرے کا منظر تھا۔ جس میں ملک عبدالرحمٰن، ملک عنایت علی، ماں جی اور کچھ دوسرے لوگ جمع تھے مگر کیمرہ گھومتا ہوا ماہ نور پر آ کر رک گیا تو صفدر حسین کی سانسیں بھی رک گئیں۔ اس نے مانو چاچی کو حسرت و غم کی تصویر بنے ہوئے دیکھا تو اس کا دل تڑپ گیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے۔ اس نے حمودعلی کو فلم بند کرنے کا کہا اور باہر آ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں صاف کرنا چاہیں مگر سامنے فیض الحسن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں مزید دھندلا گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر فیض الحسن کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''مدہوشی اور پاگل پن میں زندگی کے حسین ترین دن گزارنے کے بعد......اب کیوں خوشیوں کے متلاشی ہو؟ تمہارا دیوانہ پن تمہاری زندگی کی ضمانت ہے......مگر ان کا کیا کروں؟ جو تمہیں روزانہ دیکھ کر تمہارے اچھا ہونے کی امید پر اپنا دن گزار دیتے ہیں...... میں اب

مجبور ہوں؟'' وہ یہ کہہ کر واپس پلٹا تو حمود علی اور مراد کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ واپس آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

صفدر الفاظ کو جمع کر کے داستان سنانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ فیض الحسن اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

''مراد الحسن! اپنے بابا کی زندگی کی حفاظت کر سکتے ہو؟'' یہ انوکھا سوال تھا جو صفدر بھائی نے مراد سے کیا تھا وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کھل کر کہیں صفدر بھائی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بابا کے جسم پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دوں گا۔'' وہ جذباتی ہو گیا تھا۔

''اس فلم میں جو پُر وقار اور حسرت ویاس کی تصویر بنی عورت تم نے دیکھی ہے وہی مانو ہے۔''

''مانو؟'' دونوں کے منہ سے یک دم نکلا تو صفدر حسین سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں! قصرِ ماہ نور کی ماہ نور۔ مانو...... چاچا کا اس طرح پکارنا ثابت کرتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول گیا ہے مگر مانو چاچی کو نہیں بھولا۔''

''مانو چاچی!؟ صفدر بھائی...... میرے ضبط کا امتحان مت لیں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا یا پھر آپ ہمیں جھوٹی کہانی سنا کر بہلانا چاہتے ہیں، پلیز سچ کیا ہے؟ ہمیں بتا دیں آپ کو بابا کا واسطہ۔'' مراد باقاعدہ رونے لگا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں مراد الحسن! ماہ نور، مانو تمہاری امی ہیں۔'' صفدر حسین کی زبانی یہ سننا تھا کہ مراد آنکھیں کھول کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ حمود علی کو بھی صفدر بھائی کی ذہنی رو بہک جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ان دونوں کو کبھی بھی اس کی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ اس نے اٹھ کر فیض الحسن کے کمرے کی طرف دیکھا تو وہ بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ واپس آ کر صفدر حسین نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر فیض الحسن کی داستان بیان کرنا شروع کر دی۔ جب وہ پہلے دن شہر آیا تھا۔

☆=====☆=====☆

قبرستان کے مجذوب نے ماہ نور اور حوریہ کی طرف حیرانی سے دیکھا! وہ پھر ان کی گاڑی کی نگرانی کرنے لگا۔ حوریہ بھی اسے حیرانگی سے دیکھ رہی تھی کیوں کہ اس کے اندازے کے مطابق اس مجذوب کی عمر کوئی بیس یا بائیس سال ہو گی مگر اس کے چہرے پر صاف ستھری

داڑھی تھی۔ اس کے کپڑے بھی صاف تھے۔ اس نے وہی سوٹ پہنا ہوا تھا جو پچھلے چکر پر ماہ نور نے اسے دیا تھا۔ حوریہ نے پچھلی مرتبہ بھی ایک بات نوٹ کی تھی اور اس بار بھی اس نے غور کیا تھا کہ نوجوان مجذوب کے ہونٹ متحرک تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ پڑھتا ہو گا۔ ماہ نور کی حالت اب بھی ویسی تھی جیسی پہلے چکر میں تھی۔ اس نے رو رو کر فیض الحسن اور مراد الحسن کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی تھی۔ حوریہ نے آج مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ماہ نور بوا سے مکمل تفصیل سن کر ہی رہے گی، اس دن بوا نے اسے ٹال دیا تھا۔

اب بھی وہ دعا وغیرہ سے فارغ ہو کر قبرستان سے باہر نکلیں تو وہی دیوانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تو حوریہ خوف زدہ ہو گئی مگر وہ ہنسنے لگا۔

''اپنے دل کو ٹٹولو، اس کی گواہی سچی ہے، مرنے والے زندہ ہیں، زندہ ہیں، وہ مرنے والے ہیں۔'' حوریہ نے ہمت کر کے اس کا نام پوچھ لیا تو وہ ہنسنے لگا۔

''نام تو خاندان کی پہچان کے لیے ہوتا ہے۔ مجذوب، فقیر، درویش اور فقیر کا بس ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اور وہ ہے ''عبداللہ'' (اللہ کا بندہ) بس سمجھ لے بی بی۔ میں بھی عبداللہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تمہاری پیشانی بتا رہی ہے کہ تم سدا خوش رہو گی۔ عنقریب بہت سی خوشیاں تمہاری چوکھٹ پر دستک دیں گی۔ بس فوراً ہی دل کے دروازے کھول دینا کیوں کہ خوشیاں اور خوش قسمتی ایک بار ہی دستک دیتی ہیں۔'' اس نے حوریہ سے کہا اور اب ماہ نور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیوں در بدر پھرتی ہو بی بی۔ اللہ سے مدد مانگو، تمہاری پریشانی بتاتی ہے کہ تم سہاگن ہو، بیوگی اور حسرت ویاس کا کفن اترنے والا ہے۔ اللہ کی کتاب پڑھا کرو، بہت فیض ملے گا۔'' یہ کہہ کر وہ قبرستان کے اندر چلا گیا اور تھوڑی دور جا کر ہی دو قبروں پر فاتحہ کہنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ان قبروں کے کتبے پر دفن ہونے والوں کے نام درج تھے۔ ایک پر ''فاطمہ زوجہ قادر علی'' اور دوسری پر ''قادر علی ولد سراج دین'' درج تھا۔

عبداللہ نے ان قبروں پر فاتحہ خوانی کرنے کے بعد بلند آواز سے دعا مانگنا شروع کر دی۔ جس کا لُب لباب یہ تھا کہ ''اے مالک میرے والدین پر اپنی رحمتیں نازل فرما اور ان کی مغفرت فرما۔''

☆=====☆=====☆

ماہ نور عبداللہ کی باتوں سے پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ سہاگن ہو، بیوگی اور

حسرت کا کفن اترنے والا ہے۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تو ماہ نور نے حوریہ کی طرف دیکھا، جو خاموش تھی۔

''عبداللہ کی باتوں پہ غور کر رہی ہو حور؟''

''ہاں بوا!'' اس نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں اس کی باتوں میں سچائی لگتی ہے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی کیوں کہ ان کی باتیں معرفت کی ہوتی ہیں۔ ان کی کہی ہوئی باتوں کا آہستہ آہستہ مطلب واضح ہوتا ہے۔''

''تم بھی یقین کر رہی ہو، دیکھو! اس نے کہا ہے کہ میں سہاگن ہوں، جب کہ ان قبروں کی حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا۔''

''آپ کب سے یہاں آ رہی ہیں؟'' یہ انوکھا سوال سن کر ماہ نور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''گزشتہ بیس سال سے۔ تب ان قبروں کی مٹی تازہ تھی اور ان پر پڑی ہوئی گلاب کی پتیوں سے خوشبو آ رہی تھی۔'' ماہ نور کئی برس پیچھے کی طرف لوٹ گئی تھی۔

''بوا آپ کو سچ بتانا ہوگا کہ فیض الحسن کی کہانی کیا ہے؟ وہ کون تھا؟ ڈرائیور تھا میرا انکل کیسے بنا؟ وہ کیسے فوت ہوئے؟ مجھے یہ کہانی اُلجھی ہوئی لگتی ہے۔ پلیز بوا آج اس زنجیر کی کڑیاں کھول دیں۔'' وہ گاڑی کو بازار کی طرف موڑتی ہوئی بولی۔

''ہمیں گھر چلنا چاہیے حور!'' وہ فکرمندی سے بولیں۔

''جاذب سے مووِیز تو لے لیں جا کر انجوائے کریں گے۔'' حوریہ نے گاڑی فیض مووِیز کے سامنے روکی تو ماہ نور کو زور کا جھٹکا لگا۔ اس نام کی وجہ سے وہ اَپ سیٹ ہو گئی تھیں۔ وہ بھی جاذب کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھیں مگر وہ دکان پر نہیں تھا۔ دکان پر موجود لڑکے شاکر نے بتایا کہ۔ ''ابھی آپ کی مووِیز میرے پاس نہیں پہنچی ہیں۔ آپ پلیز اپنا رابطہ نمبر دے دیں جونہی مووِیز آئیں گی میں آپ کو کال کر دوں گا۔''

حوریہ نے اسے اپنا نمبر لکھ دیا۔ ماہ نور کو اس شاپ سے اپنائیت کی خوشبو آنے لگی تھی مگر یہ سب کیا تھا وہ اس کو کوئی نام نہ دے سکتی تھی۔ گاڑی اب قصرِ ماہ نور کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

گھر پہنچتے ہی حوریہ ماہ نور کو اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ غزنوق کمپیوٹر پر گیم کھیلنے میں مصروف تھی۔ حوریہ نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ اب وہ اور ماہ نور بوا تھیں۔

ماہ نور بوا غم اور افسردگی کی تصویر بن گئی تھیں۔ وہ ان گزشتہ بیس برسوں سے کبھی بھی نہ

نکل سکی تھیں مگر آج ان برسوں کو کھنگالنا تھا، وہ مناسب الفاظ تلاش کرنے لگیں تو حوریہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ بالکل ایسے خاموش بیٹھی تھی جس طرح کہ اس کی کوئی من پسند فلم شروع ہونے والی ہو۔

ماہ نور کو وہ دن آج بھی یاد تھا جب اس نے فیض الحسن کو منظر علی کے ساتھ اپنے گھر کے لان میں گھاس پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کے دل کی دنیا کھل اٹھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ خلافِ توقع بنجر زمین بھی اناج دینا شروع کر دے۔

☆=====☆=====☆

صفدر حسین اور ان دونوں کی آنکھیں بھی برسات برسا رہی تھیں۔ اس تمام داستان میں اس نے اپنا لیڈیز والا کردار نہ بتایا تھا اور نہ ہی بنک ڈکیتی کا کہیں تذکرہ کیا تھا۔

''میں نے زندگی میں محبت نہیں کی اور نہ ہی شادی کی۔ بس میں نے چاچے فیض الحسن سے عشق کیا ہے۔'' صفدر حسین کی بھرائی ہوئی آواز میں دُکھ اور غم نمایاں تھے۔

''مرادالحسن! تمہارا نام جاذب چاچے قادر علی اور چاچی فاطمہ نے رکھا تھا۔ بس مجھے قادر علی کے الفاظ یاد ہیں کہ اس کا اپنا ہی کوئی باپ بیٹے کا قاتل ہے۔ یہ تب تک نہ بتانا جب تک یہ دونوں ہی ذہنی اور عملی طور پر اپنے دماغ اور پاؤں پر مکمل طور پر کھڑے نہ ہو جائیں۔ مرادالحسن! اب باپ کی ذمہ داری سنبھالو۔ اب میرا خیال ہے کہ چاچے کو ٹھیک ہونے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔'' صفدر حسین اب اپنی آواز پر قابو پا چکا تھا۔

''صفدر بھائی! ماہ نور میری والدہ ہیں؟'' مرادالحسن حیرانگی سے بولا تو صفدر حسین ہنسنے لگا۔

''اب بھی کوئی شک ہے؟''

''مگر میں ان سے اس رشتے کے حوالے سے کیسے ملوں گا، ان کی نظروں میں ہم تو مر چکے ہیں۔'' مرادالحسن کا لہجہ تڑپا دینے والا تھا۔

''ابھی تم ان سے اس رشتہ سے نہیں ملو گے کیوں کہ چاچا قادر کے مطابق ابھی تمہارے قاتلوں کو ڈھونڈنا ہے۔ آستین کے سانپ کو باہر نکالنا ہوگا۔ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم حوریہ عبدالرحمٰن سے تعلق بناؤ...... بلکہ میرا خیال ہے کہ بن ہی گئے ہوں گے۔'' صفدر حسین نے کہا تو مرادالحسن خفیف سی مسکراہٹ سے ان کا جواب دینے لگا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ڈنگرا! یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے تم شاعر بھی ہو اور ویڈیو گرافر بھی۔

دونوں باتیں ہی تمہارے حق میں ہیں۔ اپنے داؤ آزماؤ اور کام میں اس قدر آگے نکل جاؤ کہ دشمن کی دُکھتی رگ دبا سکو۔"

"صفدر بھائی! ان تمام کرداروں میں ملک عبدالرحمٰن کا کردار مشکوک ہے۔ ان کی طبیعت اور لہجے کی سختی، تلخ مزاج اور پھر اپنی بہن یعنی آنٹی مانو کو بار بار زچ کرنا۔ ان کے راستے میں دیوار بننا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان سے ہی آغاز کرنا چاہیے۔" حمود علی کی بات میں وزن تھا۔ صفدر اور مراد نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیے۔

"مگر ایک بات یاد رکھنا مرادالحسن! چاچے کو تندرست ہونے کے بعد فوراً ہی مانو چاچی سے نہ ملوانا، یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں، صفدر بھائی!"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر احمد ندیم کو بھی اپنا راز دار بنا کر تمام معاملہ اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اسے گھر بلوا کر چاچے فیض الحسن کو یہ فلم دوبارہ دکھاتے ہیں۔ باقی وہ جو بھی مشورہ دے۔ اس پر عمل کر کے ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اس طرح چاچے کا علاج بھی ممکن ہے کہ کامیاب ہو!" صفدر حسین نے انہیں مشورہ دیا۔

"قصر ماہ نور تمہارا ننھیال ہے مرادالحسن! اور تم دیکھنا ایک دن بڑی آن بان سے تم اس گھر کے داماد بھی بنو گے اور یہ ملک عبدالرحمٰن کے خاندانی وقار پر بھرپور دھبہ ہوگا۔ اس کی آن اور غرور اسی وقت خاک میں مل جائے گا۔ جب تم فیض الحسن کے بیٹے بن کر اس کے داماد بنو گے۔" صفدر حسین نے پُرعزم ارادے سے یہ بات کی تو مرادالحسن اور حمود بھی مسکرا اٹھے۔

اس فلم کی کاپیاں کر لی گئی تھیں۔ اب ڈاکٹر احمد ندیم سے رابطہ کرنا تھا۔ وہ کام بھی ہو گیا تو ڈاکٹر کو گھر بلا کر تمام صورت حال سمجھا دی گئی تھی۔ اس نے اپنا میڈیکل باکس ایک طرف رکھا اور فلم دیکھنے کے لیے صحن کا انتخاب کیا، صحن سے تمام آہنی اور فولادی چیزیں ہٹا دی گئی تھیں۔

ڈاکٹر احمد ندیم حیران ہو کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے مریض کی تندرستی کی خاطر ان کی کہانی کا کردار بن گیا تھا۔

پروگرام کے مطابق وہ تمام لوگ چھت پر منڈیروں سے جھانکنے لگے۔ ڈاکٹر نے فلم سٹارٹ کر کے اندر سے فیض الحسن کا ہاتھ پکڑ کر اسے صحن میں ایک کرسی پر لا کر بٹھا دیا۔ وہ حیرانگی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا مگر جب ٹی وی پر ڈھولک کی تھاپ سنی تو فیض الحسن کے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔ بے ربط الفاظ اس کے منہ سے ادا ہونے

لگے۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر ڈھولک کی تھاپ پر ناچنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ گنگناتا بھی جا رہا تھا اور گھوم گھوم کر ناچ بھی رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے اب تھوک بہنے لگا تھا مگر کیمرہ قصرِ ماہ نور کی تختی سے ہوتا ہوا ماہ نور کی سوگوار شخصیت پر آ کر رکا تو فیض الحسن کی حرکات بھی رک گئیں۔ وہ غور سے ٹی وی کی سکرین کو دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر احمد ندیم ہر طرح کی "واردات" سے نپٹنے کے لیے تیار تھا۔ وہ لوگ بھی فیض الحسن کی کیفیت کو دیکھ رہے تھے۔

فیض الحسن آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ مکسنگ کی بدولت ماہ نور کی تصویر سکرین پر سٹل ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر ٹی وی سکرین پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ گویا وہ اندازہ کر رہا ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ کتنے ہی جان لیوا لمحات ایسے گزر گئے۔ وہ تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر احمد ندیم نے ریموٹ سے ٹی وی کی سکرین آف کر دی تو فیض الحسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ...... وہ...... وہ میری...... مانو تھی...... کک...... کک کہاں گئی، پھر کھو گئی؟" اس نے ڈاکٹر کی طرف حیرانگی سے دیکھ کر پوچھا تو ڈاکٹر نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ اس کا ری ایکٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سکرین روشن کر دی۔

"فیض الحسن!"

"ہوں......" فیض الحسن کی طرف سے ہلکا سا اشارہ ملنے پر ڈاکٹر نے بات آگے بڑھائی۔

"تمہاری مانو کھوئی نہیں ہے۔" وہ ڈاکٹر کی طرف حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر...... کک...... کہاں ہے؟" وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جواب دے رہا تھا۔

"وہ مراد کو دودھ پلانے گئی ہے۔" ڈاکٹر احمد ندیم واقعی انٹرسٹڈ تھا کہ فیض الحسن صحت یاب ہو جائے۔

"مم...... مم...... مراد...... مراد...... میرا مراد...... روتا ہوگا۔" وہ ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور ڈاکٹر اسے باتوں میں اُلجھا کر اسے آہستہ آہستہ گزشتہ برسوں کی باتیں یاد دلانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"ہاں! فیض الحسن! تمہارا مراد رو رہا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" اب اس فقرے میں اس کی لکنت ختم ہو گئی تھی۔ خوشی کے مارے مراد

کے آنسو نکل آئے تھے مگر صفدر حسین نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے آنسو پی کر باپ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''وہ ابھی آجاتا ہے، باہر گیا ہے۔'' ڈاکٹر احمد ندیم کا اشارہ سمجھ کر مراد الحسن آہستگی سے سیڑھیاں اتر کر اس کے پیچھے آن کھڑا ہوگیا۔

''مانو کے ساتھ گیا ہے......دونوں......ہی گم ہوگئے ہیں۔'' وہ اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر بولا۔

''نہیں۔ وہ دونوں ہی تمہارے پیچھے کھڑے ہیں، مڑ کر دیکھو!'' اس کا انداز ایسا تھا کہ اسے ڈاکٹر کی بات کی سمجھ نہ آسکی تھی، وہ ششدر رہ گیا تو ڈاکٹر پھر بولا۔

''مراد اور مانو......تمہارے پیچھے۔'' اس بار ڈاکٹر نے ہاتھ کا اشارہ پیچھے کی جانب کیا تو وہ گھوم گیا مگر اپنے سامنے ایک نوجوان کو کھڑے دیکھ کر مزید حیران ہوگیا۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا مراد کی جانب بڑھا۔ اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے مراد کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرا تو کئی برسوں کی پیاس جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ مراد الحسن کے ہونٹ لرزنے لگے، آنکھیں برسنے لگیں اوپر سے صفدر حسین نے اسے نہ رونے کا اشارہ کیا تو وہ آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

فیض الحسن اس کے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ وہ کبھی الٹا کر کے اور کبھی سیدھا کر کے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''بابا!'' مراد الحسن اتنا کہہ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے آنسو فیض الحسن کے ہاتھوں پر گرے تو وہ تڑپ گیا۔

''مراد!'' اس نے گزشتہ بائیس برس کے دوران پہلی مرتبہ مراد الحسن کو پکارا تھا۔

''بابا!'' مراد الحسن اس کے ہاتھ چومنے لگا۔ ''بابا میں تمہارا مراد الحسن ہوں، مجھے پہچانو بابا، مجھے پہچانو، مجھے آواز دو بابا، مجھے میرے نام سے آواز دو۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو برسات بن کر جاری ہوگئے تھے۔ فیض الحسن نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''مراد الحسن! کیوں رو رہے ہو؟ مانو...... مانو کہاں ہے؟'' وہ مراد الحسن کو چھوڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے کہ مانو کو تلاش کر رہا ہو۔ ڈاکٹر احمد کا اشارہ پا کر مراد الحسن ایک طرف ہوگیا تو سکرین پر مانو کی سٹل بدستور قائم تھی۔ فیض الحسن کا یہ پیچھا ٹی وی کی طرف تھا۔ وہ مانو کو آوازیں دینے لگا۔ وہ اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ مانو، مانو پکارتا ہوا باہر نکلا تو اس کی نگاہ ٹی وی میں کرسی پر بیٹھی ہوئی مانو پر پڑ گئی۔ اس کے قدم رک گئے، وہ غور سے دیکھتا ہوا ٹی وی

کی طرف بڑھنے لگا، وہ پاس آکر بولا۔

''لو! ڈنگروں کی طرح خاموش بیٹھی ہے، مراد رو رہا ہے اور تم بولتی کیوں نہیں ہو مانو! ہم باپ بیٹے سے ناراض ہو؟ اچھا! چلو ہم صلح کر لیتے ہیں۔'' اس نے اپنا ہاتھ ٹی وی کی طرف بڑھایا۔ ڈاکٹر احمد ندیم نے ریموٹ سے سکرین آف کر دی تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔

''مانو! بولو...... بولو...... بولتی کیوں نہیں ہو......'' اس نے ٹی وی اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اب ان کا مقصد پورا ہونے والا تھا۔ اب صفدر حسین بھی اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح ٹی وی کو ٹھوکریں مار رہا تھا۔

''بولو...... بات کرو، مجھ سے بات کرو مانو...... مجھ سے بات کرو، ورنہ میں تم سے روٹھ جاؤں گا، روٹھ جاؤں گا۔''

''مانو...... کہاں ہو تم؟...... میرا مراد رو رہا ہے...... مت تڑپاؤ ہمیں......'' وہ یہ کہتا ہوا صفدر حسین کی طرف بڑھا...... غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دماغ کی گراریوں نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہچان کا نٹ بولٹ کس دیا گیا تھا۔ رشتوں سے محبتوں اور چاہتوں کے آئی سی نے کام کرنا شروع کر دیا تھا، وہ تڑپ کر بولا تھا۔

''اوئے ڈنگرا...... اوئے...... صفدر حسین...... میرے جگر...... میری مانو کو بلاؤ یار۔ میں پاگل ہو جاؤں گا......'' یہ کہہ کر وہ صفدر حسین کے گلے لگ گیا۔ صفدر حسین بھی اس کے گلے سے لگتا ہوا ''چاچا'' کہہ کر رونے لگا تھا۔

''چاچا! تُو بھی ڈنگر ہے، ہمیں رُلا رہا ہے۔'' صفدر حسین نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''صفدر حسین! میری مانو...... کیا وہ زندہ ہے؟'' وہ اب مراد کی طرف مڑا تو وہ آگے بڑھ کر باپ کے گلے لگ گیا۔

''بابا! بہت ترسایا ہے آپ نے ہمیں...... بہت ترسایا ہے۔ دیکھو تمہاری گود سے نکل کر آج تمہارا مراد تمہارے قد کے برابر کھڑا ہے۔ اتنا عرصہ کہاں رہے ہو بابا؟ وہ پیار، وہ محبت بھری لوریاں کس رشتے میں تلاش کروں بابا؟ میرا بچپن، لڑکپن...... تمہاری محبت کو ترس رہا ہے بابا۔'' مراد الحسن اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔ حمود علی اور ڈاکٹر احمد ندیم کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔

''مجھے میری مانو کے پاس لے چلو! اور یہ ہم کس کے گھر میں کھڑے ہیں۔ چلو چلو اپنے گھر چلتے ہیں۔'' وہ سب سے مخاطب تھا۔

"یہی اپنا گھر ہے بابا۔ یہ صفدر بھائی نے بنوایا ہے۔" مراد نے کہا تو وہ صفدر کی طرف دیکھنے لگا۔

"چاچا! وہ پرانا گھر بھی اپنے ہی پاس ہے۔ ذرا چند دن ٹھہر کر اس میں چلیں گے۔ اب تم آرام کرو۔ طبیعت مزید سنبھل جائے گی۔" صفدر حسین نے کہا تو وہ حمود علی کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ...... نوجوان کون ہے؟"

"یہ بھی تمہارا بیٹا ہے بابا!...... میرا یار اور بھائی ہے۔ ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔" مراد نے اس کا تعارف کروایا تو حمود علی آگے بڑھ آیا۔ بابا نے اپنے بازو کھول دیے۔

"اے میرے مالک! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم نے مجھے تین بیٹوں کی نعمتوں سے نوازا ہے۔"

ڈاکٹر احمد ندیم نے یقیناً بہت عظیم کارنامہ انجام دیا تھا مگر اصل بنیاد تو فلم تھی۔ جو بے خیالی میں اصلی ویڈیو گرافر تک پہنچ گئی تھی۔ قدرت جب کوئی کام کرنا چاہے ہے تو اس کے اسباب بھی خود ہی پیدا کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے تو فیض الحسن بول پڑا۔

"مراد الحسن!...... مانو نظر نہیں آ رہی؟" فیض الحسن کے سوال پر صفدر حسین بول پڑا۔

"تمہاری بیوی بہت خوش قسمت ہے...... حج کرنے گئی ہوئی ہے۔" اس کا جھوٹ سن کر باقی دونوں کو بھی سر ہلانا پڑا۔ فی الحال یہی بہتر تھا۔

"واہ میرے مولا! تیری باتیں تُو ہی جانتا ہے۔" فیض الحسن شعور کی دنیا میں واپس آ کر فلم والی بات بھول چکا تھا۔ "وہ کب تک آ جائے گی۔"

"ابھی پرسوں ہی تو گئی ہے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ تو لگ ہی جائے گا۔ میرا خیال ہے چاچا کہ مانو چاچی کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ تم اتنی مدت بعد مل گئے ہو۔" صفدر حسین نے جان بوجھ کر اس کی بیماری کا ذکر نہ کیا تھا۔

"تُو بھی...... ڈنگر ہی ہے......" فیض الحسن اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

حمود علی اور مراد الحسن ان کی دلچسپ گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

مانو نے کئی بار آنسو پونچھے تھے مگر حوریہ کی گالوں پر آنسو اپنا بسیرا بنا چکے تھے۔

خان پور سے واپسی پر جب وہ گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر گری تھی تو اس کی آنکھوں میں محفوظ رہ جانے والا یہ منظر وہی تھا کہ گاڑی گہری کھائی کی طرف چلی گئی ہے۔

پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

"بوا...... کیا آپ...... اب بھی اس کوارٹر میں جاتی ہیں؟" حوریہ اب سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

"ہاں! میں جب بھی فیض الحسن سے بات کرنا چاہتی ہوں...... اس کوارٹر میں زمین پر جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔"

"پھر......؟" وہ تجسس سے بولی۔

"پھر! میں اور فیض الحسن گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔" وہ خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی تھیں۔

"مگر آپ کی باتوں کا جواب کون دیتا ہے؟"

"میری تنہائی!"

"بابا نے آپ پر بہت ظلم کیے ہیں نا بوا......؟" وہ تاسف سے بولی۔

"وہ تمہارے والدین ہیں تم ان کے بارے میں ایسا مت سوچو...... میں ان کی بہن ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری بہتری کے لیے ہی مجھے روک رہے تھے۔"

"محبت کیسے ہو جاتی ہے بوا؟"

"یہ بہت ظالم چیز ہے حور۔ یہ نامعلوم مقام سے تمہارے دل میں اُتر کر اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ پھر دیمک کی طرح تمہیں اندر ہی اندر سے کھانے لگتی ہے۔ یہ دل اور جگر کھا جاتی ہے۔"

ماہ نور ایک بار پھر اشکباری کے الم سے گزرنے لگی تھیں۔

"بوا! فیض الحسن انکل کی کوئی تصویر نہیں ہے؟"

"تب وہ دور نہ تھا کہ موویز اور سٹل گرافی کی جاتی اور پھر جن حالات میں ہمارا نکاح ہوا تھا تب اتنا ہوش کہاں تھا کہ فوٹو گرافی کرتے پھرتے...... اچھا حور میں چلتی ہوں۔ تم بھی کافی تھک گئی ہو گی آرام کر لو!" مانو بوا کی آنکھیں جھلمل کر رہی تھیں۔ حوریہ سمجھ گئی کہ اب وہ اپنے کمرے میں جا کر آنسوؤں کے لیے اپنی خوبصورت آنکھوں کے بند دروازے کھول دیں گی۔

وہ افسوس کے ساتھ بوا کے بارے میں سوچنے لگی۔ کتنی بڑی آزمائش سے گزر کر انہوں نے اپنی محبت نبھائی تھی۔ اس نے ناولوں اور کہانیوں میں پڑھا تھا کہ محبت قربانی مانگتی ہے مگر آج اس نے عملی طور پر محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے والی بوا کو دیکھا تھا۔ جنہوں نے فیض الحسن انکل کے مرنے کے بعد بھی اپنی پاکیزہ محبت پر کسی بھی تہمت کا داغ نہیں لگنے دیا تھا۔ واقعی بوا گریٹ ہیں۔

اس کے موبائل پر رنگ ہونے لگی تو وہ حیرانگی سے نمبر دیکھنے لگی اور نمبر پڑھ کر چونک گئی۔ یہ نمبر تو شاعر کا تھا۔ مرادالحسن شاعر کا۔ اس نے یس کا بٹن پریس کیا اور لہجے کو باوقار بنا کر بولی۔

''السلام علیکم!''

''السلام علیکم! میڈم کیسی ہو؟'' دوسری طرف سے آواز مرادالحسن شاعر کی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں سر! آپ سنائیں کیسے ہیں؟''

''اپنا حال تو میں دیکھ کر ہی سنا سکتا ہوں، گا نہیں سکتا کیوں کہ سنگر نہیں ہوں۔'' اس کی آواز کی شوخی نے حوریہ کا موڈ بھی خوشگوار کر دیا تھا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا...... کل آپ پہنچے ہی نہیں؟'' حوریہ کے لبوں سے شکوہ بھی مٹھاس بھرے انداز میں ادا ہو رہا تھا۔

''آئی ایم سوری! میں پہنچا تھا مگر میں آپ کی پہچان سے انجان تھا۔ بس بیٹھ کر آ گیا۔''

''سیم پرابلم! او کے پھر ایسا کرتے ہیں...... آپ اب بتائیں کہاں ملاقات ہو گی؟'' حوریہ ایک بار اس سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔

''میں جہاں کہوں گا...... آپ آ جائیں گی؟''

''آپ سے ملاقات کے لیے میں کہیں بھی آ سکتی ہوں۔'' اس کی آواز میں جوش تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ شدت سے ملاقات کی متمنی ہے۔

''تو پھر ٹھیک ہے، ایک ایڈریس نوٹ کریں......'' دوسری طرف سے آواز سن کر وہ جلدی سے اپنی ڈائری ڈھونڈنے لگی۔

''جی سر لکھوائیے......'' دوسری طرف سے جو ایڈریس لکھوایا گیا، وہ پہلے سے مختلف تھا۔

''آپ ایسا کریں کہ کل...... کالج کے بعد آ جائیے گا! میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' رابطہ منقطع ہونے پر وہ ''یس'' کا نعرہ لگا کر خوش ہو گئی۔

اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی وہ دیوانی ہو رہی تھی۔ مرادالحسن شاعر نے خود فون کیا تھا اور خود ہی اپنا ایڈریس بتایا تھا۔ اب پتا نہیں رات کیسے گزرے گی؟

☆=====☆=====☆

فیض الحسن کی آنکھ بائیس برس بعد اذانِ فجر کی محبت بھری آواز سے کھل گئی تھی۔ وہ کچھ دیر بستر پر لیٹا اردگرد کا جائزہ لیتا رہا اور پھر شعور بیدار ہوا تو تڑپ کر بستر سے اٹھا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات نے اپنے بندے کو طویل اور کڑی آزمائش کے بعد ایک بار پھر اپنے

حضور سجدہ ریز ہونے کی توفیق بخشی تھی۔ فیض الحسن کے آنسوؤں نے فواروں کی طرح سجدے میں بہنا شروع کر دیا۔ اس نے سجدوں کو طوالت دے کر رب تعالیٰ کی ثنا بیان کی۔ آنکھوں اور دل و دماغ کا ایک بار پھر رشتہ ماتھے سے جڑ گیا تھا۔ اوپر بیٹھا ہوا رب اس کے سجدوں سے واقف تھا...... نماز سے فراغت کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو الفاظ ہونٹوں پر آ کر لڑکھڑانے لگے۔ آرزوئیں اور خواہشیں اس عظیم و بابرکت رب کی رحمتوں والی چوکھٹ پر قربان ہونے لگیں۔ ''میرے پاک پروردگار! میں تیری رحمتوں اور فضل و کرم کی انتہا کا شکر ادا کرنے کا اہل نہیں ہوں۔'' میں کمزور اور ناتواں ہوں، تُو بڑا غفور و رحیم ہے۔ میرے مولا! میرے گناہوں کی سزا میں کمی فرما کر مجھے معاف کر دے۔ میں نے جانے انجانے میں جو بھی غلطیاں کی ہیں۔ میرے مالک ان کی پردہ پوشی فرما کر مجھے مزید کسی بھی آزمائش میں مت ڈال۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ...... کسی بھی امتحان میں پورا اتر سکوں۔ میں اس درسگاہ میں نکما اور نااہل شاگرد ہوں۔ میرے مالک مجھ پر اپنی خاص رحمت فرما......!

''میرے معبود! اپنے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ اور وسیلہ سے میرے خاندان کو اپنی رحمتوں کے سائے تلے...... ہر قسم کے غموں اور دُکھوں کی دُھوپ سے محفوظ فرما! میرے مالک! میری مانو اور میرے بچوں پر اپنا فضل و کرم فرما!''

''سوہنے اللہ! اپنے گھر میں میری مانو کی حاضری قبول فرما اور مجھے بھی اپنے مقدس گھر اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معطر و مطہر در کی حاضری نصیب فرما! میرے بچوں پر بھی اپنی رحمتوں اور فضل و کرم کی بارش برسا!'' فیض الحسن کی آواز میں تڑپ اور غم نمایاں تھا۔ مرادالحسن، حمود اور صفدر حسین بھی جاگ گئے تھے۔ اس کی گریہ زاری سے ان کے دل دہل رہے تھے۔ انہوں نے بھی وضو کر کے اپنے سر شکرانے کے طور پر رب تعالیٰ کی عظیم بارگاہ میں جھکا دیے۔

فیض الحسن نے قرآنِ کریم کو لرزتے ہاتھوں سے پکڑا تو اسے برسوں پرانا محبتوں کا سفر یاد آ گیا۔ جب وہ تلاوت کیا کرتا تھا تو ہوائیں باادب ہو کر خاموشی سے گزرا کرتی تھیں۔ پرندے چہچہانا بھول کر خاموشی اور احترام سے اس کی زبان سے محبت بھرے انداز میں حق و معرفت کا کلام سننے لگتے۔ آج پھر مدتوں بعد اس نے قرآن کریم کو محبت اور چاہت سے چوم کر آنکھوں اور سینے سے لگایا تو دل کی دنیا روشن ہو گئی۔ اس کے غیر حاضر دماغ اور اندھے دل کو صحیح دوائی کی خوراک اب ملی تھی۔ اسے گزرے زمانے کی زیر و زبر یاد آ گئی تھی۔ آنکھیں اور دل و دماغ روشن ہو گئے تھے۔ اس نے آنسوؤں کے نذرانے اللہ کے حضور پیش کرتے ہوئے

قرآنِ حکیم کو کھولا اور تلاوت کا آغاز کر دیا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔ ''پناہ مانگتا ہوں میں اللہ کی شیطان مردود سے۔''

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم۔ ''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

اس کی آواز لڑکھڑائی نہ تھی بلکہ آج بھی رب تعالیٰ نے اسے وہی سوز بخشا تھا، وہی درد اور وہی محبت اس کی آواز میں شامل تھی جو مدتوں پہلے جوانی میں تھی۔ آج بھی آغاز تلاوتِ قرآن کریم پر پرندوں نے خاموشی اختیار کر لی، ہوائیں سنجیدہ ہو کر گزرنے لگیں، کائنات کے ذرے ذرے سے رب کریم کی محبت کی پُرنور کرنیں شعاعوں کی صورت میں بکھرنے لگیں۔

اس نے سورۃ ''الزمر'' کی آیات تلاوت کرنے کے بعد ترجمہ پڑھنا شروع کیا تو ان سبھی کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

''اپنے رب کی طرف لوٹ آؤ اور اس کی اطاعت اختیار کر لو! قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے اور اطاعت کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب (قرآنِ مجید) کی اس کے بہترین پہلو کی قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تمہیں خبر تک نہ ہو!''

قرآنِ کریم کے اس ترجمے نے صفدر حسین کو روح کی گہرائی تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بڑے گناہ اور جرم کیے تھے، وہ سرتاپا لرز گیا تھا۔ حمود علی اور مرادالحسن بھی خوفِ خدا سے رو رہے تھے۔ سورج نے اپنی کرنیں بکھیر کر صبح کی نوید دی تو ان کے گھر میں یہ پہلی صبح تھی۔ جس میں تمام خاندان تو اکٹھا نہ تھا مگر سربراہ اپنے شعور اور مکمل رعب و دبدبے سے بیٹھا ہوا تھا۔

فیض الحسن کے بالوں کی کٹنگ اور پھر بالوں میں خضاب نے اسے ایک بار پھر جوان بنا دیا تھا۔ وہ ان تینوں کے بیچ بیٹھا ہوا ان کا بھائی لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی خشخشی داڑھی نے اس کی شخصیت کو مزید بارعب اور پُروقار بنا دیا تھا۔

انہوں نے مل کر ناشتہ کیا اور پھر حمود علی اور صفدر حسین نے گھر کی صفائی شروع کر دی۔

آج اس گھر میں فیض الحسن کی ہونے والی بہو آنے والی تھی۔ فیض الحسن نے قصرِ ماہ نور جانے کا تذکرہ کیا تو صفدر حسین نے اسے سمجھا دیا کہ ''چاچی مانو نے سختی سے منع کیا ہے، وہ اس کے بغیر اس محل میں جانا تو دور...... اس سڑک پر بھی پاؤں نہیں رکھے گا۔'' بس مانو کی ہر بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی، وہ خاموش ہو گیا۔

''مانو کتنی خوش ہو گی۔ مجھے کل صحیح سلامت اور نارمل حالت میں دیکھ کر؟'' وہ خود ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے پلان بنایا تھا کہ وہ مانو کو ابنارمل حالت میں تنگ کرے گا مگر اس پلان سے اس نے بچوں کو باخبر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔

''چاچا! آج ایک لڑکی مرادالحسن سے ملنے آ رہی ہے۔'' صفدر حسین نے کہا تو وہ حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

''مگر کیوں؟'' اس کے لہجے میں معصومیت اور حیرت تھی۔

''تمہارا منڈا شاعری بھی کرتا ہے اور آنے والی لڑکی کو پسند بھی کرتا ہے۔''

''اور لڑکی......؟'' فیض الحسن کے سوال پر وہ سٹپٹا گئے۔ وہ واقعی عشق و محبت کا فلاسفر لگ رہا تھا۔ وہ دور کی کوڑی لایا تھا۔

''اس کا اندازہ آج ہو جائے گا...... ابو۔'' حمود علی نے پہلی بار اسے ابو کہہ کر پکارا تھا۔ دونوں کو ہی عجیب لگا تھا مگر وہ بے نیازی سے کام میں مصروف تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، میں اس کا انٹرویو پہلے لوں گا۔''

''اسے بھگانا نہیں ہے۔'' صفدر حسین نے کہا تو وہ اس کی طرف مصنوعی غصے سے دیکھتے ہوئے ہنسنے لگا۔ صفدر حسین اور مرادالحسن اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے لگے، وہ سر ہلا کر سنتا رہا۔

مرادالحسن نے تنقیدی نظروں سے باپ کا جائزہ لیا۔ حور یہ اب بابا کو کبھی نہ پہچان سکتی تھی۔

''چاچا! تم نے اسے پاس کرنا ہے۔'' صفدر حسین پاس آ کر بولا۔

''اوئے ڈنگر! اگر وہ بھینگی، لولی لنگڑی ہوئی تو پھر کیسے پاس کروں گا؟'' اب وہ کئی برس پہلے والا فیض الحسن لگ رہا تھا۔

''بس! وہ کیسی بھی ہو؟ سمجھ لے کہ تمہارے مرادالحسن کی پسند ہے۔''

''ٹھیک ہے مرادے کی پسند ہے تو پھر مجھے بھی پسند ہے۔'' وہ خوشی سے بولا تو صفدر حسین گھور کر بولا۔

''بہو کے طور پر۔'' صفدر حسین نے گرہ لگائی تو پھر گھر میں دھما چوکڑی مچنا لازمی امر تھا۔

☆=====☆=====☆

ڈور بیل بجنے پر فیض الحسن نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اس کی شکل میں کھو گیا۔ کہیں نہ کہیں سے اس کی شکل مانو سے ضرور ملتی تھی۔

''السلام علیکم سر!'' آنے والی حوریہ نے فیض الحسن کو ہی مراد الحسن سمجھا تھا مگر فیض الحسن ایک طرف ہٹ گیا۔ لڑکی جو کہ حوریہ تھی اندر چلی آئی۔ وہ فیض الحسن کی پرسنالٹی سے خاصی متاثر نظر آ رہی تھی۔

''جی فرمایئے!'' صحن میں آ کر فیض الحسن نے اس سے آنے کا مدعا پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے اور کیا کہے مگر پھر ہمت کر کے بول پڑی۔

''در اصل مجھے مراد الحسن صاحب سے ملنا ہے۔''

''کون ہے؟'' حوریہ اس پُر وقار مرد کے منہ کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے فوراً ہی ہینڈ بیگ سے پرچی نکالی جس پر اس نے اس گھر کا ایڈریس نوٹ کیا تھا۔ وہ پرچی اس نے فیض الحسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ایڈریس اسی گھر کا ہے؟'' وہ ساتھ ساتھ گھر کو بھی دیکھ رہی تھی۔ فیض الحسن کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اس گھر کا ایڈریس کیا ہے مگر وہ فوراً ہی بول پڑا۔

''ہاں! پتا تو یہی ہے مگر مراد الحسن میں سمجھا نہیں کون ہے؟ آپ کس کا پوچھ رہی ہیں؟''

''وہ جی! شاعر ہیں، ان کی کتاب میں نے پڑھی تھی۔ مجھے اچھی لگی اور میں نے ان سے ملنے کے لیے فون کیا تو انہوں نے ایڈریس مجھے لکھوا دیا۔'' حوریہ پہلے تو خاصی نروس ہوئی تھی مگر اب اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس شخص کی باتوں کا فر فر جواب دینا ہوگا۔

''اوہ!...... معذرت چاہتا ہوں، بیٹھیے نا......'' فیض الحسن کمال کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس نے صحن میں رکھی ہوئی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو حوریہ پریشانی کی حالت میں بیٹھ گئی۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ اگر اس آدمی نے اس کے ساتھ کوئی حرکت کی تو وہ اس کے دانت توڑ دے گی مگر ایسا لگتا نہیں تھا۔

''آپ! مرادے کی بات کر رہی ہیں؟'' حوریہ یہ نیا نام سن کر حیران رہ گئی۔ اس نے جان چھڑانے کے عالم میں تائیدی انداز میں سر ہلا دیا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''لو کر لو بات! وہ تو ہے ہی نکما...... وہ شاعر کہاں سے ہو گیا۔ چار جماعتیں تو اس نے پاس نہیں کیں......'' حوریہ اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ''خیر میں بلاتا ہوں مرادے کو، آپ تب تک کولڈ ڈرنکس لیجیے۔'' حالانکہ نہ ٹیبل تھا اور نہ ہی کوئی کولڈ ڈرنک۔ وہ آدمی یہ کہتا ہوا اندر کی جانب گیا تو حوریہ کو وہ کھسکا ہوا لگ رہا تھا۔ ''اور یہ مرادا کون تھا؟'' وہ سوچ کر ہی رہ گئی مگر جب اندر سے ایک پُر وقار مرد باہر آیا تو وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اس کی پرسنالٹی اس شخص

سے بھی زیادہ تھی جو کہ حوریہ کی نظر میں خبطی تھا۔

''آپ؟'' آنے والے کا پوچھنا ایسا ہی تھا کہ وہ کنفرم کرنا چاہتا ہو کہ اسی نے فون سنا تھا۔

''جی سر! میں حوریہ عبدالرحمٰن...... میں مراد الحسن صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔'' حوریہ نے اپنا نام اور آنے کا مقصد فوراً بیان کر دیا کہ کوئی اور ہی مصیبت نہ گلے پڑ جائے۔

''اچھا تو آپ ہیں...... جو میری شاعری کی فین ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' آنے والے سمارٹ اور ہینڈسم شخص نے کہا تو حوریہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ اس وقت اپنے پسندیدہ شاعر کے سامنے اس کے گھر میں کھڑی ہے۔ اس کی حیرت کم نہ ہوئی تھی کہ آنے والا جو کہ صفدر حسین تھا پھر بول پڑا۔

''آپ تشریف رکھیے...... میں ہی مراد الحسن ہوں۔'' وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ آیا اور کرسی حوریہ کی طرف بڑھا دی! وہ خاصی نروس ہو گئی تھی۔

''آپ کو میری شاعری میں کون سی خاص بات پسند آئی کہ آپ نے مجھ سے ملنے کے لیے زحمت کی؟''

صفدر حسین اداکار تھا، وہ اپنا رول نبھانے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔ یہ اُن کے پروگرام کا حصہ تھا۔ حوریہ کی ملاقات اس کے بعد مراد الحسن سے کرائی جانی تھی۔

''یس سر! میں آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ آپ نے بہت حساس اور نازک جذبوں کا اظہار اپنے شعروں میں بیان کیا ہے۔ مجھے آپ کی شاعری واقعی اچھی لگی ہے۔'' وہ بہت زیادہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اندر سے ایک ملازم کولڈ ڈرنک لے کر آیا۔ اس کی بڑی بڑی سی مونچھیں دیکھ کر حوریہ کو ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ اس نے فوراً ہی نگاہ نیچی کر لی۔ جب کہ ملازم (حمود) واپس چلا گیا تو صفدر حسین نے ایک گلاس حوریہ کی طرف بڑھا دیا۔

''وہ جو پہلے صاحب تھے، وہ کون ہیں؟'' وہ رہ نہ سکی۔

''ہمارے والد صاحب ہیں۔ آرمی میں تھے، دو تین دن پہلے ہی ریٹائر ہوئے ہیں۔'' صفدر حسین نے جواب دیا تو حوریہ شکر کرنے لگی کہ اس کو کچھ کہہ نہیں دیا۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جانے والی مثال سچ ثابت ہو جاتی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا سر! کہ میں آپ کا اس طرح حقیقی زندگی میں دیکھ رہی ہوں۔'' وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں انہیں آشکار کیے جا رہی تھی۔

''ایسا ہوتا ہے...... مس حوریہ۔ میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے میرے حقیر سے

الفاظ کو پسندیدگی کی سند عطا کی!''

''سر! آپ کیسے لکھ لیتے ہیں؟''

کاغذ اور قلم سے۔'' پھر دونوں کا ہی قہقہہ بلند ہو گیا۔ ''دراصل الفاظ دل سے نکلتے ہیں۔ یہ اللہ کی عطا ہوتے ہیں۔ علم کاغذی ڈگریوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ کی طرف سے تحفہ میں ملتا ہے۔''

''اب آپ کی اگلی کتاب کب آرہی ہے؟'' اس کا انداز انتہائی دل کش تھا۔

یہ مرادالحسن بھی خاصا ''گھنا'' نکلا ہے۔ اچھی ہے، بلکہ سو فی صد پرفیکٹ ہے۔'' صفدر حسین نے سوچا مگر اس کی بات کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔

''دیکھیں...... مس حوریہ!'' صفدر حسین نے اس کی کرسی کے پیچھے اس کے سر کے پیچھے انگلی سے اشارہ کیا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی مگر نگاہ پلٹ کر واپس نہ آسکی۔

حوریہ کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔!

وہ اپنے سامنے جاذب کو بھرپور مردانہ وجاہت کے ساتھ کھڑا دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا بہت پیار اور محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نظریں نظروں کے وار سے گھائل ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ حوریہ کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے لرزنے لگے، وہ گلاب کوئی بھی پتی نہ بکھیر سکے۔

دل دل کی صدا سننے لگے تھے۔ آنکھیں محبتوں کے پیغام کو محبتوں سے ہی پڑھنے لگی تھیں۔

''حوریہ!'' مرادالحسن نے پیار سے اسے پکارا تو وہ واپس آگئی۔ اس نے چونک کر اپنے پیچھے دیکھا تو صفدر حسین کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... یہ میرے بڑے بھائی صفدر حسین ہیں۔''

حوریہ کی حیرت مرادالحسن کی آواز سن کر ختم نہ ہوئی تھی کہ صفدر حسین نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تو مزید حیرانگی نے اسے گنگ کر دیا۔

''یہ بڑے بھائی کا پیار ہے، سدا خوش رہو!'' صفدر حسین حیران و پریشان حوریہ کو چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اندر سے ان کا والد باہر نکلا اور مرادالحسن کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا، دونوں باپ بیٹے گریس فل شخصیت کے مالک تھے۔

''حوریہ! یہ میرے بابا ہیں فیض الحسن!'' جاذب مراد نے ان کا تعارف کروایا تو وہ چونک کر رہ گئی۔ اس نام کی کہانی اس نے بوا سے سنی تھی مگر وہ فیض الحسن تو فوت ہو چکے ہیں۔ اس کے

ذہن میں عجیب سی الجھنیں جنم لینے لگی تھیں! جاذب کی آواز نے پھر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''اور میں ہوں مرادالحسن! تمہارا شاعر، جاذب مرادالحسن!'' اس کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ حوریہ کو گھائل کر رہی تھی۔ اندر سے ایک اور مخلوق نمودار ہوئی۔

''یہ ہیں حمود علی!'' اپنے تعارف پر حمود علی نے حوریہ کو کورنش بجا کر سلام کیا تو وہ مسکرانے لگی۔ اب سبھی افراد کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔

وہ کبھی بھی سوچ نہ سکی کہ جاذب ہی مرادالحسن ہے۔ جاذب کو تو وہ دل ہی دل میں پہلے دن سے ہی پوجنے لگی تھی، اب تو اس کی پسندیدگی کی سند بھی مل گئی تھی۔ مرادالحسن اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔ دل نے اس کی پسندیدگی کی گواہی دے دی تھی اور وہ دل کی آواز پر چھوئی موئی سی ہو کر رہ گئی۔

''حوریہ! تم نے بابا کو پہچانا؟'' مرادالحسن نے بے تکلفی کا پہلا پتا پھینکا۔ تو وہ غور سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایکسی لینٹ...... ونڈرفل، جاذب میں بالکل بھی نہیں پہچان سکی۔'' اس کے الفاظ اور چہرے کے تاثرات میں حیرانی نمایاں تھی۔

''مجھے کتابیں چھیننے والا واقعہ یاد آ رہا ہے...... اوہ مائی گاڈ! یہ تو بالکل ہی ینگ ہیں۔''

''ہاں! بس بیماری نے انہیں خود سے بیس سال بڑا کر دیا تھا۔ اب یہ ماشاءاللہ بالکل ٹھیک ہیں اور تمہارے سامنے بھی ہیں۔'' جاذب نے کہا تو وہ اٹھ کر بابا کی طرف بڑھی۔ اس نے آگے جا کر بابا کو سلام کیا تو فیض الحسن نے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ہمیشہ اسی طرح ہنستی مسکراتی رہو! بس یہی زندگی ہے۔'' ان کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

''اگر آج مرادالحسن کی والدہ بھی یہاں ہوتیں تو بہت خوش ہوتیں۔'' فیض الحسن نے مراد کی والدہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ شکر تھا کہ اس نے مانو نہیں کہہ دیا! کیوں کہ ابھی یہ راز افشا کرنے کا وقت نہیں تھا۔ انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔ صفدر اور حمود علی اندر چلے گئے تو بابا نے بھی ان دونوں کو باتیں کرنے کا موقع دینے کے لیے اٹھنا ہی بہتر سمجھا۔

''کیسا تجربہ رہا اپنے پسندیدہ شاعر سے ملنے کا!'' مراد نے ہنستے ہوئے کہا تو حوریہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی۔

''میں صفدر بھائی کو ہی شاعر سمجھ رہی تھی۔''

''کتاب میں ایسا کیا تھا کہ آپ نے مجھ سے ملنے کا فیصلہ کیا؟'' مرادالحسن اس کا انٹرویو کرنے لگا تھا۔

مفلسی نے پہنا دیا مجھے اس کی خفگی کا پیرہن
کبھی آسودگی میں جس کی رداء رہا ہوں میں!

حوریہ نے یہ شعر پڑھا تو مراد مسکراتا ہوا بولا۔

''بس! پوری کتاب میں ایک ہی شعر تھا جس کی بنا پر آپ ملنے چلی آئیں؟''

''نہیں مرادالحسن صاحب!......''

''صاحب نہیں! صرف...... جاذب!'' مراد نے اسے ٹوکا۔

''ہاں! جاذب...... آپ کی کتاب میں درج ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ اس کی داد دینی پڑے۔''

''الفاظ جو ہوتے ہیں، انسان کے اندر موسموں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ آپ کی اندرونی دنیا میں جو بھی ہلچل ہوتی ہے۔ وہ آپ کے قلم سے الفاظ کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگتی ہے۔ بس الفاظ کو جوڑنا اور مصرعوں کی لڑیوں میں پرونا ہی شاعری ہے۔''

''مجھے پتا چل گیا ہے کہ جسے میں پسند کرتی ہوں وہ میرے پاس ہے۔'' وہ کہتی ہوئی اٹھنے لگی تو حمود اور صفدر کھانا اٹھائے ہوئے اندر سے وارد ہو گئے۔ حوریہ حیرانگی سے ان کی طرف دیکھنے لگی جبکہ مراد اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

''تم ایسے ہی نہیں جا سکتی بیٹی! کھانا کھا کر جاؤ۔'' فیض الحسن کی آواز میں محبت تھی، وہ بیٹھ گئی۔

''یہ وہی کھانا ہے، جو آپ نے مجھے ''پیزا ہٹ'' میں کھلانا تھا۔'' حوریہ مسکرانے لگی۔

''آپ بڑے شرارتی ہیں...... مگر میں حیران ہوں کہ اتنی نوعمری میں ہی شاعری، آپ کو کیا روگ ہے؟''

''اگر شاعری کے لیے کسی روگ کا ہونا ضروری ہے تو پھر محبت کر لیتے ہیں۔'' مراد کی بات بہت گہری تھی، حوریہ سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ ''کتاب تو میں نے روگ لگنے سے پہلے ہی لکھ دی ہے اب روگ بعد میں پال لیں گے۔''

''ایسا کبھی نہیں ہو گا......'' وہ آہستگی سے بولی اور نظریں بھی نیچی کر لیں۔

سبھی نے پُرسکون ماحول میں اچھا کھانا کھایا۔ حوریہ نے اپنے موبائل پر ٹائم دیکھا تو چونک پڑی۔

اس نے اجازت طلب نظروں سے مراد کی طرف دیکھا۔ تو اس نے خفیف سے اشارے سے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جانے لگی تو پروگرام اور پلاننگ کے تحت فیض الحسن اس کو چھوڑنے کے لیے گیٹ تک گیا۔

''اچھا انکل! خدا حافظ۔'' مگر فیض الحسن نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اسے روک لیا...... ''ٹھہرو!''

''جی انکل!'' وہ واپس پلٹی تو فیض الحسن نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا...... مرادالحسن تمہیں پسند ہے؟'' یہ سوال سن کر اس کی نظریں فوراً صحن میں بیٹھے ہوئے مرادالحسن کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا، نظروں سے نظریں ملیں تو دل زور سے دھڑکتے ہوئے...... ''ہاں ہاں'' بولنے لگا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر فیض الحسن کی طرف دیکھا اور شرارت سے مسکراتی ہوئی بولی۔

''اگر میں کہوں کہ...... نہیں...... تو......؟''

''تو پھر...... میں سمجھوں گا کہ تم اس سفید بالوں والے بوڑھے کو دھوکا دے رہی ہو اور سفید جھوٹ بول رہی ہو۔''

''ہاں انکل! آئی ایم لائیک مرادالحسن!'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی مگر فیض الحسن کی سمجھ میں انگریزی نہ آئی۔

''چاچا! کیا کہا اس نے؟'' صفدر حسین بے صبرا ہو رہا تھا۔

''پتا نہیں کیا بول گئی ہے۔ آئی لائیک مرادالحسن کہہ گئی ہے۔'' فیض الحسن کی زبان سے نکلا تو گھر میں شور مچ گیا تھا۔

''مرادالحسن! اس کے گھر کا کوئی اتا پتا ہے یا بس راہ چلتی بے تکلفی ہو گئی ہے؟'' فیض الحسن نے کہا تو سنجیدگی چھا گئی۔

''اس کا گھر بہت بڑا ہے بابا! اور یہ بہت امیر باپ کی بیٹی ہے۔'' مرادالحسن نے سنجیدگی سے کہا تو فیض الحسن خلاؤں میں گھورنے لگا۔

''امیر باپ کی بیٹی ہے؟'' اس کی آواز میں دُکھ تھا۔ مایوسی اور یاسیت تھی۔ اسے اپنے

بچے کا مستقبل بھی اپنی طرح لگنے لگا تھا۔

''چاچا! تُو فکر نہ کر۔ اگر بہو کو نوٹوں اور سونے چاندی میں تول کر لانا پڑا تو لے کر آؤں گا۔ مرادالحسن کی خوشیاں اس گھر کی خوشیاں ہیں اور اب کوئی بھی اس گھر کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا یہ میرا وعدہ ہے۔'' صفدر حسین آگے بڑھ کر فیض الحسن کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

''صفدر حسین! اللہ نے تمہیں بہت اجر دینا ہے۔ تم نے میری اور میرے بچے کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی ہے۔ اب بھی اگر حوریہ اور مرادالحسن کی شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہوئی تو تم ہی تمام معاملات کو دیکھو گے۔'' فیض الحسن رنجیدہ ہو گیا تھا۔

''بابا! آپ فکر نہ کریں۔ جیت ہمیشہ محبت کی ہوتی ہے۔'' مرادالحسن نے کہا تو وہ اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ہاں! محبت کی ہی جیت ہوتی ہے۔ جس طرح میری مانو نے اپنی محبت کی جنگ جیتی ہے۔ بالکل اسی طرح تم بھی کامیاب ہو گے۔'' وہ اندر کی طرف چل پڑا۔

صفدر حسین اور مرادالحسن اگلی پلاننگ کرنے لگے۔ اب بابا اور مراد کے قاتلوں کو ڈھونڈنا تھا مگر یہ بڑا کٹھن کام تھا۔ وہ دونوں ہی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ صفدر حسین چہک کر اٹھا۔ ''آئیڈیا'' پھر وہ مرادالحسن کو اپنا پروگرام بتانے لگا۔

☆=====☆=====☆

وہ بہت خوش تھی کیوں نہ ہوتی، اسے مراد مل گیا تھا۔ اس نے مراد کو پہلی ہی نظر میں اپنے من میں بسا لیا تھا۔ اس کی دل کش اور جاذبِ نظر شخصیت اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ بک سپاٹ پر ملنا اور اس کے گھر میں ماہم کی شادی پر وہ مراد کو دیکھ کر اپنے سپنوں میں بسا کر جیون ساتھی مان چکی تھی مگر اس سے پوچھنا باقی تھا، آج وہ بھی مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

''وہ سبھی بہت اچھے لوگ ہیں بوا۔'' وہ بوا کو بتا رہی تھی مگر سوگواری کی تصویر میں ذرا بھی ہلچل نہ ہو سکی۔ ''وہ محبت کرنے والے اور محبت کی قدر کرنے والے لوگ ہیں۔''

''ان کے لیے کوئی بھی جذبہ دل میں پالنے سے پہلے، حیثیت کا تعین کر لینا بیٹا!'' بوا کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ تڑپ گئی۔

''حیثیت......؟ تو کیا محبت حیثیت اور سٹیٹس کی محتاج ہوتی ہے؟'' اس کی آواز میں حیرانگی تھی۔

''اس بات کی جیتی جاگتی مثال تمہارے سامنے ہے، اپنی بوا کی زندہ لاش کو دیکھ لو۔''

''مگر بوا وہ تو روڈ ایکسیڈنٹ تھا اور پھر گھر والوں نے آپ کی شادی کو تسلیم بھی تو کر لیا تھا۔'' وہ دُکھ سے بولی۔

''مجھے آج نہیں...... بلکہ گزشتہ بائیس سالوں سے ہی لگ رہا ہے کہ مجھ سے میرا شوہر اور بیٹا جدا کیے گئے ہیں۔ نام نہاد خاندانی وقار کی بھینٹ چڑھائے گئے ہیں مگر میں خاموش ہوں تو اس لیے...... کہ کس سے اپنا دُکھ کہوں؟ کس کے ہاتھوں پر ان کا لہو تلاش کروں؟...... میں اکیلی ہوں حور...... اور میری طرح تم بھی اکیلی ہو، بالکل اکیلی......''

''آپ ہیں نا میرے ساتھ!'' وہ لجاجت سے بولی تو ماہ نور تڑپ گئی۔

''حوریہ!...... میں نے عشق و محبت کی راہوں پر چل کر فیض الحسن اور اپنا مرادالحسن کھویا ہے۔ میں اب کسی اور کو ماہ نور بننے میں مدد نہیں دے سکتی۔''

''بوا۔ وہ میری زندگی بن چکا ہے اگر مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی۔''

''یہی بات اپنے بابا کے سامنے کہہ سکتی ہو؟'' حوریہ نے بوا کو عجیب نظروں سے دیکھا۔

''نہیں!'' حوریہ جھجک گئی۔

''ڈرتی ہو تو پیار کیوں کیا تھا؟''

''ڈرتی نہیں! بابا کی دل و جان سے عزت کرتی ہوں، ان کا بہت احترام ہے میرے دل میں!''

''وہ اگر تمہاری محبت کا احترام نہ کریں تو...... کیا کرو گی؟''

''ان سے گلہ کیے بغیر ہی مر جاؤں گی۔'' وہ مصمم ارادے سے بولی۔

''میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا مگر دیکھو...... اس زخم کے گھاؤ...... آج تک نہیں بھرے۔''

''میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ جاذب میری زندگی ہے۔'' وہ اٹل ارادے سے بولی۔

''کون جاذب؟...... وہی ویڈیوگرافر......؟''

''ہاں بوا وہی ویڈیوگرافر اور شاعر مرادالحسن بھی!''

''ایک نظر میں عشق کے تیر کا نشانہ بن گئی ہو؟''

''دل کو گھائل کرنے کے لیے ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے بوا۔ آپ تو بخوبی جانتی ہیں۔''

''میں اپنی بات نہیں کر رہی، تم اپنی بات کرو حوریہ!''

''مگر میں آپ کی مثال بننا چاہتی ہوں۔''

''میری داستان کوئی عجیب وغریب یا دنیا سے علیحدہ نہیں ہے کہ تم اس کی مثال بنو۔''

''مگر آپ میری نظروں کے سامنے محبت کا وہ تاج محل ہیں جو زندہ تو ہے اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ اس روئے زمین پر اپنے رعب اور وقار کے ساتھ پورے قد کے ساتھ کھڑا ہے۔''

''مگر تم نہیں جانتی کہ اس تاج محل کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئی ہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔ ''میں اپنی ادھوری محبت کی قبروں پر آج بھی ماتم کناں ہوں مگر میں اسے تقدیر کا فیصلہ ہرگز نہیں مانتی۔ میرے ساتھ دھوکا اور فراڈ کیا گیا ہے کیوں کہ اگر تقدیر نے مجھ سے میرا فیض الحسن چھین ہی لینا تھا تو پھر دیا ہی کیوں تھا؟''

''آپ کو ہر لمحہ ایسا کیوں لگتا ہے کہ کسی نے ان کو مروایا ہے، وہ کون ہوسکتا ہے؟''

''تقدیر نے مجھے میری محبت کا انعام دیا تھا مگر اس دنیا نے چھین لیا ہے۔ تم میرا ساتھ دو گی.....تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا بوا۔ میں آپ کی خاطر کچھ بھی کرسکتی ہوں۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولی تو بوا ماہ نور اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ مسکان سجا کر بولیں۔

''میرے لیے نہیں! اپنے جاذب کو پانے کے لیے کچھ بھی کرو گی؟'' یہ ماہ نور کا نیا اور انوکھا روپ تھا۔

''ہاں بوا میں جاذب کو پانے کے لیے کچھ بھی کروں گی۔'' وہ پختہ یقین سے بولی تھی۔

''تو پھر کرو شروع اپنے باپ ملک عبدالرحمٰن سے۔'' بوا کے منہ سے سن کر وہ ہکی بکی رہ گئی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے، وہ سرتاپا لرز کر رہ گئی تھی۔

''کیوں؟ آ گیا نا پسینہ حوریہ عبدالرحمٰن۔ ان راہوں پر چلنے کے لیے لوہے کے پاؤں اور فولادی دل چاہیے..... ابھی تم بہت چھوٹی ہو، واپس لوٹ جاؤ اپنی مستی بھری دنیا میں اور مجھے بھی اس حسرت وافسردگی کے کفن میں قید رہنے دو۔'' ماہ نور بوا کی آواز نے اس کی رہی سہی طاقت بھی چھین لی تھی۔

وہ حیرت واستعجاب سے بوا کی طرف دیکھتی ہوئی اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

''بوا؟'' اس نے بوا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ تھپکتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''میں آپ کا ساتھ دوں گی مگر آپ کو بھی میری محبت کی منزل تک میری رہنمائی کر کے

کانٹوں بھرے اس پاؤں چھلنی کر دینے والے رستے پر میرا ساتھ دینا ہوگا..... میں بابا سے ہی آغاز کروں گی اور آج ہی یہ کام ہوگا۔'' ماہ نور نے اس کے ہاتھ کو تھپکی دی۔ وہ اس کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسے ہر طرف سے سوچوں نے گھیرا ڈال لیا تھا۔ وہ کچھ سوچتی تو ڈور کا دوسرا سرا اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ اس نے گیٹ پر جیپ کا ہارن سنا تو کھڑکی کھول کر دیکھا تو زمان بھائی تھے، وہ پیچھے ہٹنے لگی تو ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

''کیوں نا زمان بھائی کی مدد لی جائے؟'' اس نے ایسا ہی کرنے کی ٹھان لی تھی۔

وہ زمان بھائی کے کمرے میں پہنچی۔ دستک دینے پر ان کی آواز سن کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ وہ اس وقت یونیفارم تبدیل کر کے سادہ لباس پہن چکے تھے۔ وہ کسی فائل کے مطالعہ میں غرق تھے۔ ایک طرف غزنوق بھی بیٹھی ان سے پڑھ رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ حوریہ پر ڈالی اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

''زمان بھائی!'' حوریہ نے انہیں پکارا اور چلتی ہوئی قالین پر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

''ہوں!'' وہ کافی مصروف تھے۔ ''کہو حور..... کیا بات ہے؟'' ان کی نظریں بدستور فائل پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''ایکسکیوزمی..... زمان بھائی! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا.....'' وہ خاموش ہو کر بات کو آگے بڑھانا چاہتی تھی کہ زمان بھائی فائل بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''اب ڈسٹرب کر دیا نا..... چلو بولو..... کیا بات ہے؟ تمہیں پتا ہے حور..... میری بہت خواہش تھی کہ ماہم مجھ سے کوئی فرمائش کرے، مجھ سے لڑائی جھگڑا کرے، میں اپنی بہن کو اس کی فرمائش پر چوڑیاں اور کپڑے لا کر دوں مگر پتا نہیں وہ ایسا کیوں نہیں کرسکی۔'' ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''وہ خاموشی سے پیا دیس سدھار گئیں، اب تم ہو، غزنوق ہے، حنان تو ہمیشہ ہی باہر رہتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم دونوں مجھ سے جھگڑا کرو، اپنی فرمائشیں کرو، میں انہیں پورا کر کے خوشی محسوس کروں گا، مجھے دلی مسرت ہوگی..... اب بتاؤ کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے؟ منہ کو لٹکا کر نہیں..... بلکہ مسکرا کر کہنا۔''

''زمان بھائی! آپ نے کبھی بوا کو دیکھا ہے؟'' وہ اس کا سنجیدہ سوال سن کر ہنسنے لگا بلکہ لوٹ پوٹ ہوگیا۔

''واہ! بہنا واہ! میرا خیال ہے کہ یہ آج کا جوک ہے......'' وہ ہنستے ہوئے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولے تو غزنوق بھی مسکرانے لگی۔ حوریہ نے غزنوق کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ فوراً ہی ہونٹوں کو دبا کر خاموش ہوگئی جب کہ زمان بھائی کے لبوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔

''بوا بیوہ کیسے ہوئی تھیں؟'' اس نے یک دم گولی چلادی تو زمان کے چہرے اور جسم کے تمام خدوخال واپس نارمل ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وہ سنجیدہ ہو کر حوریہ کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے معاملے کی سنجیدگی کا نوٹس لیتے ہوئے غزنوق کو اپنے کمرے میں جانے کا کہا۔

غزنوق چلی گئی تو زمان بھائی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''بیٹھو حور......'' اب وہ پولیس والے تھے۔ ''کھل کر کہو...... کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''زمان بھائی! کبھی کبھی آنکھیں جو دیکھ کر دل کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں وہ بالکل غلط ہوتا ہے۔ دل نادان ضرور ہے مگر آنکھوں دیکھی باتوں پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔ ہنستے مسکراتے چہرے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے اک اک پل خوشیوں کا چرانے کی کوشش میں اپنا آپ گنوا دیتے ہیں۔ ہمیں وہی نظر آتا ہے جو ہم دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم وہ کبھی بھی نہیں دیکھ پاتے جو ہمیں دل سمجھانے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات ہم اپنی خوشیوں میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ اپنے ساتھ والے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ ہمارے ساتھ ہی خوش ہے یا پھر علیحدگی میں بھی اس کی خوشی قائم رہتی ہے۔ بس ہم خودغرضی اور مطلب کی زندگی جی کر اپنا کردار ادا کرتے ہوئے اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں مگر ہمارے ساتھ والے کو ہم سے جو گلے شکوے رہ جاتے ہیں۔ وہ اس کی آہیں اور فریادیں بن جاتے ہیں۔ جب وہ آہ عرشِ بریں تک پہنچتی ہے تو ہماری زندگی بھر کی جمع پونجی نیکیوں میں سے بہت سی نیکیاں کم ہو جاتی ہیں...... اور پھر اسی طرح آہستہ آہستہ ہم اپنی نیکیوں کا پلڑا خالی کر لیتے ہیں اور پھر گناہوں کی وجہ سے دوزخ ہمارا ٹھکانہ بن جاتی ہے۔'' وہ سانس لینے کے لیے رُکی تو زمان بھائی نے اُسے پانی کا گلاس پیش کیا جو اس نے ایک ہی سانس میں ختم کر لیا۔

''کیوں نہ زمان بھائی! ہم دوزخ کمانے کی بجائے نیکی کے پلڑے میں اپنی نیکیوں کی تعداد بڑھا کر گناہوں کو مات دیں۔'' وہ خاموش ہوگئی تو سنجیدہ زمان بھی اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔

''حوریہ! میری نظروں اور ذہن میں تھا کہ تم ایک کھلنڈری اور لاابالی لڑکی ہو مگر آج تم نے فلسفۂ زندگی پر جو طویل اور مستند لیکچر دیا ہے۔ میں تمہاری ذہانت اور زندگی کا بہت قریب

سے تجزیہ کرنے پر قائل ہو گیا ہوں۔ اس طویل لیکچر کا مقصد کیا ہے؟ میں نہیں جانتا مگر اتنا جان گیا ہوں کہ ہمارے گھر کا ہی کوئی مسئلہ ہے؟''

''ہاں زمان بھائی! ماہ نور بوا کا مسئلہ ہے۔''

''کھل کر کہو حور کیا بات ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں، زندگی کے ہر محاذ پر۔'' زمان بھائی کا حوصلہ پا کر وہ بھی شیر ہوگئی تھی۔

اس نے ماہ نور بوا سے سنی ہوئی تمام کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ زمان کی آنکھیں کبھی کھل جاتیں اور کبھی حیرت کی شدت سے پھٹنے لگتیں۔

☆=====☆=====☆

مرادالحسن نے حوریہ کے نمبر ڈائل کر کے فون کانوں کو لگا لیا۔ بیل ہو رہی تھی...... کافی دیر بعد حوریہ نے اٹینڈ کیا تو وہ سوئی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

''ہیلو!''

''ہیلو میڈم! شاعر مرادالحسن عرض گزار ہے۔'' مراد کا انداز دل کش تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ حوریہ نے اب سکرین پر اس کا نمبر دیکھا ہوگا اور چونک گئی ہوگی۔

''جی سر! کیسے ہیں آپ؟'' دوسری طرف سے یہ سن کر مرادالحسن محظوظ ہوتا ہوا بولا۔

''جنہیں چاہا جاتا ہے، انہیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا جاتا ہے مگر پھر ایک دن انہیں سر سے اتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔''

''آئی ایم سوری جاذب! میری مطلب تھا کہ تم...... پہلے سر ہو بعد میں جاذب۔'' وہ غلطی محسوس کر کے معذرت خواہانہ انداز اپنا کر رہ گئی۔

''تو پھر میڈم! آپ کی...... محترمہ ماہم کی ویڈیوز تیار ہوگئی ہیں، زحمت کر کے لے جائیں۔''

''اگر آپ ہی زحمت کریں تو بہتر ہوگا...... میں آج کل ایک مسئلے میں اُلجھی ہوئی ہوں۔'' وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' مراد کو تشویش ہوئی۔

''ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں تو آپ کب آرہے ہیں؟''

''ابھی...... آدھے گھنٹہ تک پہنچ رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے فون بند ہونے پر اس نے سی ڈیز اٹھائیں اور ایک بیگ میں ڈال کر دکان سے باہر آ گیا۔

فی الحال کوئی بھی فنکشن نہ تھا کہ وہ مصروف ہوتے۔اس نے اپنا آپ آئینے میں دیکھ کر گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔اب وہ قصرِ ماہ نور کی طرف جارہا تھا جو کہ اس کی والدہ کا گھر تھا۔اس کے ماموں وہاں رہتے تھے۔اس کے کزن زمان، حنان اور غزنوق کے علاوہ ایک جان بھی تو رہتی تھی، حوریہ کی شکل میں۔

لیکن اب وہ اس بات کا شدت سے خواہاں تھا کہ ''ماں'' سے ملاقات ہو جائے۔اگر نہ بھی ہوئی تو وہ حوریہ سے کہہ کر ان سے مل لے گا۔اس کے ہاتھ میں اس وقت ماہ نور کی خوبصورت سٹل والی فریم شدہ تصویر تھی۔یہ اس کی ویڈیوگرافی کا کمال تھا کہ تصویر دیکھتے ہی لگتا تھا کہ ابھی باتیں کرنے لگے گی۔

اس نے گیٹ پر ہارن بجایا تو ایک چھوٹے لڑکے نے گیٹ کھولا۔مراد گاڑی اندر لے گیا، ایک ملازمہ اس کی طرف بڑھی تو اس نے حوریہ بی بی سے ملنے کا کہہ کر بھیج دیا۔ملازمہ نے اسے وسیع ڈرائنگ روم تک رہنمائی پیش کی، وہ ہر اک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

بابا نے واقعی عشق کرتے وقت اپنی حیثیت نہ دیکھی تھی اور اب وہ خود بھی اس روش پر چل رہا تھا مگر اب ان کی پوزیشن کافی مضبوط تھی۔صفدر حسین کا کافی ''بزنس'' تھا اور پھر شہر بھر میں مرادالحسن کا نام بھی تھا۔وہ ماں سے ملنے کو بے چین تھا۔اس کی دعا اور دل کی تڑپ رنگ لائی تھی۔ڈرائنگ روم کے ایک طرف سے ماہ نور چلتی ہوئی آرہی تھی۔مرادالحسن انہیں دیکھتے ہی احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔اس ماں کی گود سے وہ بیس برس جدا رہا تھا۔اس کی ممتا کی گرمی سے وہ استفادہ نہ کر سکا تھا۔

صفدر حسین نے جب سے اسے بتایا تھا کہ وہ باوقار پرسنالٹی کی شخصیت ماہ نور کا بیٹا ہے تو وہ تڑپ اُٹھا تھا۔اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں، وہ بھاگ کر ماں کے سینے سے نہ لگ سکتا تھا۔مدتوں کی تڑپ اور پیاس کو بس رازداری اور پردہ سے ہی بجھا سکتا تھا۔

ماہ نور چلتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''السلام علیکم!'' مراد نے انہیں سلام کرنے میں پہل کی تو وہ خوش ہو کر اس کا جواب دیئے کر بیٹھ گئیں۔مراد ان کی طرف دیکھے جارہا تھا، بے شک اس کی ماں اس زمانے کی گریس فل شخصیت تھیں۔

''کہو بیٹا! کوئی کام تھا؟''

''آپ کو دیکھنے آیا تھا۔'' وہ لرزتے ہونٹوں سے الفاظ نکال چکا تھا۔اب ان کو عملی جامہ

بھی پہنانا تھا۔ماہ نور نے حیرانگی سے دیکھا اور بولیں۔

''مجھے؟''

''ہاں..... آپ کو دیکھ کر مجھے میری ماں یاد آتی ہے، وہ بالکل آپ جیسی تھیں...... آپ نے میری اس بات کا برا تو نہیں منایا؟''

''نہیں بیٹا! مجھے اچھا لگا...... اچھا لگا کہ کوئی بیٹا مجھ میں اپنی ممتا کی جھلک محسوس کرتا ہے۔'' ان کا کرب ان کے الفاظ سے ظاہر ہو گیا تھا۔اتنی دیر میں حوریہ بھی آگئی۔مراد نے فوراً بات بدل کر ماہ نور کا پورٹریٹ اٹھایا اور انہیں بطور تحفہ دیتے ہوئے اپنا شاپ کا آئیڈیا بھی سنایا کہ ہر شادی میں ہم ایک خوبصورت سٹل نکال کر تحفہ کے طور پر اس شخصیت کو دیتے ہیں۔''اس شادی کی ڈیشنگ پرسنالٹی آپ ہی تھیں۔اس لیے میری طرف سے...... ایک بیٹے کی طرف سے اپنی ماں کو یہ حقیر ساتحفہ۔'' لفظ ماں پر اس کے ہونٹ لرز گئے مگر اس نے قابو پالیا۔اتنی دیر میں وہی ملازمہ چائے لے کر آ گئی۔

مرادالحسن کی طرف سے فریم شدہ پورٹریٹ لے کر ماہ نور نے ساتھ والے صوفے پر رکھ دیا۔''شکریہ بیٹا!''

''اور ہمارا کام؟'' حوریہ نے بھی اپنی زبان کھولی۔مرادالحسن نے مسکراتے ہوئے سی ڈیز والا بیگ اس کی جانب بڑھا دیا۔

''شکریہ۔'' اس نے بیگ لیتے ہوئے کہا۔

چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد وہ جانے کے لیے اٹھا تو ماہ نور بھی اٹھ گئی۔وہ اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔حوریہ بھی بوا کی موجودگی میں کوئی بات نہ کر سکی تھی۔حالانکہ اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔اس نے زمان بھائی سے تمام بات کر لی تھی مگر اپنے عشق کو چھپا کر۔

اب زمان بھائی اپنے ''کام'' میں مصروف ہو گئے تھے۔

''بوا...... آپ میرے کمرے میں آجائیں۔پھر اکٹھے ہی سی ڈیز دیکھ کر باقی گھر والوں کو بعد میں دے دیں گے۔'' حوریہ نے بوا کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ پیار سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔

''مجھے تمہاری پسند...... پسند ہے۔''

ماہ نور نے فریم سے گفٹ پیپر اتار کر دیکھا تو جاذب کے فن کی داد دینے کے لیے وہ قابلِ تحسین نظروں سے تصویر کو دیکھنے لگی۔

''ایک بیٹے کا ماں کو تحفہ۔'' ان کے کانوں میں جاذب کے الفاظ گونج گئے تو وہ مغموم ہو گئیں۔

☆=====☆=====☆

ایس پی زمان کی ٹیبل پر کھلا ہوا خط پڑا تھا۔ جس نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ اس نے اس تحریر کو بار بار پڑھا تھا۔

''محترم......! ایس پی زمان صاحب!

السلام علیکم!

اپنی بوا ماہ نور کی کہانی ان کی زبانی سن کر خاموش ہو کر اس بات کی تفتیش ضرور کریں کہ گزشتہ کئی برس پہلے خان پور میں جنید کی شادی کے روز جو نیلے رنگ کی ڈاٹسن حادثہ کا شکار ہوئی تھی کیا اس کے تمام سوار جاں بحق ہو گئے تھے۔

قصرِ ماہ نور کے مکینوں کی نظر میں فیض الحسن اور اس کا بیٹا مراد الحسن جاں بحق ہو چکے ہیں مگر نام نہاد قبروں کو پوجنا بھی آج کل رواج ہے۔''

والسلام

انصاف کا طالب

اس نے حوریہ سے تمام داستان سن لی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ گھر میں کوئی ڈرائیور یا پھر چوکیدار کیوں نہیں ہے۔

بقول حوریہ کے وہ کئی بار بوا کے ساتھ ان قبروں پر جا چکی ہے مگر بوا کا اصرار ہے کہ ان کے بیٹے اور خاوند کو گھر کے کسی فرد نے قتل کروایا ہے۔

مگر یہ خط اس حقیقت کو آشکار کرتا تھا کہ وہ قبریں کسی اور کی ہیں۔ وہ دونوں باپ بیٹا زندہ ہیں۔ یعنی کہ بُوا اور حوریہ اس حقیقت سے لاعلم ہیں کہ بوا بیوہ نہیں ہیں اور پھر اس خط میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خان پور کے حادثے کے ذمہ داروں کو تلاش کیا جائے۔

ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے اس نے جو داستان حوریہ کی زبانی سنی تھی۔ اس کا شک تایا جی عبدالرحمٰن پر جاتا تھا اور تفتیش تو شک کی بنیاد پر ہی شروع ہوتی ہے اور پھر بوا نے بھی حوریہ سے کہا تھا کہ اپنے باپ سے اس وقوعہ کی تفتیش شروع کرے۔

فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ وہ سوچوں کے گہرے بھنور سے نکل آیا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آنے والی آواز کسی عورت کی تھی۔

''مجھے ایس پی زمان صاحب سے بات کرنی ہے۔'' اس عورت کا لہجہ باوقار اور ٹھہرا ہوا تھا۔

''جی کہیے محترمہ! میں ایس پی زمان ہی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے کاغذ اور پنسل پکڑ لیا تھا کیوں کہ اکثر فون پر جو بھی شکایات ہوتی ہیں وہ انہیں فوراً نوٹ کر لیتا تھا، پھر بعد میں ان کا ازالہ کر دیا جاتا تھا۔

''ایس پی صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ کو خط مل گیا ہوگا؟'' دوسری طرف سے آنے والی آواز نے اس کی نظریں ایک بار پھر خط پر مرکوز کر دیں۔

''جی ہاں! میرے سامنے پڑا ہے۔''

''تو پھر اس کیس پر کام کیجیے...... میرا مطلب ہے کہ عملی طور پر اس پر کام شروع کیجیے۔'' اس کی آواز سے لگتا تھا کہ کوئی عورت آواز بدل کر بات کر رہی ہے۔

''مگر آپ کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟'' وہ لکھنے کے لیے تیار تھا۔

''آپ کے لیے اتنا ہی بتا دینا ضروری ہے اور کافی بھی ہوگا کہ اس حادثے میں جاں بحق ہونے والے دونوں باپ بیٹا اس وقت صحیح سلامت میرے پاس ہیں۔''

''ہیلو...... ہیلو......'' مگر دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو چکا تھا۔

اب اس فون نے اس کی افسری گھما کر رکھ دی تھی۔ اس نے فوراً حوریہ کو فون کرنے کے لیے اپنا ذاتی موبائل استعمال کیا، رابطہ ہونے پر وہ فوراً بولا۔

''حوریہ! کہاں ہو؟''

''کچہری بازار میں بک سپاٹ پر۔'' دوسری طرف حیرت بھری آواز اُبھری۔

''وہیں رہو! میں چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے محرر کو بتایا کہ وہ ضروری میٹنگ میں جا رہا ہے کوئی بھی سائل آئے تو اسے شام چار بجے کا وقت دے دینا۔ وہ یہ کہہ کر ایس پی آفس سے باہر نکلا تو ڈرائیور گاڑی میں تیار بیٹھا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر گاڑی سے اتارا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کچہری بازار کی طرف گاڑی بھگا دی۔

حوریہ کو حیرانی اور پریشانی کی حالت میں اس نے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑا دی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں زمان بھائی!'' مین روڈ پر آ کر حوریہ نے زبان کھولی تو زمان

نے خط اور بعد میں کسی عورت کا فون والا پورا قصہ سنا دیا، وہ حیرانگی سے سننے لگی۔

"اس کا مطلب ہے کہ انکل فیض الحسن زندہ ہیں؟" اس کے لہجے میں خوشی اور جوش پوشیدہ تھا۔

"اس میں خوش ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ عورت فون پر جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔" زمان نے اس کی ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے پولیس کا روایتی انداز اپنایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"مجھے بتاؤ کہ تم اور ماہ نور بوا کس قبرستان میں آتی ہو؟"

"کاکے سائیں والا قبرستان جو کہ گاؤ شالہ کے قریب ہے۔" حوریہ نے جواب دیا تو زمان نے گاڑی اس طرف موڑ لی...... گاڑی پرانے بوہڑ کے درخت کے نیچے جا کر رک گئی تو وہی نوجوان مجذوب جس کا نام تو نہ جانے کیا تھا مگر بقول اس کے وہ عبداللہ ہے۔ وہ ان کی گاڑی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس قبرستان میں پہلی مرتبہ کسی پولیس والے کو آتے دیکھا تھا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے فیض الحسن اور مراد الحسن کی قبروں پر پہنچ گئے۔ حوریہ نے اشارہ سے ان قبروں کی طرف انگلی کی تو زمان ان قبروں پر لگے ہوئے کتبوں کی تواریخ پڑھنے لگا۔

اس نے کاغذ اور پنسل نکال کر دو جنوری 1978ء کی تاریخ کاغذ پر درج کر لی۔

"آج کل قبروں کو پوجنا رواج بن گیا ہے۔" اس نے حوریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ حیرانگی سے دیکھنے لگی، وہ ہنستا ہوا بولا۔

"میں نہیں کہتا، یہ الفاظ اس عورت نے فون پر مجھ سے کہے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ قبریں کسی اور کی ہیں؟"

"اس کی تصدیق تو تبھی ہو گی جب ہم ان قبروں کے مکینوں سے زندہ اور حقیقی حالت میں ملیں گے۔" زمان ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے گورکن کو دیکھا جو ایک تازہ قبر کی کھدائی کر رہا تھا۔ وہ زمان کے اشارہ کرنے پر ان کے پاس چلا آیا۔ اس کی گندی سی بنیان، مٹی اور پسینے سے مزید گندی ہو رہی تھی اور پسینہ اس کے پورے بدن کو شرابور کر رہا تھا، پاس آ کر اس نے زمان کو سلام کیا۔

"کب سے اس قبرستان میں ہو؟"

"اِدھر ہی آنکھ کھولی ہے جناب اور عمر کی آخری گھڑیاں بھی اِدھر ہی گزار رہے ہیں۔" وہ عاجزی سے بولا تو زمان نے ان دونوں قبروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر یہ دونوں قبریں بھی تم نے ہی کھودی ہوں گی؟"

"جی صاحب! بات اگرچہ کافی پرانی ہے مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان قبروں کی کھدائی میتیں دفن کرنے سے ایک دن پہلے ہی کروائی گئی تھی۔" گورکن کی بات سن کر وہ دونوں چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟"

"نہیں صاحب! یہ کوئی حیرانگی والی بات نہیں ہے۔ بعض اوقات مرنے والے کے لواحقین کسی دور دراز علاقوں سے بروقت نہیں پہنچ پاتے تو پھر وہ جنازہ اگلے دن پڑھایا جاتا ہے۔" اس کی بات میں وزن تھا، زمان سر ہلا کر رہ گیا۔

"کیا تمہیں یاد ہے کہ اس قبر میں جس شخص کو دفن کیا گیا ہے، اس کی موت کس طرح ہوئی تھی؟"

"ہمارے پاس ایک رجسٹر ہے صاحب! جس میں ہم قبر کھدوانے سے مرنے والے کا نام پتا اور وجۂ موت لکھوا لیتے ہیں اس طرح ان قبروں کے متعلق بھی لکھا ہو گا۔"

"وہ رجسٹر کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں موجود ہے جناب، آپ کہیں تو میں ابھی لا کر دکھاتا ہوں۔"

"ہوں! لے کر آؤ۔" وہ زمان کا حکم سن کر فوراً بھاگ کر قبروں کو پھلانگتا ہوا غائب ہو گیا۔

"زمان بھائی! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" حوریہ سہم کر بولی۔

"ہاں بھئی ڈرنا تو فطرتی بات ہے، ہم قبرستان میں کھڑے ہیں کون سا کسی پارک میں کھڑے ہیں؟" وہ پولیس والا تھا اس موقع پر بھی خوف زدہ نہ تھا مگر حوریہ اس کے اندازِ تفتیش سے حیران ہو رہی تھی اور قبرستان کے ماحول سے خوف زدہ بھی تھی۔

وہ گورکن ہاتھ میں ایک رجسٹر اٹھائے قبروں کو پھلانگتا ہوا ان کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا، پاس آ کر اس نے زمان کو رجسٹر پکڑاتے ہوئے کہا۔

"صاحب! آپ اس میں سے دیکھیں میں اتنی دیر میں قبر نکال دوں، ابھی جنازہ پہنچنے ہی والا ہو گا۔" اس کے انداز میں لجاجت اور منت تھی۔ زمان نے اس کے ہاتھ سے رجسٹر لے کر اس کو قبر کھودنے کی اجازت دی تو وہ چلا گیا۔

بوسیدہ رجسٹر کے کافی اوراق پھٹ چکے تھے مگر ان کو آٹے وغیرہ سے جوڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ 2 جنوری 1978ء کا دن، صفحہ نکالتے ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

قبر کی کھدوائی کروانے والے نے یکم جنوری کو ہی تین قبروں کا آرڈر دے دیا تھا۔ تینوں قبروں کے مُردوں کے لیے موت کی وجہ روڈ ایکسیڈنٹ لکھوائی گئی تھی۔ ایک چھوٹی قبر کا سائز اور دو بڑی قبروں کے لیے آس پاس ہی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ مگر اگلی سطر پڑھتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے رجسٹر گر گیا، حوریہ بھی کانپ کر رہ گئی تھی۔

کیوں کہ مرنے والوں میں فیض الحسن، مراد الحسن اور ماہ نور کا نام بھی درج کروایا گیا تھا۔ ان دونوں کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ حیرت سے بار بار اس صفحہ کو پڑھ رہے تھے۔ جس پر مرنے والوں کی قبر کی کھدائی کا آرڈر پیشگی درج تھا۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، اس نے ان تینوں کو ہی مارنے کی مکمل اور جامع منصوبہ بندی کی تھی مگر ماہ نور بوا جو کہ جان توڑ مراحل سے گزر کر زندگی کی دہلیز تک پہنچی تھیں، اب بھی زندہ تھیں اور قاتل نے دوبارہ انہیں قتل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

وہ قبرستان سے واپس آ رہے تھے تو دونوں کے ہی ذہن الجھے ہوئے تھے کیوں کہ فون والی عورت کہتی تھی کہ مراد الحسن اور فیض الحسن اس کے پاس زندہ حالت میں موجود ہیں اور ان کی قبریں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ دونوں مر چکے ہیں۔ یہ معاملہ انتہائی الجھن اختیار کر گیا تھا۔

''زمان بھائی! آپ کیا کہتے ہیں؟'' وہ بک سپاٹ پر اُتری تو زمان بھائی سے پوچھ بیٹھی۔

''حوریہ! یہ کیس کافی اُلجھ گیا ہے، اس سلسلے میں ایک ہی فرد ہے جو ہماری مدد کر سکتا ہے۔''

''کون؟'' وہ جھٹ سے بولی۔

''فون والی عورت۔''

''آپ سی ایل آئی سے اس کا نمبر ٹریس کریں۔''

''آج کل موبائلز کی اتنی بھرمار ہے کہ کنکشن مفت مل رہے ہیں اور مفت کنکشن سیل کرنے والے خریداروں کے نام پتے کا ریکارڈ نہیں رکھتے۔ اس طرح ترقی اور جدت نہیں بلکہ تباہی اور بربادی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔'' وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے بولے۔ ''شام کو گھر پر ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ تو چلے گئے مگر حوریہ حیران اور پریشان تھی۔

''فیض الحسن انکل...... آپ زندہ ہیں تو ہمیں مل کیوں نہیں جاتے؟'' اس نے اپنے دل میں ہی بڑبڑاہٹ کی تھی کہ کسی نے اس کے ہاتھوں سے اس کا بیگ چھین لیا۔ اس نے خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں اس آدمی کی طرف دیکھا تو وہ مراد الحسن کے بابا فیض الحسن

تھے۔ جو اس کے ساتھ شرارت کر کے ہنس رہے تھے۔

''مجھے جاذب نے بتایا کہ میں نے عالمِ مدہوشی سے تم سے کتب والا بیگ چھینا تھا اور تم کو کسی گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر میرا دل چاہا کہ تم سے اس ہوش کے عالم میں بھی شرارت کروں تو تمہارا ردعمل کیا ہوتا ہے؟'' بابا مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''وہ سامنے دیکھو! جاذب کھڑا تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' بابا فیض الحسن نے اشارہ کیا تو اس کی نگاہ سڑک پار فیشن مووِیز کی جانب اٹھ گئی۔ جاذب ہاتھ کے اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔

''میڈم! کہاں کھوئی ہوئی تھیں؟'' پاس آنے پر جاذب اسے شاپ کے اندر بنے ہوئے الگ آفس نما کمرہ میں لے گیا مگر حوریہ کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ جب وہ اس کمرہ میں داخل ہوئی تو اس کی تصویروں سے وہ کمرہ بھرا ہوا تھا۔ اس کے مختلف سائز اور مختلف زاویوں سے مختلف ڈریسز میں لیے گئے پورٹریٹ سے کمرے کی دیواریں مسکرا رہی تھیں۔ وہ حیرت اور خوشی کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔

''جاذب!'' وہ اس کی طرف دیکھ کر دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

''تمہیں برا لگا؟''

''بہت...... اچھا۔''

''حوریہ! میں ان تصویروں سے گھنٹوں باتیں کرتا ہوں۔''

''مگر یہ تو بے جان ہیں۔'' وہ اک ادا سے بولی تھی اور جاذب کی مسکراہٹ نے اس کی ادا کو آنکھوں کے راستے دل میں بسا لیا تھا۔

''یہ میری باتوں کا جواب دیتی ہیں...... اپنی آنکھوں سے، ہاتھوں سے، ہونٹوں اور خوبصورت چہرے سے، مجھے میری ہر بات کا جواب ملتا ہے۔''

''اتنا پیار کرتے ہو مجھ سے؟''

''پیار کو ناپنے والی کوئی کسوٹی نہیں ایجاد ہوئی اگر ہوئی ہوتی تو ضرور بتاتا کہ میرا پیار کتنے کلوگرام اور کتنے میٹر کا ہے۔'' جاذب کی بات بہت ہی معقول تھی۔

''مجھے خود پر غرور ہونے لگا ہے...... کیسا لگتا ہے کہ جب کوئی تمہیں چاہنے لگے...... اس بات کا اندازہ مجھے آج ہوا ہے، میں تمہارے پیار کی قدر کرتی ہوں جاذب!''

''اچھا یہ بتاؤ کہ آپ کی بوا کیسی ہیں؟ انہیں میرا حقیر سا تحفہ پسند آیا یا نہیں۔''

"تمہارا تحفہ بہت اچھا تھا مگر تم انہیں بہت پسند ہو۔" وہ نظریں جھکا کر بولی تو جاذب بھی مسکراتا ہوا پوچھ بیٹھا۔

"میں انہیں کیوں پسند ہوں؟"

"میرے لیے۔" اس مختصر سے جواب نے جاذب مراد الحسن کے دل کی دنیا روشن کر دی تھی۔ بابا اور ماں کا ملاپ آسان بنا دیا تھا۔ وہ دونوں کو ہی پیار بھری نظروں سے دیکھتی تھیں۔ جاذب اور حوریہ کو۔

"آج کل کہاں کھوئی ہوئی ہو؟" وہ اپنے اصل موضوع کی طرف بڑھنے لگا۔

"انتہائی سیریس مسئلہ ہے جاذب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟" وہ واقعی پریشان تھی۔ جاذب نے پہلی بار اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو حوریہ کو اپنی روح تک اس کی تاثیر محسوس ہوئی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے اس کے ہاتھ کو دبایا تو وہ تشکر آمیز نظروں سے جاذب کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

"مجھے کچھ بتاؤ...... تاکہ میں تمہاری پریشانی کا حل ڈھونڈ سکوں۔" اس نے اس قدر پیار سے پوچھا تو حوریہ تمام داستان چیدہ چیدہ الفاظ میں بیان کرنے لگی۔

جاذب قبروں کے تذکرے پر چونک پڑا مگر اس نے حوریہ کو محسوس نہ ہونے دیا۔ حوریہ اپنی داستان کہتی رہی، وہ بڑے انہماک سے سنتا رہا۔ حوریہ نے بوا کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو سنا دی۔ صفدر حسین اور حوریہ کی زبانی سنی جانے والی کہانی بالکل ایک جیسی تھی مگر اس میں قبروں کا تذکرہ شامل تھا کیوں کہ صفدر حسین کہتا تھا کہ اس نے ان دونوں کی لاشوں کو خود قبر میں اتارا تھا۔

اب پتا کرنا تھا کہ لاشیں کن کی تھیں، جنہیں صفدر حسین دفنا کر آیا تھا۔ قاتل نے ان کی تلاش کی ناکامی کے بعد کن دو افراد کو دفن کروا دیا؟ یہ ایک معمہ تھا۔

خیر اس نے حوریہ کی داستان سن کر اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہ چلی گئی تو جاذب سوچنے لگا اس کا مطلب ہے کہ حوریہ بھی بابا کی کہانی سے اچھی طرح واقف ہے۔ اب کہانی کے اس کردار کو تلاش کرنے کی ضرورت تھی جو یہ بتا سکے کہ جنید کی شادی پر کیا ہوا تھا؟

☆=====☆=====☆

زمان اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ تمام تھانوں کے انسپکٹر صاحبان اس کے

سامنے کرسیوں پر براجمان تھے۔ یہ ایمرجنسی میٹنگ تھی جس کا مقصد شہر بھر سے ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیاء کو ختم کرنا تھا۔

آئی جی صاحب کی طرف سے ضلع بھر کے تمام ایس پی حضرات کو ایک ٹاسک فورس قائم کرنے کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ جس نے شہر بھر کے تمام منشیات فروشوں کو گرفتار کر کے ان پر فردِ جرم عائد کر کے مقدمات اور چالان عدالتوں میں پیش کرنے تھے۔

زمان نے تمام انسپکٹروں پر واضح کر دیا تھا کہ آئی جی صاحب کی طرف سے تمام ایس پی صاحبان کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ فرائض میں غفلت اور نااہلی کا مظاہرہ کرنے والے تھانیدار کو فوری معطل یا لائن حاضر کر سکتے ہیں۔ اس لیے اپنے فرائض کو تندہی سے انجام دیتے ہوئے شہر بھر سے منشیات فروشوں کا خاتمہ ضروری قرار دیا گیا۔

"سر!" انسپکٹر محمد منظر نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کہا۔ "ہماری جدوجہد کی راہ میں بیوروکریسی اور سیاستدان حائل ہوئے تو ان کا کیا حل ہے آپ کے پاس؟" دوسرے انسپکٹروں کی زبان پر بھی یہی سوال تھا تبھی تو سبھی نے تائید میں سر ہلا کر ایس پی زمان کی طرف دیکھا۔

"آئی جی صاحب کے فرمان کے مطابق اس منشیات فروش سے مکمل ثبوت کے ساتھ سیاستدان اور کسی بھی متعلقہ بیوروکریٹ کا نام پتا نوٹ کر کے ان کے خلاف خفیہ طور پر کارروائی میں لائی جائے گی، کوئی شک یا کوئی سوال؟"

"نو سر!" کی آواز سے میٹنگ روم گونج اٹھا تو میٹنگ برخاست ہو گئی تو وہ ری لیکس ہونے کے لیے اپنے آفس میں بیٹھا چائے سے شغل کر رہا تھا۔ فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"السلام علیکم! ایس پی زمان؟" دوسری طرف سے سوالیہ انداز لیے ہوئے ایک نامعلوم مردانہ آواز تھی۔

"جی! میں ایس پی زمان بول رہا ہوں! کہیے؟" وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"میں فیض الحسن بول رہا ہوں۔"

"آئی ایم سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" اس نے دوسرا گھونٹ بھرا۔

"تمہارا انکل فیض الحسن!" زمان کے ہاتھوں سے کپ چھوٹ کر ٹیبل پر گر گیا۔ باقی چائے نے اس کی ٹیبل کا کپڑا اور کچھ کاغذات کو خراب کر دیا تھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہاری تفتیش سے مطمئن ہوں۔"

''لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں آپ کی مدد کے بغیر بالکل اندھیرے میں ہوں۔'' اس نے اعترافی بیان دیا تو دوسری طرف سے حوصلہ افزائی کی بات ہوئی۔

''دیکھو بیٹا! میں...... مانو سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اب زندہ ہوا ہوں تو اس کے بغیر اک اک پل کانٹوں پر گزر رہا ہے۔ میں خود چاہتا ہوں کہ میں اس سے جلدی ملوں مگر میری جلدی میں میرا اور میرے بیٹے کا مجرم بے نقاب نہ ہو سکے گا۔ اس طرح ہماری جانوں کو اس نامعلوم دشمن سے پھر خطرہ رہے گا۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں مگر میری درخواست ہے کہ آپ ایک بار صرف ایک بار مجھ سے مل لیں، میرا وعدہ ہے کہ میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ تب تک نہیں بتاؤں گا جب تک آپ کے مجرموں کو گرفتار نہیں کر لیتا۔''

''میں تم سے ضرور ملوں گا مگر سب سے پہلے اپنی مانو سے ملوں گا، مجھے مانو کا نمبر دو گے؟''

''ہاں! ہاں! کیوں نہیں...... آپ اس نمبر پر بوا سے بات کر سکتے ہیں۔'' اس نے ایک نمبر لکھوا دیا جو کہ ماہ نور کے موبائل کا نمبر تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کو کال نہ کی تھی۔ بس ناشتہ یا پھر کھانا کھانا ہوتا تو انہیں حوریہ مس کال کر دیتی۔ وہ نیچے ڈرائنگ ہال میں آ کر ناشتہ یا کھانا کھاتیں...... بغیر کوئی بات کیے خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر کھڑکی میں کھڑی ہو جاتیں۔

ایس پی زمان نے نمبر لکھوایا تو دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی اس نمبر پر ری ڈائل کیا تو دوسری طرف سے اس کی توقع کے مطابق ہی جواب تھا۔

''براہِ کرم تھوڑی دیر بعد کال کریں، فی الحال جواب موصول نہیں ہو رہا۔''

صفدر حسین اور مراد الحسن اس وقت فیض الحسن کے ساتھ گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماہم کی شادی کی فلم چل رہی تھی۔ فیض الحسن حیرانگی سے کبھی ان کی طرف اور کبھی قصرِ ماہ نور کے مکینوں کی طرف سکرین پر دیکھنے لگتا تھا۔ ماہ نور کی تصویر آئی تو وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا مگر صفدر حسین نے اسے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بے چینی اور بے قراری سے فلم دیکھ رہا تھا۔

اسے اک اک پل یاد آنے لگا تھا۔ وہ اس کے محل کے لان میں ٹہلتا رہا تھا۔ وہ ان دیواروں کو پھلانگ کر ماہ نور سے ملنے اس کے کمرے میں جایا کرتا تھا۔ اس کی ماہ نور کتنی سوگوار اور غمناک ہے؟ اس نے سوچا اور خاموشی سے فلم دیکھنے لگا۔

فلم کے اختتام پر وہ صفدر حسین اور مراد الحسن کی طرف عجیب سی استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''چاچا! چاچی مانو...... حج کرنے نہیں گئی۔'' وہ صفدر حسین کے منہ سے سن کر حیران ہو گیا تو پھر اس نے فیض الحسن کو وہ تمام داستان سنا دی جب وہ منڈی سے قصرِ ماہ نور پہنچا تو وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ دو لاشیں جو کہ بری طرح جل چکی تھیں۔ ان کو فیض الحسن اور مراد الحسن کا نام دیا گیا تھا۔ صفدر حسین نے انہیں اپنے ہاتھوں سے دفن کرنے کا تمام واقعہ سنایا۔

''پھر تقریباً آٹھ دن بعد چاچی مانو کو ہوش آیا تو وہ ان قبروں پر پہنچ کر اتنا روئی کہ اس کے آنسو ختم ہو گئے...... وہ اور میں آپ کو مُردہ ہی سمجھ چکے تھے مگر ایک دن میں ٹہلتا ہوا دریا کنارے پہنچا تو میری ملاقات قادر علی چاچے سے ہو گئی۔ تم دونوں اس کی جھونپڑی میں موجود تھے۔ تم کو زندہ دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ چاچے قادر علی کو اللہ نے علم سے نوازا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی تمہارے سسرال والوں سے ہی تمہارا قاتل ہے اور جب تک تم بالکل تندرست اور توانا نہیں ہو جاتے اور مراد الحسن جوان نہیں ہو جاتا۔ میں آپ کے سسرال میں سے کسی سے بھی رابطہ نہ کروں۔ حتیٰ کہ چاچی مانو سے بھی نہیں۔ تم اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے۔ میں تمہیں قادر علی کی جھونپڑی سے لے کر آیا اور فوراً ہی پرانے گھر کو چھوڑ کر تمہارے علاج معالجے میں لگ گیا، مراد الحسن کی تعلیم اور تمہاری بیماری...... میرے لیے دو اہم ترین مسئلے تھے مگر اللہ کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔ اب تم سنبھل چکے ہو چاچا! اسی لیے تمام حقیقت تمہیں بتا دی ہے۔'' صفدر حسین خاموش ہوا تو فیض الحسن روتا ہوا اس کے قدموں میں گر گیا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ صفدر حسین اور مراد الحسن کچھ سمجھ نہ پائے۔ صفدر حسین نے فوراً اسے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا کر ڈانٹنے لگا۔

''ڈنگر ہی ہو تم...... مجھے اپنا بیٹا بھی کہتے ہو...... اور گناہ گار بھی کرتے ہو...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا چاچا......'' وہ رونے لگا تو فیض الحسن بھی روتی ہوئی آواز میں بولا۔

''اوئے ڈنگرا...... تُو تو میری سوچ اور خیالوں سے بھی عظیم نکلا...... ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں کون کسی کے لیے اپنے آپ کو مارتا ہے...... میں تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں، صفدر حسین! تم نے...... میرے بیٹے کی زندگی اور مستقبل کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔'' وہ اس سے جدا ہو کر فوجی انداز میں سیلوٹ کرنے لگا، آنکھیں برسات بنی ہوئی تھیں۔

''تم بہت عظیم ہو...... بہت عظیم...... میں تو مر ہی چکا تھا مگر تم نے مجھے زندہ رکھنے کے لیے دن رات ایک کر دیا، خود کو زندہ درگور کر کے تم نے ہم باپ بیٹے کو زندگی دی۔ اے اللہ

اس بچے کو اس کی نیکی کا اجر دینا...... میں کنگلا محتاج اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا...... میرے اللہ...... میری زندگی بھی اس بچے کو لگا دے۔ بس یہی میری طرف سے اس کے احسانوں کا بدلہ ہے۔'' آنسوؤں کی زبان میں گفتگو نے ان کے دل دھو دیے تھے۔ مراد الحسن بھی باپ کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے اظہارِ تشکر کے لیے آنسوؤں کے نذرانے صفدر حسین کی محبت میں عقیدت کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

جب یادوں پر پر چھائی ہوئی دھند چھٹی، دل و دماغ پر چھایا ہوا کہر ختم ہوا، رو رو کر دلوں کے بوجھ ہلکے ہوئے تو فیض الحسن نے صفدر حسین کو سامنے بٹھایا اور بولا۔

''اب کیا کرنا ہوگا؟''

''تم جیسا کہو گے، ویسا ہی ہوگا مگر ہمارے ذہنوں میں اُلجھی ہوئی ایک گتھی کو سلجھا دو!'' وہ فکرمندی سے بولا تو فیض الحسن اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

''بولو صفدر حسین! اب یہ جان تمہاری امانت ہے۔''

''ایسی باتیں کر کے مجھے گناہ گار مت کرو چاچا! یہ بتاؤ کہ خان پور شادی تو دو جنوری کو ہونے والی تھی اور تمہاری گاڑی کو حادثہ بھی دو جنوری کی صبح ہی پیش آ گیا۔ کیا تم نے شادی میں شرکت نہیں کی تھی؟'' صفدر حسین کے ذہن میں یہ سوال اُلجھا ہوا تھا۔ فیض الحسن اس کی بات سن کر ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر انہیں جنید سے اپنے جھگڑے کے بارے میں بتانے لگا۔ ''جھگڑنے کے بعد فوراً ہی واپسی ہوئی تو جب گاڑی کا ٹائر نکل کر سڑک پر دوڑا تو میں نے مانو کو گاڑی سے باہر گرتے ہوئے دیکھا مگر گاڑی میرے قابو سے باہر ہو کر نیچے کھائی میں جانے لگی تو مراد الحسن بھی کھلے ہوئے دروازے سے نکل کر فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گر گیا۔ میں بھی گاڑی سے نکل کر نیچے گرا تو درختوں کے جھنڈ میں اٹک گیا۔ پھر میرا سر کسی تنے سے اتنی زور سے ٹکرایا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ پھر اسی بے ہوشی کی دنیا نے میرے قیمتی بائیس سال کھا لیے......'' وہ خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

''اور کچھ چاچا! جو تمہیں یاد ہو؟'' صفدر حسین نے پوچھا تو فیض الحسن دماغ پر زور دینے لگا۔

''ہاں!......'' وہ چونک کر بولا تو دونوں اس کی طرف تجسس سے دیکھنے لگے۔

''خان پور کے آدھے راستے میں ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا تو...... جب کھانا کھا کر پھر آگے کی جانب چلے تو کچھ دیر بعد تھوڑی دور جا کر مجھے احساس ہوا کہ گاڑی کے بریک فیل ہو

گئے ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی عقل استعمال کرتے ہوئے میں نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے لیے ایکسی لیٹر سے پاؤں اٹھا لیا...... پھر رحمٰن بھائی کی گاڑی میں ہم خان پور پہنچے تو جنید کا ملازم اگلے دن ہماری گاڑی لے آیا تھا۔''

''چاچا! ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو...... مگر دل کہتا ہے کہ جس جگہ تمہاری گاڑی کے بریک فیل ہوئے تھے۔ تمہیں اور مانو چاچی کو مارنے کی منصوبہ بندی کا آغاز ہو چکا تھا اور یہ آغاز اس پڑاؤ پر ہوا تھا، جہاں تم نے کھانا کھایا تھا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ کسی نے وہیں گاڑی کے بریک ناکارہ کر دیئے تھے۔'' مراد الحسن بولا تو صفدر حسین بولا۔

''بالکل!...... اس ہوٹل پر آپ کا دشمن کون تھا؟ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے مگر میں ایک بار...... آپ کو چاچی مانو کو وہاں لے جانا چاہتا ہوں...... چلو گے؟''

''پوچھ کیوں رہے ہو؟ بتاؤ کب جانا ہے، میں تیار ہوں۔'' فیض الحسن پُرجوش آواز میں بولا تھا۔

''پہلے تو تمہاری ملاقات چاچی مانو سے کروا دوں، پھر اکٹھے ہی چلیں گے۔''

''کب ملوا رہے ہو، مجھے میری مانو سے؟'' وہ شوقِ تجسس سے بولا تو صفدر حسین کا لہجہ ذرا سا شرارتی ہو گیا مگر بات کرتے ہوئے اس کا انداز ایسا تھا کہ فیض الحسن اسے پکڑ نہ سکے۔

''کچھ تو شرم کرو! بچے جوان ہو گئے ہیں...... بیوی سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہے ہو؟''

''اگر یہی بات میرے پاس کھڑے ہو کر کہو تو ابھی تمہارے دانت توڑ دوں گا......'' فیض الحسن اور صفدر حسین کی نوک جھونک سن کر مراد الحسن محظوظ ہو رہا تھا، فیض الحسن پھر بولا۔

''تمہیں معلوم تو ہے کہ میں مانو کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''وہ حج کرنے گئی ہیں۔'' صفدر حسین بدستور فیض الحسن کو چڑا رہا تھا۔

''اس ماہ میں تمہارے باپ کا کون سا حج ہوتا ہے......؟ حج کے مہینے کو تو گزرے ہوئے چھ ماہ ہو گئے ہیں......''

''اب تم بالکل ٹھیک ہو چاچا!'' وہ یہ کہتا ہوا فیض الحسن کی طرف بڑھا تو دونوں قہقہے لگاتے ہوئے گلے ملنے لگے۔

''میں ابھی تمہاری بات چاچی سے کروا سکتا ہوں مگر اس طرح تمہارے قاتل روپوش

ہی رہیں گے، وہ تمہیں پھر کبھی بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"پھر کب؟" وہ بے صبری سے بولا تھا۔

"مجھے صرف تین دن کا وقت دے دو، عنایت علی کا بیٹا، زمان ایس پی بن گیا ہے اور تمہاری بہو حوریہ عبدالرحمٰن بھی مرادالحسن کو حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر میں تفتیش کر رہی ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار اور...... میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ لمحات کٹھن ترین ہوں گے مگر تمہاری زندگی کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہر کام صبر اور طریقے سے کیا جائے۔" اس نے تمام تفصیل فیض الحسن کو بتا دی تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

صفدر حسین نے ماہ نور کے موبائل کا نمبر ملایا، جو اس نے زمان سے لیا تھا۔ اب وہ ماہ نور سے فیض الحسن اور مرادالحسن کی موجودگی میں بات کرنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ماہ نور کی حیرت بھری آواز اُبھری۔ صفدر حسین نے اپنے فون کا سپیکر آن کر دیا تھا اور فیض الحسن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"ہیلو!" مگر فیض الحسن مانو کی آواز سن کر تڑپ اٹھا۔ مدتوں بعد کسی نے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینکی تھی۔ اس کی ہلچل نے ایک جگہ ساکت پانی کو لہروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کی بے چینی اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیا میں...... مسز فیض الحسن سے مل سکتا ہوں؟" صفدر حسین نے پہلا پتھر پھینک دیا تو یقیناً اس کے ہاتھوں سے بھی موبائل لرز کر گر گیا ہوگا کیوں کہ آن سپیکر سے کوئی چیز قالین پر گرنے کی آواز سے انہوں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

"جی...... میں سمجھی نہیں......؟" مانو کی آواز میں حیرت تھی۔

"مسز فیض الحسن سے ہماری بات کرائیں پلیز!" صفدر حسین اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"میں...... مسز فیض الحسن...... ہی بول رہی ہوں...... آپ کون ہیں؟" ماہ نور کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ شاید اس آواز میں آنسوؤں کی آمیزش بھی شامل ہو؟ فیض الحسن اپنے دل پر جبر کر کے بیٹھا تھا۔

"میں آپ کا خیر خواہ ہی بول رہا ہوں مسز فیض الحسن...... کیا آپ میری بات...... اپنے شوہر سے کروا سکتی ہیں؟" صفدر حسین نے دوسرا پتھر پھینکا مگر فیض الحسن دوسری جانب ماہ نور کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"آپ اگر میرے خیر خواہ ہیں تو پھر آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا بھی کوئی حق نہیں

ہے۔" اس کی آواز میں تلخی نمایاں تھی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں مسز فیض...... آپ کے شوہر مجھ سے ملے تھے۔ انہوں نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا۔ آپ پلیز میری ان سے بات کروا دیں۔" صفدر حسین بالکل سنجیدہ تھا، وہ جانتا تھا کہ ماہ نور چاچی فون بند نہیں کرے گی کیوں کہ مدتوں بعد کوئی ان سے فیض الحسن کی باتیں کر رہا تھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...... فیض الحسن اس گھر میں نہیں رہتے۔" ماہ نور کی محبت آج بھی کل کی طرح تر و تازہ تھی۔ اس نے فیض الحسن کو مُردہ نہ کہا تھا۔ بس الفاظ بدل لیے تھے اور فیض الحسن اس وفا کی دیوی کی چاہت پر قربان ہو کر رہ گیا۔

"آپ ایسا کیجیے حوریہ کے ساتھ کل بک سپاٹ پر تشریف لائیں...... میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں اک اجنبی سے کیوں ملوں گی؟"

"میرے پاس آپ کے لیے فیض الحسن کی ایک نشانی ہے...... تو کل چار بجے بک سپاٹ......"

صفدر حسین نے فون بند کر کے فوراً ہی موبائل آف کر دیا۔ اس نے دوسری سم ڈال کر اب ایس پی زمان کا نمبر ملایا تو ایس پی زمان اپنے گھر میں تھا۔ "ہیلو" کہنے پر صفدر حسین بولا۔

"مسٹر ایس پی زمان! اپنی ماہ نور بوا سے پوچھو...... یکم جنوری 1978ء جب وہ خان پور گئے تھے تو راستے میں پڑاؤ کے بعد ان کی گاڑی کے بریک فیل ہوئے تھے؟"

"مگر ایسا کون اور کیوں کرے گا؟" ایس پی کی آواز بھی حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"دولت، سرمایہ اور جاگیر...... اچھے اچھوں کو شیطان فطرت بنا دیتی ہیں۔ اپنے باپ اور اپنے تایا عبدالرحمٰن کی دو دو تصاویر اپنی جیب میں ڈال لو...... ہم پھر ملیں تو تصاویر تمہاری جیب میں ہونا چاہئیں۔" اس نے پھر موبائل آف کر دیا۔

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں صفدر بھائی؟" مرادالحسن نے بے صبری سے پوچھا تو فیض الحسن نے بھی سر ہلایا۔ "ہاں! بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"چاچا! ایک تکّا لگانے والا ہوں، امید ہے کہ لگ جائے گا۔" وہ مرادالحسن کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"ماں سے ملو گے مرادالحسن!"

''ہاں صفدر بھائی! اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے کل تمہاری اور چاچے کی ملاقات چاچی ماہ نور سے کروا دیتے ہیں۔''

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا تو فیض الحسن بے قرار ہو گیا۔

''کہاں ملیں گے ہم، اس کتابوں کی دکان پر......؟''

''نہیں چاچا! اس مکان میں...... جس میں چاچی کا نکاح تجھ سے ہوا تھا۔'' صفدر حسین نے کہا تو فیض الحسن کی نگاہوں کے سامنے وہ پرانا مکان گھوم گیا۔

''میں نے گزشتہ پندرہ دنوں سے اس پر راج مزدور اور رنگ ساز لگا دیئے ہیں، کرایہ دار کو بھجوا دیا ہے، اب وہ مکان مکمل طور پر تیار ہے، بس فرنیچر وغیرہ آج پہنچ جائے گا اور پھر کل......'' وہ فیض الحسن کو چھیڑ کر اس کا موڈ درست کرنے لگا۔

''کل تو...... سجنوں سے ملاقات ہو گی......''

''بدمعاشوں والی زبان استعمال کرتے ہوئے شرم کیا کرو۔'' فیض الحسن شرماتے ہوئے بولا تو وہ دونوں مسکرا دیے۔

☆=====☆=====☆

ماہ نور بوا نے حوریہ کے کہنے پر زمان کو یکم جنوری اور پھر رات کو جنید اور فیض الحسن کے جھگڑے کی تمام تفاصیل بتا دی تھیں۔ اس نے عنایت علی اور عبدالرحمٰن کے فوٹو اپنے والٹ میں محفوظ کر لیے تھے، اب اسے فون کال کا انتظار تھا۔

ماہ نور حوریہ کے ساتھ بک سپاٹ پر پہنچی تو عدنان نے انہیں ایک پرچی تھما دی اور کہا کہ ایک بندہ آپ کے نام پر چھوڑ گیا ہے۔ ماہ نور نے وہ پرچی پڑھی تو اس پر لکھا ہوا پتا پڑھ کر وہ چکرا کر رہ گئی۔ ایڈریس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ ''اس مکان میں چلی آئیں، آپ کو فیض الحسن کی نشانی سے ملوا دوں گا۔''

وہ حوریہ کو فون کال کے متعلق بتا چکی تھی۔ اس کا ذہن تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے، وہ حوریہ کو اپنے ساتھ لے آئی مگر اس مکان کا پتا پڑھ کر وہ حیران رہ گئی کیوں کہ اس کے علاوہ تین چار لوگوں کو ہی اس مکان کا معلوم تھا۔

حوریہ نے گاڑی اس گلی میں جا کر روکی تو ماہ نور کے قدم من من کے ہو گئے تھے کیوں کہ اس مکان کی پیشانی پر ''قصرِ ماہ نور'' کی نیم پلیٹ چمک رہی تھی۔ وہ بے نام اور انجان خدشوں کو دل میں جگہ دیئے گیٹ کی جانب بڑھی تو وہ کھلا ہوا تھا۔ حوریہ بھی اس کے ساتھ اندر

داخل ہو گئی۔ مکان سے تازہ رنگ و روغن کی بو آ رہی تھی مگر صحن میں رکھے ہوئے نیاز بو کے پودے اپنی خوشبو بھی بکھیر رہے تھے۔

ماہ نور کے قدم وہیں جم کر رہ گئے تھے۔ وہ اس گھر میں سہاگن بن کر آئی تھی مگر آج بائیس سال بعد وہ بیوہ کا لبادہ اوڑھے آنکھوں میں غم اور حسرت کی تصویر جمائے اس گھر کی دہلیز پار کر آئی تھی، اسے صحن میں آ کر اندازہ ہوا کہ ہر جگہ اسے فیض الحسن ہی نظر آ رہا تھا۔

حوریہ حیرانگی سے اس گھر کو اور بوا کو دیکھ رہی تھی۔

''بوا! ہم غلط جگہ تو نہیں آ گئے؟''

''نہیں...... حور...... یہی صحیح جگہ ہے، یہی وہ مکان جو میری داستان میں میرا سسرال ہے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا ہے چاچی!'' وہ یہ آواز سن کر دہل گئی، وہ واپس پلٹی تو صفدر حسین کو ایک نظر میں پہچان نہ سکی مگر حوریہ پہچان گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ صفدر بھائی مراد الحسن کے بڑے بھائی ہیں مگر ماہ نور کی آنکھوں میں صفدر حسین کو دیکھ کر حیرت تھی۔

''مجھے پہچانا نہیں چاچی مانو؟'' وہ لجاجت سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔

''صفدر حسین؟'' ماہ نور کے ہونٹوں سے نکلا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ چاچی مجھے اتنے برسوں بعد نہیں پہچانے گی مگر مجھے تمہاری ذات پر فخر اور بھروسا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ میرا بھروسا اور اعتماد ٹھیک نکلا۔''

اس نے آگے بڑھ کر حوریہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو اس نے سلام کیا۔ صفدر حسین نے صحن میں رکھی ہوئی کرسیوں پر انہیں بیٹھنے کا کہا اور خود اندر چلا گیا۔ ماہ نور اس گھر کے در و دیوار دیکھنے لگی۔ اسے ایک ایک بات اور ایک ایک چیز تڑپا رہی تھی۔ ہر ایک اینٹ سے فیض الحسن اور اس کی یادوں کا چھتہ لٹک رہا تھا۔ وہ ان خوف ناک یادوں سے پیچھا نہ چھڑا سکی تھی۔

پتا نہیں، صفدر حسین نے اسے یہاں کیوں بلایا تھا؟ اتنے سالوں بعد اس نے صفدر حسین کو دیکھا تو اس گھر میں فیض الحسن کی دھما چوکڑی بھی یاد آ گئی۔ خاموشی اور چپکے سے دو آنسو نکل کر اس کی جھولی میں گر گئے۔ حوریہ بھی جذباتی ہو رہی تھی مگر اندر سے صفدر حسین برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں ٹھنڈی مشروب کی بوتلیں تھیں۔ اس نے ٹیبل پر گلاس وغیرہ رکھ کر اس میں مشروب انڈیل دیا اور ان کی طرف ایک ایک گلاس بڑھا دیا۔

''صفدر حسین! تم نے شادی کر لی؟'' ماہ نور نے گلاس پکڑتے ہوئے کہا تو صفدر حسین

مسکرانے لگا۔

''تمہیں تو پتا ہی ہے چاچی! کہ میری شادی چاچے کے ساتھ ہو چکی تھی۔'' مانو کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے، وہ مغموم دکھائی دے رہی تھی۔

''چاچی! ان قبروں میں کوئی اور دفن ہے۔'' یہ دھماکہ تھا جو ماہ نور اپنے دل پر سہہ گئی مگر اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، وہ پھر بولا۔

''ہاں چاچی! وہ دونوں زندہ ہیں۔'' حوریہ کے ہاتھ میں گلاس لڑکھڑا گیا۔

''صفدر حسین! اس عمر میں...... میں اتنا سنگین اور گھناؤنا مذاق سہہ نہیں سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اور تمہارا چاچا آپس میں بہت مذاق کرتے تھے مگر میں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ تم مجھے فیض الحسن کا نام لے کر مذاق کرو...... مجھے مزید دکھی نہ کرو، صفدر حسین پلیز۔'' ماہ نور کی آنکھیں دوبارہ بھیگ گئی تھیں۔

''میں پڑھا لکھا تو نہیں ہوں اور ماں کے پیار کے بغیر اتنا بڑا ہو گیا ہوں مگر میرے چاچے نے ماں باپ، بہن بھائی بن کر میری بہت اچھی تربیت کی ہے۔ میں نے زندگی میں بہت کم جھوٹ بولا ہے اور اب بھی سچ ہی کہہ رہا ہوں۔'' صفدر حسین بھی اپنی آنکھیں نم کر چکا تھا۔ حوریہ ان دونوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہی تھی۔

''خان پور سے واپسی پر جب آپ کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تو میں انجانے خدشوں اور دل کی بے قراری کو قرار دینے کے لیے قصرِ ماہ نور گیا۔'' صفدر حسین نے وہاں سے لے کر قادر علی کی جھونپڑی میں جا کر ان دونوں کو لینے اور بعد کے تمام حالات لفظ بہ لفظ بتانے شروع کیے تو ماہ نور کی دھڑکنیں تیز ہونا شروع ہو گئیں۔

''میں ان قاتلوں کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں چاچی، مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اندر کی جانب اشارہ کر دیا تو فیض الحسن اور مراد الحسن مسکراتے ہوئے باہر نکلے تو حوریہ اور ماہ نور کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

فیض الحسن کو زندہ دیکھ کر ماہ نور کی آنکھوں سے برسات جاری ہو گئی۔ فیض الحسن نے اپنے دونوں بازو وا کیے تو ماہ نور بھاگ کر ان میں گم ہو گئی۔ فیض الحسن کی بے قراری کو بھی قرار مل گیا تھا۔ ماہ نور کے آنسو فیض الحسن کی قمیص کو تر کر رہے تھے۔ اس کے پاس الفاظ نہ تھے وہ کچھ نہ بول سکی مگر فیض الحسن نے اسے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''مانو...... اب میں زندہ ہوں۔ اب یہ آنسو نہیں بہنے چاہئیں۔ تم تو مانو بلی ہو، میری

مانو بلی!'' فیض الحسن نے یہ الفاظ ادا کیے تو حوریہ کو وہ واقعہ یاد آ گیا جب فیض الحسن نے اس سے کتابیں چھینیں تھیں تو اس نے کہا تھا۔ ''تم زندہ ہو میری مانو...... مانو بلی۔'' مگر حوریہ اس وقت کچھ نہ سمجھ سکی تھی بلکہ بعد میں بھی یہ نہ جان سکی تھی کہ وہ جس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ وہ اس کا فرسٹ کزن ہے، جاذب مراد الحسن۔

''مانو!...... اپنے مراد سے تو ملو...... دیکھو کتنا جوان ہو گیا ہے۔'' فیض الحسن نے کہا تو وہ بیٹے کی طرف پلٹیں، پھر ماں کی ممتا کو قرار ملنا شروع ہو گیا تھا۔

''میرے دل کی صدا غلط نہیں ہو سکتی تھی۔'' وہ روتی ہوئی بولی۔ ''مگر میں ان قبروں کی حقیقت کو بھی نہیں جھٹلا سکتی تھی کیوں کہ ان قبروں پر صفدر حسین کو روتا ہوا دیکھ چکی تھی اور پھر اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ان لاشوں کو دفن کیا تھا...... مگر مراد الحسن...... تمہیں دیکھ کر دل میں ایک خنجر سا چبھ جاتا تھا بیٹا......'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''میں چاہتی تھی کہ تمہیں ہر وقت دیکھتی رہوں لیکن یہ میرے لیے ممکن نہ تھا...... میں تمہیں دیکھنے شاپ پر بھی نہیں آ سکتی تھی، لوگ کیا کہیں گے؟ اس عمر میں...... بڑھیا ویڈیو شاپ پر گھوم رہی ہے۔''

''بس! ماں جی! بس...... اب آپ کو کوئی دکھ اور غم چھو بھی نہ سکے گا...... دیکھو ہماری فیملی مکمل ہے۔ بابا...... صفدر بھائی آپ...... میں...... اور...... وہ حوریہ کی طرف دیکھنے لگا تو ماہ نور نے مراد الحسن کو چھوڑ کر حوریہ کو گلے لگا لیا۔

''اور...... میری بہو...... حوریہ......'' حوریہ بھی شرما کر بوا کے گلے لگ گئی۔

''دیکھو! صفدر حسین تم کہتے تھے نا کہ اگر میرے گھر بیٹی پیدا ہوئی تو میں اس کا نام حور رکھوں گا...... آج اللہ نے مجھے حور کی شکل میں بیٹی دے دی ہے۔'' ماہ نور کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

''اوئے ڈنگر! کوئی روٹی پانی بھی ملے گا...... یا بس یونہی؟'' فیض الحسن کی اس بات پر وہ قربان ہو گئی تھی۔ وہ اسے ہاتھ لگا لگا کر اس کی زندگی کا یقین کر رہی تھی۔

''اب تو کوئی ڈر نہیں ہے۔'' فیض الحسن مانو کو چھیڑنے لگا تو اس نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''اب مجھے خواب میں بھی چھوڑ کر مت جانا فیض الحسن، اس بار...... میں آپ کے بغیر نہ رہ سکوں گی......''

"بس مانو! اب تمہاری آنکھوں سے کوئی آنسو نہیں بہنا چاہیے، بہت رو چکی ہو تم۔" فیض الحسن نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں صاف کیں تو وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر خود پر قابو نہ رکھ سکی، دلِ بے قرار نے اپنی بے چینی اور بے تابی آنکھوں کے راستے ظاہر کرنا شروع کر دی تھی۔

"چاچی! میں نے تم سے فون پر وعدہ کیا تھا کہ فیض الحسن کی نشانی میرے پاس ہے...... دیکھ چاچی...... مراد الحسن ایک جیتا جاگتا ثبوت اس معاشرے کا باشعور شہری...... اس نشانی کی حفاظت اب تم دونوں کی ذمہ داری ہے......" وہ صفدر حسین کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

"صفدر حسین...... تم کتنے عظیم ہو...... الفاظ اس عظمت تک نہیں پہنچ سکتے، لیکن میں تمہیں ایک نام ضرور دوں گی...... "مسیحا" تم ہمارے مسیحا ہو صفدر حسین اور مسیحا کی پوجا کی جاتی ہے۔

عزت، محبت اور احترام و تکریم سے دل میں بٹھایا جاتا ہے...... تا حیات تمہاری اس مسیحائی کا قرض بھی اتارتی رہوں تو نہیں اتار سکتی...... تمہارے احسانات کا بدلہ چکا کر میں تمہاری توہین نہیں کرنا چاہتی...... مگر...... تمہیں اور تمہاری عظمت کو سلام کرنے کے لیے...... خداوند کریم سے دعا گو رہوں گی کہ ہر ماں کو تم جیسا مسیحا...... بیٹے کی صورت میں عطا کرے!" مانو نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو دُکھ کے آنسو صفدر حسین کی آنکھوں سے چھلکنے لگے۔

"چاچی! ...... ماں کی ممتا کا لمس کیسا ہوتا ہے؟" وہ روتے ہوئے بولا تو ماہ نور نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"بالکل ویسا...... جیسا کہ تم اپنی پیشانی پر محسوس کر رہے ہو...... ان بائیس سالوں کی طویل مدت نے مجھے میرے کھوئے ہوئے رشتوں کے ساتھ ساتھ تمہاری صورت میں "مسیحا" کا انعام بھی بخشا ہے۔"

"ہاں تو کزن...... اب کیا پروگرام ہے؟" مراد الحسن حوریہ کو چھیڑ رہا تھا تو حوریہ چھوئی موئی ہو کر رہ گئی۔

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔" مراد الحسن چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں...... بی بی...... کیا خامی ہے مجھ میں؟"

"تم میرے کزن ہو......" وہ شرارتی انداز میں بولی۔

"تو......؟" وہ حیران تھا۔

"میں شاعر مراد الحسن کو پسند کرتی ہوں۔" وہ مسکراتی ہوئی بولی تو اس کی جان میں جان آئی۔

"تو پھر ابھی مشاعرہ شروع کر دیتے ہیں......" اس نے کہا۔

حمود علی کو بھی وہیں بلوا لیا گیا۔ ماہ نور کو بیٹوں کی صورت میں اللہ نے انعامات سے نوازا تھا۔

حمود علی بہت خوش تھا۔ پہلے باپ اور بھائیوں کا پیار ملا تھا۔ اب ماں کی ممتا بھی اس کی خوش نصیبی بن گئی تھی۔

"بھابی!" وہ حوریہ کے کان میں کچھ کہنے لگا تو وہ شرم سے سرخ ہو گئی تھی۔ "آپ کی فیملی میں اب کوئی اور حوریہ نہیں ہے۔" اس کی آواز سبھی نے سن لی تھی، قہقہہ بلند ہونے پر وہ کھسیانا ہو کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

خان پور کے راستے میں اس وقت مراد الحسن، فیض الحسن، ماہ نور، حوریہ اور صفدر حسین اس ہوٹل پر موجود تھے جس پر گزشتہ بائیس سال پہلے بھی خان پور جاتے ہوئے وہ رکے تھے۔ اب اس ٹینٹوں والے ہوٹل کی جگہ پکی اور پُرشکوہ عمارت بن گئی تھی۔

ایس پی زمان بھی پہنچنے والا تھا۔ وہ ابھی فیض الحسن اور مراد الحسن سے اپنے رشتہ داروں کے روپ میں نہ ملا تھا اور حوریہ اور ماہ نور نے بھی گھر میں کسی سے تذکرہ نہ کیا تھا کہ "وہ" زندہ ہیں۔ صفدر حسین نے پہلے پہنچ کر ارد گرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں پر ہوٹل کی انتہائی نکڑ پر ایک موٹر مکینک کی اچھی دکان بنی ہوئی تھی۔ وہ گاڑیوں کی وھیل بیلنسنگ اور پنکچر وغیرہ کا بھی کام کرتا تھا۔

صفدر حسین اس وقت اسی مکینک کے پاس بیٹھا ہوا اس کا انٹرویو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں بھئی! کب سے اس دھندے میں ہو؟"

"بس صاحب! دس پندرہ سال ہو گئے ہیں۔" وہ لڑکا نوجوان تھا۔

"دکان تو اچھی بنائی ہے تم نے۔"

"ہم تو ملازم ہیں جی...... یہ تو استادوں کی دکان ہے، ہم تو کاریگر ہیں۔" وہ ایک ٹائر کو پنکچر لگا رہا تھا۔

''اور تمہارے استاد نہیں آتے دکان پر؟'' صفدر حسین اس کو آہستہ آہستہ اپنے مطلب کی بات پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آتے کیا......؟ وہ دیکھیں اندر چارپائی پر بڑا استاد سویا ہوا ہے...... چھوٹا استاد...... جو کہ ان کا بیٹا ہے...... بس ان کو لینے آتا ہے اور کبھی کبھی کام چیک کرنے بھی آ جاتا ہے۔'' اس نے دکان کے اندر پڑی ہوئی چارپائی پر سوئے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کس چیز کا استاد ہے، جو سویا ہوا ہے۔''

''استاد کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے...... بس اب یہ اسی جگہ پر کبھی آ کر سو جاتا ہے اور کبھی رونے لگتا ہے اور کبھی کبھار تو ہوٹل میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے چہروں کو غور سے دیکھنے لگتا ہے...... جیسے کہ کسی کو پہچان رہا ہو۔'' اس نے پنکچر لگا کر اس ٹائر میں ہوا بھری اور دوسرے ٹائر کو دیکھنے لگا۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ سویا ہوا استاد جاگ گیا...... وہ ننگے پاؤں باہر نکلا تو صفدر حسین نے دیکھا کہ وہ تقریباً پچاس سالہ مضبوط بدن کا مالک تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو بھی اس کی دماغی حالت کی عکاسی کر رہی تھی۔

وہ کمرے سے باہر نکل کر ایک جانب چل دیا۔

''اب یہ کہاں جائے گا؟'' صفدر حسین بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''اب یہ مسافروں کی شکلیں دیکھے گا۔'' مستری نے بے دلی سے جواب دیا تو وہ چل پڑا۔ وہ پاگل استاد واقعی مسافروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی مسافروں نے اسے بھیک میں پیسے بھی دیے مگر وہ پیسوں کو پھینک کر آگے بڑھ جاتا۔

وہ سبھی فیملی ممبران ایک ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ صفدر حسین اور وہ تمام لوگ بھی اس استاد کی حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ گھومتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور ان کی شکلیں بھی غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا، حوریہ تو باقاعدہ ڈر گئی تھی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ استاد ان کی جانب واپس پلٹا اور فیض الحسن اور ماہ نور کے چہروں کو غور سے دیکھنے لگا...... اس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ایک نعرہ لگاتے ہوئے بولا۔

''آہا!...... آج مل ہی گئے ہو صاحب!...... بہت انتظار کروایا آپ نے۔'' صفدر حسین س کی آواز سن کر ان کے قریب آ گیا، اس کا تکا درست ہونے والا تھا۔

''کون ہو تم......؟ میں نے تمہیں پہچانا نہیں؟'' فیض الحسن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تو وہ شخص

حیران کن طور پر اس کے پاؤں میں گر گیا۔ ہوٹل کی انتظامیہ اس کے پاگل پن اور ڈراموں سے تنگ آ چکی تھی، اب بھی تین چار ویٹرز اس کی طرف بڑھ رہے تھے کہ گاہکوں مسافروں کو کوئی پریشانی نہ ہو مگر صفدر حسین نے ان کے ارادے بھانپتے ہوئے انہیں روک دیا۔

''مجھے معاف کر دو صاحب! مجھے معاف کر دو! میں اب اور سزا نہیں سہہ سکتا...... مجھے معاف کر دو!'' فیض الحسن اپنے پاؤں پیچھے کرتا تو وہ گھٹنوں کے بل چل کر پھر اس کے پاؤں پکڑ لیتا۔ وہ سبھی بھی حیران ہو رہے تھے کہ یہ کون ہے؟ جو فیض الحسن سے معافی مانگ رہا ہے۔

اتنی دیر میں ایس پی زمان بھی اپنی ذاتی گاڑی اور سول ڈریس میں اس ہوٹل کی حدود میں داخل ہوا تو ماہ نور اور حوریہ نے اپنی گاڑی پہچان لی، وہ اتر کر ان کے پاس آ گیا۔ اس کی توجہ بھی اس ڈرامہ پر مرکوز ہو گئی تھی جو ابھی تک ہوٹل کے وسیع لان میں چل رہا تھا۔

''تم کون ہو؟ اور مجھ سے معافی کیوں مانگ رہے ہو؟'' فیض الحسن نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تربتر ہو رہا تھا۔

''مجھے حیرت اور خوشی ہے کہ آپ زندہ ہیں۔'' وہ فیض الحسن کے چہرے پر اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''آپ مجھے بھلے نہ جانتے ہوں مگر میں آپ کو پہچان گیا ہوں صاحب...... میں نے ضمیر کی عدالت میں بہت سزا کاٹی ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا اور صفدر حسین اپنی واک مین میں ریکارڈ کر رہا تھا۔

''مدتوں جلا ہوں اس آگ میں...... چند روپوں کی خاطر...... میں نے وہ جرم کیا تھا کہ انسانیت بھی شرمندہ ہو گی...... میں نے آپ کے ساتھ آنے والے ایک بڑے صاحب کے کہنے پر آپ کی گاڑی کے بریک فیل کر دیے تھے۔'' اس نے دھماکہ کیا تو زمان بھی آگے بڑھ کر کبھی اس کو اور کبھی فیض الحسن کی طرف دیکھتا، اس کا منہ کھل کر رہ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر ماہ نور بوا اور حوریہ کی طرف دیکھا تو مراد الحسن بھی اس کی نظروں میں آ گیا۔ جس نے ماہ نور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ پھر صفدر حسین آگے بڑھا اور استاد سے بولا۔

''تم اس آدمی کو پہچان سکتے ہو، جس نے تمہیں بریک فیل کرنے کے لیے روپے دیے تھے؟''

''ہاں...... ہاں اگر وہ آدمی اپنی خباثت بھری صورت لے کر میرے سامنے آئے تو میں اس کا چہرہ نوچ لوں گا۔'' اس کی آواز میں غصہ اور نفرت بھی شامل تھی۔ تب صفدر حسین ایس پی زمان کی طرف متوجہ ہوا۔

"آگے بڑھیے ایس پی زمان صاحب اور وہ دو تصویریں ایک ایک کر کے اس آدمی کو دکھایئے جو آپ کے پرس میں ہیں۔"

"تم؟" زمان صفدر حسین سے کوئی سوال کرنا چاہتا تھا مگر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہم بعد میں ملیں گے۔"

زمان نے پہلے ملک عبدالرحمٰن کی تصویر اس کے سامنے کی تو وہ غور سے دیکھنے لگا۔ سبھی کی سانسیں اٹکی ہوئی تھیں۔

"صاحب! یہی وہ آدمی ہے، یہی ہے...... وہ...... یہی ہے۔" وہ چلاتے ہوئے تصویر پر تھوک بھی رہا تھا۔ حوریہ کی حالت غیر ہونے لگی تو مرادالحسن نے اسے سنبھال لیا۔ اب دوسری تصویر دکھانے کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی زمان نے عنایت علی کی تصویر اسے دکھائی تو وہ غور سے دیکھ کر بولا۔

"نہیں...... نہیں...... یہ آدمی تو اس وقت نماز پڑھ رہا تھا...... مجھے مت الجھاؤ...... یہ وہ نہیں تھا۔ وہی ہے...... پہلی تصویر والا آدمی...... اس نے مجھے پیسے دے کر نیلے رنگ کی ڈاٹسن گاڑی کے بریک فیل کرنے کو کہا تھا...... مجھے معاف کر دو صاحب...... تاکہ میں سکون سے مر سکوں......" وہ پھر فیض الحسن کی منت کرنے لگا تھا۔

"ہمارے ساتھ چل کر اس آدمی کے سامنے بیان دے سکتے ہو؟" زمان نے پوچھا تو وہ غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں!...... میں اپنے ضمیر کی عدالت سے سرخرو ہو کر مرنا چاہتا ہوں...... لے چلو...... مجھے کہیں بھی لے چلو! میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔" وہ راضی ہو گیا تھا، اسے کرسی پر بٹھا کر ٹھنڈا پانی پلایا گیا، اس کی حالت کچھ سنبھلی تھی۔

فیض الحسن اور مرادالحسن کا تعارف زمان سے کرایا گیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ بہت خوش ہوا، اس کی سوگوار بوا کو سکون اور راحت کی زندگی مل گئی تھی۔ وہ قدرت کی فیاضی پر حیران بھی تھا اور رب کریم کے معجزہ کا قائل بھی تھا۔

صفدر حسین بھی چونکہ اس داستان کا ایک کردار تھا۔ زمان اور صفدر حسین اس کیس پر تفصیلی کام کر چکے تھے۔ اس لیے صفدر حسین نے ایک تکے کی بنیاد پر زمان کو یہاں بلوایا تھا۔

"صفدر حسین! تم بتا سکتے ہو کہ تمہارے ذہن میں کیا تھا۔ تم ان سب لوگوں کو یہاں لے کر آئے اور پھر مجھے بھی تصاویر لانے کو کہا...... میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا ہے اور کچھ نہیں

بھی۔" مرادالحسن نے کھانے کا پُرتکلف آرڈر دے دیا تھا۔ وہ سبھی کھانا بھی کھا رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے مگر حوریہ غمگین اور پریشان تھی۔

"زمان صاحب! مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں کہ انسان ضمیر کی عدالت کا قیدی بن کر سزا بھگتنے کے لیے اپنے آپ کو رضامند کر لے...... مجھے جب بریک فیل ہونے کی بات چاچا فیض الحسن سے معلوم ہوئی تو میرے ذہن میں ایک بات فوراً ہی حلول کر گئی کہ بڑی سڑکوں کے ساتھ ہر ہوٹل پر گاڑیوں کو چیک کرنے اور پنکچر وغیرہ لگوانے کے لیے کوئی نہ کوئی دکان ضرور ہوتی ہے۔ یہاں تک گاڑی بالکل صحیح سلامت...... یہاں ٹھہرنے کے بعد گاڑی کے بریک فیل ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی نہ کسی مستری نے اسی جگہ پر کام دکھایا تھا اور پھر ان دونوں اور ماہ نور بوا کے بچ جانے پر فیض الحسن کا جان بوجھ کر جھگڑا کروایا گیا تاکہ وہ جنید کی شادی ادھوری چھوڑ کر وہاں سے چلے جائیں اور ان کے جانے سے پہلے ہی رات کو گاڑی کے پہیوں کے نٹ ڈھیلے کر دیے گئے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ حادثہ اپنے شہر کی حدود میں ہوا...... خان پور میں رات کو کیا ہوا یا پھر کس نے ٹائروں کے نٹ ڈھیلے کیے، یہ نامعلوم بات تھی مگر مجھے یقین تھا کہ اس جگہ سے کوئی نہ کوئی سراغ مل سکتا ہے اور تم دیکھو...... اللہ نے مہربانی کی۔ ہمیں محنت نہیں کرنا پڑی...... اور مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر یہ ضمیر کا قیدی آپ کے سامنے ہے۔"

صفدر حسین کی زبانی تمام تفصیل سن کر زمان بولا۔

"آپ کو تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا! بہت دور کی کوڑی لائے اور کیس حل کر دیا۔"

"اللہ مجھے عزت کی روٹی دے رہا ہے، اس لیے مجھے کسی بھی محکمے کی ضرورت نہیں ہے اور ابھی کیس حل نہیں ہوا۔ اصل مجرم کی نشان دہی ہوئی ہے، ابھی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔"

حوریہ تو یہ سن کر لرز گئی مگر زمان مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرے ذہن میں ایک سکیم آئی ہے...... اگر اس پر آپ لوگ میرا ساتھ دیں تو عمل درآمد ہو جائے گا اور مجرم بھی گرفتار ہو جائے گا۔" سبھی لوگ اس کی بات غور سے سن رہے تھے اور تائیدی انداز میں سر ہلا رہے تھے۔

وہ لوگ اس استاد کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں ایس پی زمان نے ہوٹل مالک کو اپنی شناخت کروا دی تھی اور دو دن بعد اسے چھوڑ کر جانے کا کہہ گئے تھے۔

☆=====☆=====☆

اس بار آنے والی خون کی الٹی نے اسے بے حال کر دیا تھا مگر وہ اپنے مضبوط اعصاب کی

بدولت آئینے کے سامنے واش بیسن پر کھڑا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کا ساتھی رفیق اس کے کندھے دبا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر کمرے کی طرف لانا چاہتا تھا مگر وہ خود ہی چل پڑا۔ ''ابھی میرے بدن میں جان ہے، تم فکر نہ کرو...... رفیق...... میرا کام ادھورا ہے، جب مکمل ہوگا میں تب ہی مروں گا۔'' اس کا سانس پھول گیا تھا۔

''آپ چاچے فیض الحسن کو بتا کیوں نہیں دیتے؟'' رفیق بھی روہانسا ہو گیا تو وہ جاندار مسکراہٹ سے بولا۔

''رفیق بادشاہ! یہ دنیا چلو...... چلی کا میلہ ہے جس کی جتنی کہانی ہوتی ہے وہ سناتا ہے اور چلا جاتا ہے تم فکر نہ کرو...... ہم جانے سے پہلے ایک کام ضرور کریں گے۔'' وہ اٹھا اور میک اپ کرنے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل پر بکھری اشیاء سے چن چن کر اپنی آنکھوں کے نیچے حلقوں پر ملنے لگا، مختلف کریمیں لگانے سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں میں نمایاں کمی آ گئی تھی۔

''جب تک میرا کردار تقدیر کی کتاب میں لکھا گیا ہے۔ تب تک مسیحائی کرتا رہوں گا۔'' وہ بولا تو کرب اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا تھا۔

''وہ...... دو عورتیں بھی آئی تھیں۔''

''پھر؟''

''میں نے آپ کی بات کرانا چاہی...... مگر موبائل ہی بند تھا۔'' رفیق جھجکتا ہوا بولا۔

''میں تمہیں کہہ کر تو گیا تھا...... ان کے پیسے علیحدہ ہی پڑے ہوئے تھے، انہیں دے دیتے۔ وہ بے چاری پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''وہ ابھی آنے والی ہیں، آپ خود ہی دے دیجیے گا۔'' رفیق اندر چلا گیا، تو دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے رفیق کو آواز دی تو رفیق نے دروازہ کھولا تو ایک بزرگ آدمی ان کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔

''استاد! چاچا ایوب سیٹھی آیا ہے۔''

''اچھا!...... میں خود ہی مل لیتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر باہر کی طرف گیا تو رفیق بھی اس کے پیچھے آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی تھی جو اس نے استاد کو پکڑا دی۔ چاچا ایوب سیٹھی آنکھوں میں آنسو بسائے ہوئے دروازے سے اندر آ گیا تو اس نے لاکھ روپے کے نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیے، وہ آنسوؤں کی زبان میں اس کا اظہار تشکر کر رہا تھا۔

''اللہ تمہاری عمر دراز کرے...... صفدر حسین!'' چاچے ایوب سیٹھی کی بات سن کر وہ ہنسنے

لگا۔

''بس چاچا! اب میری بخشش کی دعا کرو۔'' اس کا انداز عجیب تھا۔ اپنی بیٹی کی شادی کے لئے اور کچھ چاہیے تو رفیق کو بتا دینا۔''

''تم آؤ گے بیٹا؟''

''ہاں! چاچا کیوں نہیں۔ میں پہلے بھی تو آتا ہی رہا ہوں، یاد نہیں جب تم نے اپنی پہلی دو بیٹیوں کی شادی کی تھی۔''

''بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' یہ کہہ کر چاچا روپوں کو اپنے میلے صافے میں لپیٹ کر باہر نکل گیا۔

''رفیق!...... اگر وہ دونوں عورتیں آئیں تو انہیں پیسے دے دینا، میں کچھ دیر آرام کر لوں۔'' یہ کہہ کر صفدر حسین اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

یہ جگہ بھی اسی شہر میں موجود تھی مگر مراد الحسن اور فیض الحسن اس سے بے خبر تھے۔ صفدر حسین نے اپنے گروپ کے تمام ساتھیوں کو چھٹی دے دی تھی۔ ان سب کو ضرورت کے مطابق روپیہ دے دیا گیا تھا مگر رفیق اس کا صحیح رفیق تھا، اس نے ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

صفدر حسین کی بیماری دن بدن گھمبیر ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر ماہ نور چاچی کہتی تھی کہ وہ مسیحا ہے۔ اب مسیحائی کے لیے آرام کو پسِ پشت ڈالنا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ بھی آرام طلب نہ تھا بلکہ فیض الحسن اور ماہ نور کو ملوانے کے لیے اس نے دن رات کام کیا تھا۔

اس کی محنت سے ایک بچھڑا ہوا خاندان مل گیا تھا مگر وہ ماہ نور اور اس کے خاوند اور بچے کو قتل کرنے والے سگے بھائی سے ضرور ملنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار مل کر اس کی گھناؤنی اور بدنما صورت سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا مگر اس نے ایس پی زمان کو منصوبے کے تحت اپنے کام میں شامل کر کے اسی گھر کے چراغ سے آگ لگانے کا پروگرام بنایا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب وہ صرف یہی منظر دیکھنے کے لیے قصرِ ماہ نور جانا چاہتا تھا۔ جب عبدالرحمٰن کے ہاتھوں میں اس کا ہی بھتیجا ہتھکڑیاں لگائے گا۔ پھر اس پُرغرور انسان کی گردن جھکی ہو گی تو صفدر حسین کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

قصرِ ماہ نور میں لائٹنگ اور سجاوٹ کا انتظام دیکھ کر ملک عبدالرحمٰن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"کہاں رہ گئے تھے خود......؟" ماں جی نے حیران و پریشان عبدالرحمٰن کو دیکھا تو وہ مزید حیران ہو گئے۔

"کیا مطلب؟ کہاں رہ گیا تھا...... آپ سبھی کو معلوم تو ہے کہ میں زمینوں کے سلسلہ میں گیا ہوا تھا اور آج واپس آنے والا تھا...... مگر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"بوڑھے ہو گئے ہو عبدالرحمٰن...... اب یادداشت بھی کمزور ہوتی جا رہی ہے......"

"ماں جی...... میرا دماغ خراب مت کریں...... مجھے صاف صاف بتایا جائے...... یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس سلسلے میں اس محل کو سجایا جا رہا ہے؟" وہ حیران تو تھے ہی مگر اب پریشان بھی ہو رہے تھے۔

"لو کر لو بات! اب خود ہی بھول رہا ہے۔ جاؤ جا کر فریش ہو جاؤ...... وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔" ماں جی یہ کہہ کر ان کی بات سنے بغیر ہی آگے بڑھ گئیں۔ عبدالرحمٰن پیچ و تاب کھاتے ہوئے اندر کی طرف چلے گئے۔

اندر وسیع ڈرائنگ روم میں بھی تیاریاں عروج پر تھیں اور سب سے خاص بات ایس پی زمان خود بھی کام میں مصروف تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رک گئے اور اپنی رعب دار اور کڑک آواز میں بولے تو ان کی آواز سن کر تمام ملازمین کے ہاتھ رک گئے۔

"زمان ملک!" زمان ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"جی تایا ابو؟" وہ فرمانبرداری سے بولا تو ملک عبدالرحمٰن کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا مطلب کہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ پہلی مرتبہ اس لہجے میں ملک عبدالرحمٰن سے بات کر رہا تھا۔ اس کے لہجے پر وہ ششدر رہ گئے۔

"آپ کو نہیں پتا کہ آج حوریہ کی منگنی ہے اور لڑکے والے آ رہے ہیں؟" زمان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ سرتاپا لرز کر رہ گئے اور آگ بگولا ہوتے ہوئے بولے۔

"تم سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے...... اور سمجھتے ہو کہ میں بھی پاگل ہوں؟"

"ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیے تایا ابو! وہ بڑے اچھے لوگ ہیں، لڑکا کسی کوٹھی میں ڈرائیوری کرتا ہے، نیک ہے، خوبصورت ہے......"

"شٹ اپ! زمان...... شٹ اپ! اپنی بکواس بند کرو، اب اگر ایک لفظ بھی بولا تو میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔" غصے کی شدت سے ان کی رگیں تن گئی تھیں وہ آپے سے باہر ہوتے ہوئے

بولے۔

"تم کیا سمجھتے ہو؟ ملک عبدالرحمٰن کی بیٹی کے لیے کوئی معمولی ڈرائیور......" وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکے کیوں کہ سامنے سے حوریہ آ رہی تھی۔ پھر گھر کے ایک کونے سے عنایت علی اور ممتاز بھابی بھی نکل آئے۔

"کیا ہو رہا ہے بابا؟" اوپر سے حنان بھی سیڑھیاں اترتا ہوا آ رہا تھا۔

"یہ سب کیا ڈرامہ ہو رہا ہے، حنان؟ کیا تم بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہو......؟" وہ مشکوک انداز میں بولے تو حنان حیرانگی سے گویا ہوا۔

"کیسا ڈرامہ بابا؟ یہ سب تو آپ کی ہدایت پر ہی ہو رہا ہے۔ آپ نے زمان کو فون پر بتایا تھا کہ کچھ لوگ حور کو دیکھنے کے بعد وہیں پر منگنی کی رسم بھی ادا کر دیں گے اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ آپ جو کہتے ہیں، وہی کرتے ہیں، اس لیے ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل میں......"

"بکواس بند کرو! مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ پاگل، اُلو، بیوقوف یا پھر گدھا؟"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔" اس بار ان کی بیوی سلمٰی بولی تھی۔

"تایا ابو! ایک چھوٹا سا جھوٹ برداشت نہیں ہو رہا آپ سے اور میں حیران ہوں کہ آپ نے اتنے بڑے سچ سے آنکھیں کیسے چرا لیں۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو زمان!" حنان غصے سے بولا تو گھر والوں کی نظریں زمان کی طرف اٹھ گئیں کیوں کہ اس نے ہی سب سے کہا تھا کہ عبدالرحمٰن کا فون آیا ہے اور کچھ لوگ حوریہ کی منگنی کے لیے آ رہے ہیں۔ اتنی دیر میں ماہ نور بوا بھی آ گئیں مگر ان کے لباس کو دیکھ کر حوریہ اور زمان کے علاوہ سبھی لوگ حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ان کی مانگ ختم ہو کر سر پر بالوں کا خوبصورت جُوڑا آ گیا تھا۔ ان کے لبوں پر لپ اسٹک اور چہرے پر میک اپ بتا رہا تھا کہ ان کی ہتھیلیاں بھی اب سُونی نہیں ہیں، ان پر بھی مہندی کے خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ان کی سُونی کلائیوں میں چھن چھن کرتی چوڑیوں کا سیٹ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اب وہ بھی زندگی کی باقی بہاریں سہاگن کی طرح گزارنا چاہتی ہیں۔ ان کے نئے سوٹ پر خوبصورت کڑھائی واقعی دیدہ زیب اور آنکھوں کو بھا جانے والی تھی۔

مدتوں سے سوگواری اور حسرتوں کی تصویر بنی ماہ نور اپنی کالج لائف والی مانو بن کر ان

کے سامنے کھڑی تھی ان کی حیرت میں اضافہ کرنے کے لیے اس کے ہونٹ کلیوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

وہ تمام لوگ ماہ نور کو دیکھ کر حیرت میں گم تھے۔ اس کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ تھی جب کہ حوریہ کچھ بے چین لگ رہی تھی۔ اب سچویشن یہ تھی کہ گھر کے تمام افراد اس خوبصورت اور وسیع ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ ایس پی زمان کی آواز پر سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے، وہ براہِ راست حنان سے مخاطب تھا۔

''تم..... حوریہ کی شادی کر دو..... اور پھر اسے اس کے خاوند اور اس کے دو سالہ بچے کو قتل کروا دو، یہ دنیا تمہیں کیا کہے گی؟'' یہ سن کر سبھی سکتے میں آ گئے، رحمٰن ملک کا منہ کھلا رہ گیا۔

''زمان..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' حنان بھی حیران تھا۔

''تم نے ابھی مجھ سے کہا تھا کہ زبان سنبھال کر بات کرو کیوں کہ میں نے تایا ابو کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے تھے..... اور تایا ابو نے کہا کہ تم سب لوگ مجھے پاگل سمجھ رہے ہو! تو غور سے سنو۔ مسٹر حنان..... کہ اس ظالم شخص نے کیا کیا ہے؟'' ملک عبدالرحمٰن یہ سن کر زمان کو گھور کر رہ گئے مگر حنان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا اس لیے اس کا رویہ تلخ ہو گیا۔

''زمان! اگر اب کوئی غلط الفاظ تم نے بابا کے بارے میں ادا کیے تو میرا ہاتھ اٹھ جائے گا، جو بھی کہنا ہے جلدی کہو۔''

''میں خود بھی ان کی اپنے بابا سے بڑھ کر عزت کرتا ہوں مگر اس وقت معاملہ اتنا سنگین ہے کہ تم منہ میں انگلیاں ڈال کر اس شخص سے ہر قسم کا رشتہ توڑ لینے پر مجبور ہو جاؤ گے۔'' اب وہ ملک عبدالرحمٰن کی طرف متوجہ ہوا اور آگے بڑھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''یکم جنوری 1978ء کو کاکے سائیں والے قبرستان میں آپ نے تین قبریں کس لیے کھدوائی تھیں مسٹر عبدالرحمٰن؟''

ملک عبدالرحمٰن کو پاؤں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ صوفے پر بیٹھ گئے مگر پھر بھی اپنا دفاع کرتے ہوئے بولے۔

''زمان! تم جو کچھ بھی کر رہے ہو..... اچھا نہیں کر رہے ہو..... میں نہیں جانتا کہ اس جھوٹ کو بولنے میں تمہارا کیا مقصد ہے..... مگر یاد رکھو! تم نے میری ذات پر جو کیچڑ اچھالنے کی کوشش ہے اس کے چھینٹے تمہاری وردی اور سب کی زندگی کو بھی داغدار کر سکتے ہیں۔''

''تایا ابو..... میں اس وقت ایک ایس پی بن کر نہیں..... بلکہ اس مدعیہ کی طرف سے

ایک وکیل بن کر آپ سے تفتیش نہیں بلکہ سوال کر رہا ہوں..... اور بطور وکیل میں اپنے سوالوں کے درست جواب چاہوں گا۔'' اس کا انداز طنزیہ تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میں تمہیں جائیداد سے بھی عاق کر دوں گا۔'' ان کا انداز دھمکی والا تھا۔

''یہ جائیداد..... آپ کے نام تھی کہاں؟ یہ تو سدا سے ماہ نور بوا کے نام پر ہے۔ آپ بھی اس میں اگر سر چھپا کر بیٹھے ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں، مجھے محکمے کی طرف سے ایک اچھی رہائش میسر ہے..... میرے سوال کا جواب دیں۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟'' وہ زمان کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر کے اسے اپنے اوپر حاوی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر زمان آج انہیں ننگا کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''مسٹر حنان! اور آپ سبھی لوگ ذرا غور سے سنیے۔ میں آپ کو چیدہ چیدہ باتیں بتا دیتا ہوں۔ ہر بات کا باقاعدہ ثبوت بھی پیش کروں گا..... اگر تایا ابو..... مانگیں گے تو؟''

''ماہ نور گاڑی تیز چلاتی تھیں، ان کے لیے ڈرائیور رکھا گیا۔ ان کو اس ڈرائیور سے عشق ہو گیا۔ پاکیزہ اور قابلِ احترام عشق..... جو آج کے دور میں ناپید ہے۔ ان دونوں نے خاندانی رسم و روایات کو پسِ پشت ڈال کر شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو تایا ابو ان کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ ماہ نور بوا نے خودکشی کر کے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی مگر ان کی زندگی باقی تھی، وہ بچ گئیں، ان دونوں کا نکاح گھر والوں سے چوری ایک جگہ پر ہو گیا۔

ڈرائیور جو کہ اب رشتے کے اعتبار سے ہمارے انکل تھے۔ وہ ماہ نور بوا سے چوری چھپے ان کے کمرے میں ان سے ملنے جاتے تھے یا یوں کہہ لیں کہ آتے تھے۔ ماہ نور بوا جب ماں بننے والی تھیں تو تایا ابو نے ان پر ظلم و تشدد کر کے انہیں گھر سے نکال دیا، وہ انکل کے پاس چلی گئیں۔ خوش و خرم زندگی نے انہیں تمام تشدد بھولنے پر مجبور کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک پیارا سا بیٹا دیا..... پھر وہ ایک دن بابا (عنایت علی) سے سرِ بازار ملیں اور دادی ماں سے ملنے کی خواہش کی۔ گھر والے تایا ابو کی مخالفت کے باوجود بوا سے ملنے ان کے گھر گئے۔ تعلقات بڑھنے لگے۔ بوا بھی فیض انکل کے ساتھ اِدھر آئیں۔ رحمٰن صاحب نے دل سے بوا کو معاف نہ کیا بس رسمی طور پر صلح کر لی مگر دل میں خلش رہی.....

دو جنوری 1978ء کو خان پور انکل جنید کی شادی پر تمام لوگ تیار ہوئے تو تایا ابو کی طرف سے دی ہوئی گاڑی میں فیض انکل اور بوا اپنے بیٹے کے ساتھ خان پور روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک ہوٹل پر پڑاؤ کیا تو وہاں موجود مستری کو رقم دے کر تایا ابو نے اُن کی گاڑی

کے بریک فیل کروا دیے...... مگر قسمت نے ساتھ دیا، وہ بچ گئے...... پھر یکم جنوری 1978ء کی رات فیض انکل اور جنید انکل کا جھگڑا کروایا...... وہ لوگ صبح دو جنوری کو وہاں سے نکلے تو ان کی گاڑی کے نٹ جنید انکل کے ملازم سے ڈھیلے کروا دیے جب وہ لوگ اپنے شہر کی حدود میں پہنچے تو نٹ کھل گئے اور چلتی گاڑی کے اگلے ٹائر الگ ہو گئے......

ماہ نور بوا کھلے ہوئے دروازے سے سڑک پر گر گئیں اور گاڑی گہری کھائی میں جا گری۔ تایا ابو انکل اور ان کے بیٹے کی لاشیں ڈھونڈنے میں ناکام ہوئے تو الائیڈ ہسپتال سے دو عدد جلی ہوئی لاشیں پیسے دے کر خرید لائے اور انہیں انکل اور بیٹے کی میتیں ظاہر کر کے دفنا دیا گیا مگر درحقیقت وہ لوگ زندہ تھے۔ ماہ نور بوا کو ان کی تازہ قبریں دکھائی گئیں جو پلان کے مطابق یکم جنوری کو ہی کھدوائی گئی تھیں۔

آپ اس بات پر بھی حیران ہوں گے کہ پرانے ملازموں میں سے راجو اور ملکہ کو کیوں نکال دیا گیا کیوں کہ انہوں نے تایا ابو کے کہنے پر کھانے میں زہر ملا کر بوا کو کھلانے سے انکار کر دیا تھا۔"

زمان خاموش ہوا تو سبھی لوگوں کے چہرے حیرت و استعجاب کے عالم میں کھلے ہوئے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر عبدالرحمٰن یک دم مسکراتے ہوئے اٹھے اور تالی بجانے لگے۔

"بہت خوب! ایس پی زمان! تمہیں تو کتابوں اور کہانیوں کا مصنف ہونا چاہیے تھا، اتنی اچھی اور بے داغ سٹوری...... اگر کوئی فلمساز سن لے تو یقیناً اس پر فلمبندی کا رسک بھی لے گا۔ اب یہ بتاؤ...... کہ تمہیں میری عزت اور نام کو داغ دار کرنے کے لیے ماہ نور نے کتنے پیسوں میں یہ کہانی سنانے کو کہا ہے۔" زمان اور ماہ نور قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تو حنان آگے بڑھا اور بولا۔

"زمان! تم نے کہا تھا کہ تم ان باتوں کے ثبوت دو گے...... ابھی ثبوت پیش کرو...... ورنہ...... ورنہ میں اپنے بابا کی انسلٹ کرنے پر تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

"اپنے گرم خون کو سنبھال کر رکھو حنان! ہم کزن یا رشتہ دار ضرور ہیں مگر اچھے دوست بھی ہیں اور ایک ایس پی کا دوست ہونے کی حیثیت سے تم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ مجھے شوٹ کرنے کی دھمکیاں روز ملتی رہتی ہیں...... میں نے اس کیس سے جڑے ہوئے ہر اس شخص کو بلوایا ہے جو ان کو پہچاننے میں غلطی نہیں کریں گے۔ بولو! سب سے پہلے کس سے ملو گے؟"

حنان کی طرف سے گرین سگنل ملنے پر اس نے صفدر حسین کو آواز دی۔ وہ ساتھ والے کمرے سے نکل آیا تو ملک عبدالرحمٰن اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہو گئے۔

صفدر حسین ان کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اس کے چاچے اور مراد کو بائیس سال تک دنیا و مافیہا اور اپنوں کی محبت سے دور رکھا تھا۔

"انہیں پہچانتے ہیں آپ؟" زمان نے عبدالرحمٰن سے سوال کیا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ اس عظیم مسیحا کو نہیں پہچان سکتے۔ یہ صفدر حسین ہے، آپ کے پسندیدہ فنکار منظر علی کا بیٹا! یہ وہ مسیحا ہے جس نے دونوں باپ بیٹوں کو آپ کے ظلم اور موت سے بچانے کے لیے اپنی خوشیاں تیاگ کر ان کی دن رات حفاظت کی زندگی موت تو اللہ کے اختیار میں ہے مگر ان دونوں کی زندگیاں اس مسیحا کی مرہونِ منت ہیں۔ صفدر حسین! اب ایک ایک کر کے ان سب کو بلاتے جاؤ، جو ثبوت ہیں۔"

صفدر حسین نے سب سے پہلے اس مستری کو بلایا جس نے عبدالرحمٰن کے کہنے پر گاڑی کے بریک ناکارہ کیے تھے تو عبدالرحمٰن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ بائیس برس پہلے کا وہ منظر ان کے ذہن میں آ گیا جب انہوں نے اس شخص کو تھوڑے سے پیسے دے کر فیض الحسن کی گاڑی کے بریک خراب کرنے کو کہا تھا۔

"بتاؤ! استاد! تمہیں کس شخص نے روپے دیے تھے کہ تم نیلی ڈاٹسن کے بریک فیل کر دو۔"

وہ سب کے چہروں کو غور سے دیکھنے لگا...... وہ آہستہ آہستہ ملک عنایت علی کے پاس پہنچ کر رک گیا...... وہ ملک عنایت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ...... یہ ہے وہ شخص...... یہ...... اس دن......" حنان درمیان میں ہی بول پڑا۔

"زمان! تمہارا پہلا گواہ ہی جھوٹا نکلا اور مجرم بھی کوئی اور ہی نکلا۔" مگر زمان خاموش کھڑا تھا۔ اس کا انداز مطمئن اور پرسکون تھا۔

"یہ...... وہ شخص ہے...... جو اس دن نماز پڑھ رہا تھا...... تب...... تب اس شخص نے۔"

اب وہ عبدالرحمٰن کی طرف مڑا۔ "مجھے روپے دے کر میرا ایمان اور ضمیر خرید لیا...... میں بہت جلا ہوں...... ضمیر کی ملامت کی آگ میں...... میں نفرت کرتا ہوں...... نفرت کرتا ہوں تم سے۔" وہ آگے بڑھا اس کے عزائم خطرناک لگ رہے تھے مگر صفدر حسین اسے پکڑ کر باہر کی طرف لے گیا۔ اب دوسرے گواہ کو لایا گیا جو کہ گورکن تھا۔

اس نے بھی عبدالرحمٰن کو پہچان لیا کہ یکم جنوری 1978ء کو تین قبریں کھودنے کے لیے رقم دی تھی۔ پھر ملکہ اور راجو کو بھی بلایا گیا۔ جنہیں ماہ نور کے کھانے میں زہر نہ ملانے پر نوکری سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ پھر اس وارڈن اور ریکارڈ کیپر کو بھی بلوایا گیا جنہوں نے ہسپتال کے مُردہ خانے سے جلی ہوئی نہ پہچانی جانے والی لاشیں پیسوں کے لالچ میں ملک عبدالرحمٰن کو دی تھیں۔

''حنان!......اگر اور بھی ثبوت مانگو گے تو دے دوں گا...... میرا خیال ہے کہ تمہیں یقین آ گیا ہوگا۔'' زمان نے کہا تو حنان کا سر ندامت سے جھک گیا مگر ماں جی عبدالرحمٰن کی طرف بڑھیں۔ پاس آ کر انہوں نے رحمٰن کا گریبان پکڑ کر انہیں جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

''کیوں کیا......تم نے ایسا......رحمٰن......کیا میری تعلیم و تربیت اور پرورش میں کوئی کمی رہ گئی تھی......کیوں میری پھول جیسی مانو پر تم نے دُکھوں کے پہاڑ ڈھائے؟'' وہ رونے لگی تھیں۔ ''تمہارے باپ کے بعد میں نے اس گھر کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں تھما دی مگر تم......تم بہت نیچ نکلے......تم تو حیثیت والے تھے، روپیہ پیسہ تمہاری جاگیر تھا۔ پھر اتنی گھٹیا حرکت...... مجھے شرم آتی ہے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے۔'' وہ انہیں پیٹنے لگیں۔ ''میرا خون اتنا گھٹیا کیسے ہو گیا......'' انہیں یقین نہ آ رہا تھا۔

ماہ نور نے انہیں پکڑا اور ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ ملک عبدالرحمٰن بت بنے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں شرمندگی کے مارے جھکی ہوئی تھیں۔

''صفدر حسین! مرادالحسن کو بلاؤ۔'' زمان نے کہا تو صفدر حسین مراد کو اپنے ساتھ لے کر اندر داخل ہوا تو سبھی کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انہوں نے مرادالحسن کو کیمرہ مین کے روپ میں دیکھا تھا۔ حنان بھی حیران تھا، اس کی حیرانگی زمان کی آواز نے دور کر دی۔

''یہ مرادالحسن ہے، ماہ نور بوا کا وہی بیٹا جس کی قبر پر بوا آج بھی آنسو بہاتی تھیں۔ اب اس کی شادی حوریہ سے ہوگی، یہ میرا...... بوا اور حوریہ کا فیصلہ ہے اور حنان تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟'' آخری الفاظ پر وہ حنان کی طرف متوجہ ہوا تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

ماں جی نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور منہ ماتھا چومنے لگیں...... وہ رو بھی رہی تھیں اور مرادالحسن کو گلے لگا کر چوم بھی رہی تھیں۔ وہ ماں جی سے علیحدہ ہو کر ماہ نور کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ممتاز اور سلمٰی بھابی کی نظروں میں اس کے لیے ستائش تھی اور عنایت علی تو قربان ہو رہے تھے۔

ماہ نور نے مرادالحسن کو بتایا کہ یہی تمہارے ماموں ہیں جنہوں نے ہماری محبت کو شادی

تک پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں خاندانی روایات سے بغاوت کی تھی۔ مرادالحسن بھی ماموں عنایت علی کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور غزنوق جو کہ تمام معاملات سن اور دیکھ کر سُن ہو کر کھڑی تھی۔ اس نے انگلی اور انگوٹھے کے اشارے سے مرادالحسن کو ''فنٹاسٹک'' قرار دیا تو وہ مسکرانے لگا، زمان کی آواز پر سبھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''صفدر حسین! اب اس گھر کے پہلے اور آخری ڈرائیور کو بلاؤ۔ جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہیں۔'' صفدر حسین اندر جا کر واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک دل کش اور جاذب نظر قد کاٹھ کا بندہ جو کہ ڈرائیور کی وردی میں ملبوس تھا، اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!'' فیض الحسن نے سلام کیا تو سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ گزشتہ بائیس سال پرانا فیض الحسن لگ رہا تھا۔ بس چہرے پر جھریاں اپنا ڈیرہ جما چکی تھیں۔ فیض الحسن نے ماں جی کو سلام کیا تو وہ واری صدقے جانے لگیں۔ عنایت علی نے بھی آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا تھا۔ وہ حنان کی طرف بڑھا تو اس نے شرمندگی سے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے مگر فیض الحسن نے اسے گلے لگا لیا۔

''تم اس تمام معاملے میں بے قصور اور بے گناہ ہو، پھر تم کیوں شرمندگی محسوس کرتے ہو؟ تم اور مرادالحسن اور زمان میرے لیے ایک جیسے ہی ہو...... مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' اس نے حنان کو دلاسہ دیا تو اس کی آنکھیں ندامت کے آنسو بہانے لگیں۔ فیض الحسن نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''مرد روتے ہوئے عورتوں سے بھی برے لگتے ہیں۔'' وہ مسکرانے لگا تو فیض الحسن اب عبدالرحمٰن کی طرف مڑا۔ وہ ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نہیں جانتا کہ ہمیں مارنے اور ختم کرنے میں آپ کا کیا مقصد تھا مگر حیرانگی اس بات کی ہے کہ آپ نے ہم باپ بیٹے کو تو ختم کرنا ہی تھا کیوں کہ میں ایک کمی کمین تھا اور مرادالحسن میرا خون مگر ماہ نور تو آپ کی ذات اور حیثیت کے مطابق تھی اور آپ کا خون تھا۔'' وہ واپس پلٹا اور گھومتے ہوئے سب کے چہروں کا طواف کرتا ہوا ایک بار پھر عبدالرحمٰن کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''میں آج بھی گزشتہ بائیس برس والی یونیفارم میں کھڑا ہوں۔ میری حیثیت آپ کی

نظروں میں کچھ بھی ہو مگر میں آج بھی خود کو مانو کا ڈرائیور ہی سمجھتا ہوں اور آج ایک ڈرائیور آپ سے اور اس گھر سے ایک نہیں بلکہ دو رشتوں کو جدا کر کے لے جائے گا۔ ایک اپنی مانو کو اور دوسری مرادالحسن کی حور کو۔ اگر کسی کو بھی اعتراض ہے تو میرے راستے میں آ کر مجھے روکنے کی کوشش کر کے دیکھ لے۔'' فیض الحسن کی کڑک دار آواز سن کر سبھی خاموش ہو کر رہ گئے۔

''آپ حوریہ کو ایسے نہیں لے جا سکتے انکل!'' یہ آواز حنان کی تھی۔ ''حوریہ آپ کی امانت ہے میں اسے عزت و آبرو کے ساتھ اپنے کندھے کا سہارا دے کر اس کی ڈولی کو رخصت کروں گا، یہ ایک بھائی کی زبان ہے۔'' ملک عبدالرحمٰن کی حیثیت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ حوریہ بھاگ کر بھائی کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''بوا! آپ بابا کو معاف نہیں کر سکتیں؟'' یہ ننھی غزنوق تھی جس کی آواز میں منت اور لجاجت تھی، ماہ نور تڑپ کر رہ گئیں۔

ملک عبدالرحمٰن آگے بڑھے اور ماہ نور کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

''مانو...... میں تمہارا مجرم ہوں، میں نے محبت اور عشق جیسے ان مول اور قیمتی جذبے کو اس دولت اور جاگیر کے ترازو میں تولنے کی غلطی کی ہے۔ مجھے دولت اور جاگیر کی بھوک نے اندھا بنا دیا تھا۔ میں نے تمہاری شادی کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ اب تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تا کہ اس تمام جاگیر کا وارث میں اور میرے بچے بن جائیں، تقدیر مجھے شاید معاف نہ کرے مگر میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لے کر نہیں مرنا چاہتا کہ میں نے اپنی بیٹی جیسی بہن سے زیادتی کی اور معافی بھی نہ مانگ سکا۔'' یہ کہہ کر ملک عبدالرحمٰن ماہ نور کے قدموں میں گر پڑے مگر ماہ نور نے انہیں جلدی سے اٹھایا بلکہ خود بھی زمین پر ان کے برابر بیٹھ گئی۔

''آپ نے میری خواہشات کی تکمیل میں کبھی بھی کوئی کمی نہ کی تھی...... پھر کیسے سوچ لیا کہ آپ مجھ سے کچھ مانگیں گے تو میں انکار کر دوں گی...... رحمٰن بھائی! ایک بار اپنی زبان سے کہتے تو سہی۔ خدا کی قسم میں یہ دولت اور جاگیر آپ کے پیار میں قربان کر دیتی...... بابا کے بعد آپ نے مجھے کبھی بھی بابا کی کمی نہ محسوس ہونے دی تھی...... مگر آج آپ نے میرے قدموں میں گر کر مجھے میری نظروں سے گرا دیا ہے...... میں آج یتیم ہو گئی ہوں...... رحمٰن بھائی!'' دونوں بہن بھائی کے ساتھ قصرِ ماہ نور کا ہر فرد رو رہا تھا۔

''مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے، بس جو میری تقدیر میں لکھا تھا، ہو گیا، مجھے بھی تو تقدیر نے اپنی مرضیوں کی سزا دینی تھی، مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' ماہ نور وہاں سے اٹھ کر فیض

الحسن اور مرادالحسن کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ حوریہ پہلے ہی فیض الحسن کے پہلو میں کھڑی تھی مگر صفدر حسین اور زمان ملک عبدالرحمٰن کے پاس کھڑے تھے۔

''میں گناہ گار ہوں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہوں مگر ندامت اور شرمندگی کی زندگی نہیں جی سکوں گا۔ مجھے سبھی لوگ معاف کر دینا۔'' ملک عبدالرحمٰن کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ کیا ہونے والا ہے۔ ملک عبدالرحمٰن نے بڑی تیزی سے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے پستول نکال کر اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔ سبھی لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں رک گئیں۔ پاس کھڑے ہوئے صفدر حسین نے بجلی کی تیزی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کی جانب کر دیا تھا، گولی فانوس کے ایک بلب کو توڑ کر کرچی کرچی کرتی ہوئی چھت میں گھس گئی، اب پستول صفدر حسین کے ہاتھ میں تھا۔

''مجھے مر جانے دو بیٹا! میں ان سب کا گناہ گار ہوں، میں زندہ نہیں رہنا چاہتا، میں بہت شرمندہ ہوں، میں محبت اور عشق کو قتل کر کے دولت اور جاگیرداری کا رتبہ اونچا رکھنا چاہتا تھا مگر آج سمجھا ہوں کہ محبت کوئی سٹیٹس اور حیثیت نہیں دیکھتی۔ محبت ٹاٹ اور مخمل میں ہی ہوتی ہے، محبت امیر اور غریب میں ہی ہوتی ہے، محبت تو محبت ہوتی ہے، اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ فیض الحسن تمہاری محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ دینے لگا تھا مگر یہ...... صفدر حسین راستے میں دیوار بن گیا...... میں زندہ بچ جانے پر شرمندہ ہوں، فیض الحسن شرمندہ ہوں!'' ملک عبدالرحمٰن کا اعتراف گناہ اس کے گناہوں کا ازالہ بن گیا، فیض الحسن نے آگے بڑھ کر ملک عبدالرحمٰن کو گلے لگا لیا۔

''صفدر حسین مسیحا ہے۔ جس نے آپ کی جان بچا کر ہمیں ایک سربراہ کے زیرِ سایہ باقی زندگی گزارنے کی توفیق دی ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے فضل و کرم سے ہی ممکن ہوا ہے۔''

قصرِ ماہ نور میں خوشیاں رقصاں ہو گئی تھیں، ایک گھرانہ مکمل ہو گیا تھا، خاندان مکمل ہو کر اگلے خاندان کی خوشیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پلاننگ کرنے لگے تھے۔

ایک شاندار اور پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس دعوت کی میزبان غزنوق تھی، ماہم بھی اپنے میاں کے ساتھ شریک تھی، وہ اپنے گھر میں خوش اور سکھی تھی اور یہ سب کچھ عنایت علی کی نیک نیتی کی بدولت تھا کہ اللہ نے اس کی بیٹی کو گھریلو سکھ تو نصیب کیا ہی تھا بلکہ تقدیر کی مہربانی سے وہ ماں بھی بن گئی تھی۔ ممتاز بھابی تو پھولے نہ سما رہی تھیں جب کہ سلمٰی بھابی بھی مرادالحسن کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔ حمود علی کو بھی مدعو کر کے اس کا بھی تعارف کروایا

گیا تھا۔ وہ بھی اعلیٰ خاندان سے منسوب ہونے پر دلی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

☆=====☆====☆=====☆

"خون پر خون تھوک رہے ہو، میں تو کہتا ہوں کہ چاچے فیض الحسن کو بتا کیوں نہیں دیتے؟" رفیق اس کی چارپائی کے پاس بیٹھا رو رہا تھا مگر صفدر حسین کی آنکھوں سے کوئی آنسو نہ نکل سکا تھا، شاید خشک ہو گئے تھے۔

"آج کتنے سالوں بعد چاچے فیض الحسن کو خوشیاں ملی ہیں، میں اپنا غم اور دُکھ انہیں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا اور سن! خبردار! اگر تم نے بھی بتانے کی کوشش کی۔" صفدر حسین نے اسے بھی ڈانٹ کر منع کر دیا تھا۔

"اچھا نہیں بتاتا! چل پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" رفیق اٹھتا ہوا بولا تھا۔

"یار ڈاکٹر کون سا زندگی بانٹ رہے ہیں۔ موت نے تو اک دن آنا ہی ہے۔ ڈاکٹر مجھے موت سے تو نہیں بچا سکتا۔" وہ بھی چارپائی سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے موبائل پر گھنٹی بجی تو اس نے نمبر دیکھا تو چاچا فیض الحسن کا نمبر تھا اس نے "یس" کا بٹن دبا کر "ہیلو" کیا تو دوسری طرف سے فیض الحسن کی چہکتی ہوئی آواز نے اسے دُکھی کر دیا۔

"اوئے ڈنگر! تجھے پتا نہیں ہے اگلے ہفتے تیرے بھائی کی بارات جانی ہے اور تم ہو کہ کہیں چھپ کر بیٹھ گئے ہو۔"

"میرے ذمے کوئی کام ہے تو بتاؤ چاچا۔" اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ مگر وہ فیض الحسن کو اپنی کمزوری یا بیماری کا کوئی بھی تاثر نہ دینا چاہتا تھا۔

"میں اکیلا کہاں کہاں گھوموں گا...... ایسا کر تُو آجا پھر اکٹھے ہی خریداری کر لیں گے۔" فیض الحسن کی آواز نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ اب کوئی اچھا اور جامع بہانہ درکار تھا جس سے فیض الحسن مطمئن ہو سکے۔

"میں ابھی تو نہیں آ سکتا چاچا۔" وہ بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ فیض الحسن کی حیرت بھری آواز ابھری۔

"کیوں؟ ابھی کیوں نہیں آ سکتے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" صفدر حسین تڑپ کر رہ گیا۔ وہ خرابی طبیعت کا اسے نہ بتا سکتا تھا۔ مگر نارمل انداز میں ادا کیا ہوا فیض الحسن کا فقرہ اس کے دل میں کُھب گیا تھا۔

"ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں...... خود ہی تو...... مسیحا...... کہتے ہو۔ بھلا مسیحاؤں کو کوئی

دکھ یا تکلیف ہو سکتی ہے؟" وہ اپنی نقاہت بھری آواز پر قابو پانے کی کوشش میں رو پڑا تھا مگر موبائل کا فائدہ ہے کہ اس پر جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ اس نے بھی جھوٹ بول دیا۔

"میں اس وقت تم سے دور...... کراچی میں ہوں...... میں پرسوں بہت سی...... شاپنگ کر کے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ چاچا فیض الحسن کچھ کہتا...... صفدر حسین نے موبائل آف کر دیا۔ رفیق اس کی طرف دیکھ بھی رہا تھا اور باتیں بھی سن رہا تھا۔ وہ بھی صفدر حسین کی ابتر سے ابتر ہوتی ہوئی حالت دیکھ کر اداس اور مغموم تھا۔

صفدر حسین نقاہت اور کمزوری کی بنا پر چارپائی پر گر گیا تھا۔ رفیق نے آگے بڑھ کر اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"استاد...... استاد...... پاجی...... صفدر حسین۔" وہ اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔ صفدر حسین چارپائی پر بے بس اور سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم نے جھرجھری لی اور اس نے آنکھیں کھول دیں...... وہ رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا؟ کیوں رو رہے ہو؟ ابھی میری سانسیں تو چل رہی ہیں۔" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

رفیق نے ایمبولینس سروس کو فون کیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ صفدر حسین کو ہسپتال کی طرف لے جا رہا تھا صفدر حسین اسی ہسپتال کے اسپیشلسٹ سے اپنا علاج کروا رہا تھا۔ مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والا معاملہ تھا۔

ہسپتال کا عملہ الرٹ تھا۔ انہوں نے صفدر حسین کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمرجنسی وارڈ میں لے جا کر فوری آکسیجن لگا دی۔ رفیق کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

رفیق ڈاکٹر سے ملا جو اسے جانتا تھا۔ کیونکہ وہی صفدر حسین کے ساتھ آتا جاتا رہتا تھا۔ مگر ڈاکٹر کوئی تسلی نہ دے سکا۔ بس اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ "دعا کرو رفیق۔" مگر رفیق کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ خدا سے دعا مانگنے لگا تو اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے فوراً جیب سے موبائل نکال کر اسے آن کیا اور آخری کال پر کال بیک کا بٹن دبا دیا۔

تین چار گھنٹوں کے بعد کسی مراد الحسن نے فون اٹینڈ کیا تھا۔

"ہاں صفدر بھائی میں مراد الحسن بول رہا ہوں۔" اس کی آواز چہک رہی تھی۔

"مراد صاحب! میں صفدر نہیں بلکہ اس کا دوست رفیق بات کر رہا ہوں۔ آپ فوراً نیشنل ہسپتال پہنچیں۔ صفدر بھائی کی طبیعت خراب ہے۔ ایمرجنسی میں۔" یہ کہہ کر اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک نوجوان اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی تیزی سے ایمرجنسی میں داخل ہوئے تو صفدر حسین کو بیڈ پر صحیح سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ مگر وہ کافی کمزور لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ رنگ کے حلقے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ کئی دنوں سے بیمار ہے۔

”اوئے ڈنگر! جھوٹ بول رہا تھا مجھ سے پوچھ، پوچھ اپنے اس بھائی مراد سے میں نے تیرا فون سننے کے بعد کیا کہا تھا۔ اس سے پوچھ؟“ فیض الحسن کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

”بابا نے مجھے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ صفدر حسین اسی شہر میں ہے۔ یا وہ بہت مصروف ہے یا پھر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ مراد الحسن نے دکھ بھری آنکھوں سے صفدر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگا اور بولا۔

”یہ رفیق بھی ڈنگر ہی ہے۔ ایویں ای آپ کو پریشان کر دیا۔ میں ابھی چھٹی لیتا ہوں اور گھر چلتے ہیں۔“ اس نے ڈاکٹر صاحب کو آنکھ بچا کر خاموش رہنے کا کہا اور رفیق کو بل ادا کر کے آنے کا کہہ کر وہ ان کے ساتھ واپس گھر جا رہا تھا۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تم بیمار ہو۔“ فیض الحسن غصے سے بولا تو صفدر حسین مسکرانے لگا۔

”بیمار ہوتا تو ڈاکٹر مجھے گھر جانے دیتا؟“

”اوئے ڈنگر! مجھے بھی ڈنگر سمجھتا ہے تم نے اسے آنکھ نہیں ماری تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔“ وہ غصے میں لگ رہا تھا۔

وہ باتوں ہی باتوں میں گھر پہنچ گئے تھے۔ گھر میں ماہ نور اور حمود نے اس کا استقبال تلخ الفاظ اور شکوے بھری باتوں سے کیا تھا۔ وہ بس مسکراتا رہا۔

اسے اندر بیڈ پر لٹایا گیا تھا۔ یہ وہی گھر تھا۔ جہاں منظر علی، فیض الحسن اور صفدر حسین کا پہلا ملاپ ہوا تھا۔ صفدر حسین نے کہا تھا کہ اسی گھر سے مراد الحسن کی بارات جائے گی۔ وہ سبھی لوگ اس گھر میں آ کر بس گئے تھے اور دوسرے گھر میں رنگساز اپنے کام میں مصروف تھے۔

خیر و عافیت سے رات گزر گئی۔ مگر اگلی صبح خون کی بہت بڑی الٹی نے صفدر حسین کی بیماری کا سارا بھید کھول دیا تھا۔ خون اس طرح کمرے کے فرش پر پھیلا ہوا تھا کہ جیسے کوئی بکرا ذبح کیا ہو۔

مراد الحسن نے پانی کا پائپ لگا کر اس خون کو دھونا شروع کر دیا۔ مگر اس کی نظریں صفدر حسین پر لگی ہوئی تھیں۔ فیض الحسن اور ماہ نور کی آنکھیں بھی رم جھم کر رہی تھیں۔

”کب سے اس روگ کو اپنے اندر پال رہے ہو؟ مجھے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اپنی اس

خطرناک بیماری کا راز داں ہی بنا لیتے۔“ فیض الحسن اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آنسوؤں نے بات نہ کرنے دی تھی۔

”بس چاچا! زندگی اتنی ہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ کسی کے کام آ گئی۔“ وہ بولا تو ماہ نور نے آگے بڑھ کر اس کے زرد ہوتے ہوئے چہرے پر اپنا پیار بھرا ہاتھ پھیرا۔ تو وہ روتے ہوئے بولا۔ ”چاچی مجھے آپ کی صورت میں اپنی ماں نظر آتی ہے۔ میں نے تمہاری کوئی خدمت نہیں کی بس مجھے معاف کر دینا۔“ اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے تو فیض الحسن اسے ڈانٹنے لگا۔

”ڈنگر ہے تُو بھی! میں ابھی ڈاکٹر کو بلواتا ہوں۔“ وہ اٹھنے لگا تو صفدر حسین نے اس کی قمیص پکڑ لی۔

”چاچا اب وقت بہت کم رہ گیا ہے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں چاہتا ہوں جب میرا دم نکلے تو میرا سر چاچی کی گود میں ہو اور میرے ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہوں۔“ وہ رو نہیں رہا تھا مگر آنکھیں اسے دھوکا دے رہی تھیں۔

”میں تو تمہیں مسیحا کہتی رہی صفدر حسین مگر تم نے اتنے زیادہ دکھ پال رکھے تھے تم تو اندر سے بالکل ہی خالی تھے۔ بالکل اس کانچ کی مانند جو باہر سے تو بہت خوبصورت نظر آتا ہے مگر اندر سے بالکل ہی خالی اور کھوکھلا ہوتا ہے۔ تم تو کانچ کے مسیحا تھے صفدر حسین۔“ ماہ بانو کے آنسو اس کے چہرے پر گر رہے تھے اس کا سر ماہ نور کی گود میں تھا۔ وہ فیض الحسن کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”چاچا میری آخری خواہش پوری کرو گے؟“ اس کے لہجے کی منت اور التجا نے فیض الحسن اور مراد الحسن کی روح تک کو تڑپا دیا تھا۔ مراد الحسن بھی لمحہ لمحہ اپنے سے دور جاتے ہوئے بھائی کو دیکھ رہا تھا مگر موت ظالم ہوتی ہے۔

”میں تمہاری ہر خواہش کا احترام کروں گا صفدر حسین! مگر پہلے یہ بتاؤ کہ اس روگ کو کتنے عرصہ سے پال رہے تھے؟“ فیض الحسن اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکا تھا۔

”گزشتہ دو سال سے لڑ رہا ہوں...... یہ بہت نامراد مرض ہے...... جان ہی نہیں چھوڑتا۔ ماں اور ابا بھی اس موذی مرض کا شکار تھے...... اور...... اب...... تمہارا صفدر حسین بھی۔“ وہ یہ کہہ کر رونے لگا تھا۔

”چاچا! وضو کر کے قرآن کریم کی تلاوت سنا دو۔ بس یہی میری آخری خواہش ہے...... میرے پاس...... وقت...... بہت...... کم ہے...... چاچا۔“ فیض الحسن نے اس کی سانسوں کی ٹوٹتی ہوئی ڈور کا احترام کیا اور وضو کرنے چلا گیا۔

مراد الحسن کو روتا دیکھ کر وہ اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اپنے کمزور اور نحیف ہاتھوں سے وہ

مراد کی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔

اس کا ہاتھ دبا کر اسے رونے سے منع کیا۔ اس کمزوری اور بیماری نے اس سے بولنے کی سکت چھین لی تھی۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی ہوئی تھیں۔

فیض الحسن اس کے پاس قرآن کریم کھول کر اپنی خوش الحانی سے عظیم اور بابرکت کلام پیش کرنے لگا تھا۔

پھر فیض الحسن کی خوش الحانی نے اپنا کمال دکھانا شروع کر دیا۔ ہواؤں کو باادب کر دینے والا کلام۔ پرندوں کو اپنی چہچہاہٹ فراموش کر دینے والا بابرکت کلام۔ فیض الحسن کی زبانی ادا ہو رہا تھا۔ اب وہ سورۃ مومن کی آیات کا ورد کرنے کے بعد ان کا ترجمہ سنا رہا تھا۔

''حم! یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے جو زبردست ہے ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ گناہ بخشنے والا ہے اور توبہ قبول کرنے والا ہے سخت عذاب دینے والا ہے قدرت والا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (سبھی کو) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یہ ترجمہ سن کر صفدر حسین کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر اس کی قمیص کے کالر میں جذب ہو گئے۔ اور آخری ہچکی نے موت کا بلاوہ بن کر کانچ کا مسیحا اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

مراد الحسن کے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

فیض الحسن اور ماہ نور نے اس مسیحا کی مسیحائی پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آنسوؤں کے نذرانہ پیش کرنے شروع کر دیئے تھے۔

☆=====ختم شد=====☆